



یہ کتاب برقی شکل میں نشر ہوئی ہے اور شبکہ الامامین الحسینین (علیہما السلام) کے گروہ علمی کی نگرانی میں تنظیم ہوئی ہے

تفسیر نمونہ جلد یازدہم

تفسیر نمونہ، آیہ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) کی ۱۵ سالہ زحمات کا نتیجہ ہے جس کو معظم لہ نے اہل قلم کی ایک جماعت کی مدد سے فارسی زبان میں تحریر فرمایا، اس کا اردو اور عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے۔

تعداد جلد: ۱۵ جلد

زبان: اردو

مترجم: مولانا سید صفدر حسین نجفی (رح)

تاریخ اشاعت: ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

سورہ حجر

آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُبِينٍ﴾۔

۲۔ ﴿وَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ﴾۔

۳۔ ﴿ذُرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾۔

۴۔ ﴿وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ﴾۔

۵۔ ﴿مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ﴾۔

ترجمہ

رحیم و رحمن خدا کے نام سے

۱۔ الر۔ یہ کتاب اور قرآن مبین کی آیات ہیں۔

۲۔ (جس وقت) کافر (اپنے اعمال کے برے آثار دیکھیں گے) کس قدر آرزو کریں گے، کہ وہ مسلمان ہوتے۔

۳۔ چھوڑو انھیں۔ وہ کھالیں، فائدہ اٹھالیں اور آرزوئیں انھیں غافل کر دیں، لیکن وہ بہت جلد سمجھ لیں گے۔

۴۔ ہم نے کسی شہر و دیار (کے باسیوں) کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اجل معین (اور تغیر ناپذیر زمانہ) رکھتے تھے۔

۵۔ کوئی گروہ اپنی اجل سے آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

تفسیر

بے بنیاد آرزوئیں

اس سورہ کی ابتداء میں ہمیں پھر حروف مقطعات (الف - لام - راء) کا سامنا ہے۔ یہ حروف واضح کرتے ہیں کہ آسمانی کتاب کہ جو ساری نوع انسانی کے لئے سعادت کا راستہ کھولنے والی انہی سادہ سے حروف الف، باء سے ترتیب پائی ہے اس کا خام مال وہی ہے جو تمام افراد بشر یہاں تک کہ دو تین سالہ بچے کے اختیار میں بھی ہے یہ انتہائی اعجاز ہے کہ ایسے مصالح سے اس قسم کا بے نظیر محصول بنایا جائے۔

لہذا بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: یہ آسمانی کتاب اور واضح کی آیات ہیں ﴿الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُبِينٍ﴾۔

ہم جانتے ہیں کہ ”تک“ دور کا اسم اشارہ ہے حالانکہ قاعدتاً یہاں ہذہ ہونا چاہیے تھا (کہ جو نزدیک کے لئے اسم اشارہ ہے) لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ عربی ادب میں (بلکہ فارسی ادب میں بھی) بعض اوقات کسی عظمت بیان کرنے کے لئے دو کے اسم اشارہ سے استفادہ کیا جاتا ہے یعنی اس کی وہ عظمت ہے کہ گویا ہم سے بہت دور آسمانوں کے فاصلے پر ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بعض اوقات ایک بزرگ شخص کی موجودگی میں ہم کہتے ہیں کہ اگر آنجناب اجازت دیں تو ہم فلاں اقدام کریں یہاں ”آں“ (وہ) کا لفظ اس کے مقام کی عظمت بیان کرنے کے لئے ہے جیسا کہ ”تکرہ“ کی صورت میں قرآن کا ذکر بھی بیانِ عظمت کے لئے ہے۔

بہر حال ”کتاب“ کے بعد لفظ ”قرآن“ کا آنا درحقیقت تاکید کے عنوان سے ہے اور لفظ ”مبین“ کے ذریعے اس کی توصیف اس لئے کی گئی ہے کیونکہ حقائق کو بیان کرنے والا اور حق کو باطل سے جدا کر کے واضح طور پر پیش کرنے والا ہے۔

یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ لفظ ”کتاب“ یہاں تورات اور انجیل کی طرف اشارہ ہے۔ بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو ان واضح خدائی آیات کے بارے میں ہٹ دھرمی اور مخالفت میں اصرار کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ لوگ اپنے منحوس کفر، اندھے تعصب اور ہٹ دھرمی پر پشیمان ہوں گے اور ”کبھی یہ کار آرزو کریں گے کہ اے کاش ہم مسلمان ہوتے“ ﴿رَبِّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ﴾۔

جیسا کہ تفسیر المیزان میں ہے: ”یود“ (دوست رکھتا ہے) سے مراد پسند کرنا، تمنا کرنا اور آرزو کرنا ہے اور لفظ ”لو“ کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلام کی آرزو ایسے زمانے میں کریں گے جب وہ اس کی طرف نہیں آسکتے ہوں گے اور یہ خود اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ اس کی تمنا اور آرزو دوسرے جہان میں اپنے اعمال کے نتائج دیکھنے کے بعد کریں گے۔

حضرت صادق علیہ السلام سے اس سلسلہ میں منقول حدیث بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ينادى مناد يوم القيامة يسمع الخلائق انه لا يدخل الجنة الا مسلم فثم يود سائر الخلائق انهم كانوا مسلمين

جب قیامت کا دن ہوگا تو کوئی اس طرح پکارے گا کہ تمام مخلوق اس کی آواز سنے گی، وہ کہے گا: (آج) جنت میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہوگا کہ جو اسلام لاکچے ہیں اس وقت سب لوگ آرزو اور تمنا کریں گے کہ اے کاش ہم مسلمان ہوتے۔^(۱)

نیز عظیم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

جس وقت دوزخی جہنم میں جمع ہوں گے اور مسلمانوں کے ایک گنہ گار گمروہ کو ان کے ساتھ رکھا جائے گا تو کفار مسلمانوں سے کہیں گے کہ کیا تم مسلمان نہیں تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ تھے تو سہی۔ تو وہ کہیں گے کہ پھر تمہارا اسلام بھی تمہارے لئے فائدہ مند نہ ہوا۔ کیونکہ تم بھی ہمارے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہو۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم نے (بہت بڑے) گناہ کئے تھے کہ جن کے باعث ہم اس انجام کو پہنچے ہیں (گناہ اور تقصیر کا یہ اعتراف اور دشمن کی وہ سرزنش سبب بنے گی کہ) خداوند عالم حکم دے گا کہ ہر وہ باایمان مسلمان کہ جو جہنم میں ہے اسے باہر نکالو۔ تو اس وقت کفار کہیں گے کہ اے کاش ہم بھی اسلام لائے ہوتے۔^(۲)

تفسیر طبرسی میں بی بی اسی مضمون کی چند احادیث زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ کافروں میں ایسے افراد بھی ہیں کہ جن کا ضمیر ابھی بیدار ہے اور جب وہ پیغمبر اسلام کی دعوت کو سنتے ہیں اور کتاب مبین کی آیات کے ان پیارے مضامین کو دیکھتے ہیں تو دل کی گہرائیوں سے ان کے گمرویدہ ہو جاتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش ہم بھی اسلام لائے ہوتے۔ لیکن تعصب، ہٹ دھرمی یا مادی مفادات انہیں اجازت نہیں دیتے کہ اس عظیم حقیقت کو قبول کر لیں لہذا وہ اسی طرح کفر اور بے ایمانی کے قید خانے میں محصور رہ جاتے ہیں۔

ہمارا ایک صاحب ایمان اور مجاہد دوست یورپ گیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے اسلام کی خوبیاں ایک عیسائی کے سامنے شکلائیں وہ ایک منصف مزاج آدمی تھا اس نے جواب میں کہا: میں شیچ مچ تمہیں مبارکباد دیتا ہوں کہ ہم اس قسم کے مذہب کے پیروکار ہو۔ لیکن میں کیا کروں، میری زندگی کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے مذہب سے دست بردار ہو جاؤں۔

یہ بات ضاذب نظر ہے کہ بعض اسلامی روایات میں ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاصد آنحضرت کا خط لے کر قیصر روم کے پاس پہنچا تو اس نے خصوصیت کے ساتھ آپ کے قاصد کے سامنے اظہار ایمان

کیا یہاں تک کہ وہ رومیوں کو اس دین توحید و اسلام کی دعوت دیتا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے ان کی آزمائش کی جائے جن اس کی فوج نے محسوس کیا کہ وہ عیسائیت کو ترک کر دینا چاہتا ہے۔ تو اس نے اس کے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ قیصر نے ان سے فوراً کہا کہ میں تمہیں آزمانا چاہتا تھا اپنی جگہ واپس جاؤ۔

اس کے بعد اس نے رسول اللہ کے قاصد سے کہا: میں جانتا ہوں کہ تمہارا پیغمبر خدا کی طرف سے ہے اور وہی ہے جس کے ہم انتظار تھے لیکن میں کیا کروں کہ میں ڈرتا ہوں کہ میری حکومت ہاتھ سے نکل جائے گی اور میری جان بھی خبرے میں ہے۔^(۳)

توجہ رہے کہ ان دونوں تفسیروں میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور ممکن ہے آیت کا اشارہ اس جہان میں بھی کفارے بعض گروہوں کی پشیمانی کی طرف ہو اور اس جہان میں بھی۔ جب کہ وہ مختلف حوالوں سے اس جہان میں لوٹ آنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ اس جہان میں (غور کیجئے گا)۔

اس کے بعد قرآن بہت سرزنش کے لہجہ میں کہتا ہے: اے پیغمبر! انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دے (تاکہ چوپایوں کی طرح) کھاتے پھریں۔ اس ناپائیدار زندگی کی لذتیں حاصل کر لیں اور آرزوئیں انہیں اس عظیم حقیقت سے غافل کر دیں لیکن یہ بہت جلدی سمجھ جائیں گے ﴿ذَرَهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾۔ چونکہ یہ تو جانور ہیں جو اپنے اصطبل، گھاس پھوس اور مادی لذات کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور ان کی حرکتیں بس انہی چیزوں کے لئے ہیں۔

غرور، غفلت اور لمبی آرزوؤں نے ان کے دلوں پر اس طرح سے پردہ ڈال رکھا ہے اور انہیں اپنے میں ایسا لگن کر رکھا ہے کہ اب وہ ادراک حقیقت کی قدرت نہیں رکھتے۔ لیکن جب اجل کا طمانچہ ان کے منہ پر لگا، غرور غفلت کے پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹے اور انہوں نے اپنے آپ کو استانہ موت پر یا عرصہ قیامت میں پایا تو اس وقت سمجھیں گے کہ کس قدر غفلت میں تھے، کسی قدر زیاں کا اور بد بخت تھے اور کس طرح انہوں نے اپنا قیمتی ترین سرمایہ خود اپنے ہاتھوں گنوا دیا ہے۔

بعد والی آیت میں، اس بناء پر کہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ مہلت اور لذائذ دنیا سے بہرہ دہری کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں، مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے کسی گروہ کو کسی شہر میں نابود نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اجل معین اور تغیر ناپذیر دور رکھتے تھے۔

﴿وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ﴾۔

”کوئی امت اور جمیعت اپنی اجل معین سے تجاوز نہیں کر سکتی اور نہ کوئی پیچھے رہ سکتی ہے“ ﴿مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ﴾ -

ہر جگہ یہی سنت الہی کار فرما رہی ہے کہ اس نے جدید نظر، بیداری اور آگاہی کے لئے کافی مہلت دی۔ اس نے دردناک حوادث سے بھی دور چار کیا اور وسائل رحمت سے بھی نواز۔ اس نے ڈرایا بھی اور شوق بھی دلایا۔ وہ خطرے سے خبردار کرتا ہے تاکہ سب پر حجت تمام ہو جائے۔

مگر جب یہ مہلت تمام ہوتی ہے تو حتمی انجام انہیں آلیتا ہے۔ دیر اور جلدی کا تربیتی مصلح کی خاطر ممکن ہے لیکن کیا اسی حقیقت کی طرف توجہ کافی نہیں ہے تاکہ سب کے سب گزشتہ لوگوں کی سرنوشت سے عبرت حاصل کریں، اور خدائی مہلت سے بازگشت اور اصلاح کے لئے استفادہ کریں کیا اب ہمیں بیٹھا رہنا چاہیے تاکہ گزشتہ گمراہ اور ظالم قوموں کا سا برا انجام ہمارے لئے بھی دہرایا جائے۔ اور بجائے اس کے کہ ہم گزشتہ لوگوں سے عبرت حاصل کریں، آنے والوں کے لئے عبرت بن جائیں۔

ضمنی طور پر آخری دو آیات سے آیات قرآن میں اور خود زیر بحث سورت میں گزشتہ لوگوں کی تاریخ بیان کرنے کا مقصد واضح ہو جائے۔

۱۔ مجمع البیان اور نور الثقلین میں یہ روایت محل بحث آیت کے ذیل میں عیاشی کے حوالے سے درج کی گئی ہے۔

۲۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ نیز فخر رازی اپنی تفسیر میں اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث نقل کی ہے (البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ)

۳۔ مکاتیب الرسول جلد ۱ ص ۱۱۲۔

لمبی آرزئیں غفلت کا سبب ہیں

اس اس میں شک نہیں کہ امید و آرزو یا عربوں کی تعبیر میں ”امل“ انسان کے چرخ حیات کی حرکت کا عامل ہے یہاں تک کہ اگر اسے اہل دنیا کے دلوں سے صرف ایک دن کے لئے اٹھالیں تو نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے اور بہت کم افراد میں فعالیت، سعی و کوشش اور جوشِ عمل پیدا ہو۔

اس سلسلے میں پیغمبر اکرم سے یہ مشہور حدیث منقول ہے:

الامل رحمة لامتی ولو لا الامل لا رضعت والدة ولدھا ولا غرس غارس شجرا۔

امید میری امت کے لئے سایہ رحمت ہے اگر نور امید نہ ہوئی تو کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے، اور کوئی باغبان پودانہ لگائے۔^(۱)

یہ حدیث بھی اسی عمل کی طرف اشارہ ہے لیکن حیات و حرکت کا عامل جب حد سے گزر جائے اور دور دراز کی آرزو کی شکل اختیار کرے تو انحراف و بد بختی کا بدترین عامل ہے یہ بالکل آبِ باراں کی طرح کہ جو سببِ حیات ہے لیکن اگر حد سے بڑھ جائے تو غرقابی اور نابودی کا باعث ہو جائے۔

یہی وہ ہلاکت خیز آرزو ہے جس کا ذکر زیر بحث آیات میں آیا ہے اور اسے کدا و حق و حقیقت سے بے خبری کا باعث شمار کیا گیا ہے۔ یہ دور دراز کی آرزوئیں اور لمبی چوڑی امیدیں ہیں جو انسان کو اس طرح اپنے میں مشغول رکھتی ہیں اور عالم تخیل میں مستغرق کر دیتی ہیں کہ انسان زندگی اور اس کے اصلی اہداف و مقاصد سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث کہ جو نہج البلاغہ میں حضرت علی (علیہ السلام) سے منقول ہے وہ بھی اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کرتی ہے:

﴿ایہا الناس ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان: اتباع الهوى و طول الامل، اما اتباع الهوى فیصد عن الحق، و اما

طول الامل فینسی الآخرة﴾۔

اے لوگو! خوفناک ترین چیزیں کہ جن کا مجھے تمہارے بارے میں اندیشہ ہے وہ دو ہیں۔ ہوا و ہوس کی پیروی اور دور دراز کی آرزئیں، کیونکہ ہوا و ہوس کی پیروی تمہیں حق سے باز رکھے گی اور دور دراز کی آرزو آخرت کو بھلا دے گی۔^(۲)

یہ حقیقت ہے کہ کتنے ہی باصلاحیت اور لائق افراد ہیں کہ جو آرزوئے دراز کے دام میں گرفتاری کے زیر اثر ضعیف اور مسخ شدہ وجود بن چکے ہیں کہ جس کی وجہ سے نہ صرف وہ اپنے معاشرے کے لئے مفید نہیں رہے بلکہ اپنے ذاتی مفادات بھی پامال کر چکے ہیں اور ہر قسم کی ترقی اور کمال سے محروم ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ دعائے کمیل میں ہے۔

وحبسنى عن نفعى بعد املی

طویل آرزو نے مجھے اپنے حقیقتِ منافع سے محروم کر دیا ہے۔

اصولی طور پر آرزو جب حد سے گذر جاتی ہے تو ہمیشہ انسانوں کو رنج و تعب میں مبتلا کر دیتی ہے پھر وہ رات دن کوشش کرتا ہے اور اپنے گمان میں سعادت و خوشحالی کی طرف جا رہا ہوتا ہے حالانکہ اسے بد بختی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے افراد اکثر اوقات اس حالت میں جان دے دیتے ہیں ان کی دردناک اور غم انگیز زندگی کے ان کے لئے باعثِ عبرت ہے کہ جو دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان رکھتے ہیں۔

۱۔ سفینۃ البحار۔ ج ۱، ص ۳۰ (مادہ ”امل“)

۲۔ نبج البلاغ، ۴۲۔

آیات ۶، ۷، ۸

۶۔ ﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ﴾۔

۷۔ ﴿لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ﴾۔

۸۔ ﴿مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذَا مُنْظَرِينَ﴾۔

ترجمہ

۶۔ اور انہوں نے کہا: اے وہ شخص کہ جس پر ذکر (قرآن) نازل ہوا ہے، بے شک تو دیوانہ ہے۔

۷۔ اگر سچ کہتا ہے تو ہمارے لئے فرشتے کیوں نہیں لے آتا۔

۸۔ (لیکن انہیں جان لینا چاہیئے کہ) ہم فرشتوں کو حق کے بغیر نازل نہیں کرتے اور جس وقت نازل ہوئے تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی (اور انکار کی صورت میں عذابِ الہی میں نابود ہو جائیں گے)۔

تفسیر

فرشتوں کے نزول کا تقاضا۔

ان آیات میں پہلے تو قرآن اور پیغمبر کے خلاف دشمنی کفار کے اعتراض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر قرآن نازل ہوا ہے ہم یقینی قسم کھاتے ہیں کہ تو دیوانہ ہے ﴿وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ﴾۔

پیغمبر اکرم کے بارے میں ان کے یہ الفاظ انتہائی گستاخی اور جسارت کو مجسم کرتے ہیں۔

ایک طرف تو ”یا ایہا الذی“ (اے وہ شخص) کہا گیا ہے دوسری طرف ”نزل علیہ الذکر“ کے الفاظ ہیں کہ جو انہوں نے قرآن کے استہزاء اور انکار کے طور پر کہیں ہیں اور تیسری مرتبہ پیغمبر اکرم کو مجنون قرار دینے کے لفظ ”ان“ اور ”لام قسم“ کے ذریعے ان کی تاکید ہے۔

جی ہاں! جس وقت ہٹ دھرم اور بے مایہ افراد ایک عظیم اور بے مثل عقل کا سامنا کرتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ ”مجنون“ کہہ کر اپنی کوتاہی کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان کے لئے تو ان کی اپنی ناتواں عقل ہی میزان ہوتی ہے اور جو کچھ ان کی میزان میں نہ سما سکے وہ ان کی نگاہ میں بے عقلی اور دیوانگی ہے۔

ایسے افراد اپنے ماحول کے مسائل کے بارے میں خاص قسم کے تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں چاہے وہ گمراہی میں ہی کیوں نہ ہوں ای لئے وہ رتازہ دعوت کو غیر عاقلانہ دعوت قرار دے کر مقابلے کی کوشش کرتے ہیں اور نئی پیش آمد چیزوں سے وحشت زدہ ہوتے ہیں اور غلط روشوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ دنیا پرست جو تمام چیزوں کو مادی معیاروں پر پرکھتے ہیں اگر ان کا کسی ایسے انسان سے سامنا ہو کہ جو اپنے تمام مادی مفادات حتیٰ کہ اپنی جان بھی ایک روحانی مقصد کے لئے قربان کر دے تو انھیں یقین نہیں آتا کہ وہ عاقل ہے کیونکہ ان کے نزدیک عقل کا کام زیادہ مال و دولت، خوبصورت بیوی، پر تعیش زندگی اور ظاہری مقام و منصب کا حصول ہے۔

بالکل واضح سی بات ہے کہ اگر کسی فکر بس مال و دولت، عورتوں اور مقام و منصب تک ہے جو اس کے سامنے کہا جاتا ہے کہ: اگر آسمانی سورج میرے ایک ہاتھ پر اور چاند دوسرے ہاتھ پر رکھ دو اور تمہارے چھوٹے سے ماحول کی بجائے تمام نظام شمسی پر میری حکومت ہو تو بھی میں اپنی دعوت سے دستبردار نہیں ہوں گا، تو وہ یہ بات کرنے والے کو دیوانہ ہی قرار دے گا۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہ بے عقل افراد خدائی رہبروں کے ساتھ ایسے ایسے پیوند چسپاں کرتے تھے کہ جو بعض اوقات بالکل ایک دوسرے کی ضد ہوتے تھے کبھی انھیں ”دیوانہ“ کہتے اور کبھی ”جادوگر“۔ حالانکہ جادوگر تو ایک خاص زیرکی اور ہوشیاری کا حامل ہوتا ہے اور عین ”دیوانہ“ کا مد مقابل ہے۔

یہ لوگ نہ صرف پیغمبر کی طرف ایسی غیر عاقلانہ نسبتیں دیتے تھے بلکہ بہانہ جوئی کے طور پر کہتے تھے۔ ”اگر سچ کہتے ہو تو پھر ہمارے لئے فرشتے کیوں لاتے“۔ تاکہ وہ تیری گفتگو کی تصدیق کریں۔ اور ہم ایمان لے آئیں ﴿لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصَّادِقِينَ﴾۔

خد تعالیٰ انھیں جواب دیتا ہے: ہم ملائکہ کو سوائے حق کے نہیں بھیجتے ﴿مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾۔ اور اگر فرشتے نازل ہوں (اور حقیقت ان کے لئے حسی پہلو اختیار کر لے) اور اس کے بعد وہ ایمان نہ لائیں تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی اور وہ عذاب الہی کے ذریعے نابود ہو جائیں گے۔ ﴿وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ﴾۔

”مانزل الملائكة الا بالحق“ کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے مختلف بیانات ہیں:-

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم فرشتوں کی صرف بطور اعجاز حق واضح کرنے کے نازل کریں گے نہ کہ ان کے بہانہ جوئی کے لئے کہ وہ دکھ لیں اور پھر بھی ایمان نہ لائیں۔ دوسرے لفظوں میں معجزہ کوئی بازیچہ اطفال نہیں کہ لوگوں کو من پسند سے رونما ہوتا رہے۔ بلکہ یہ تو اثبات حق کے لئے اور جو لوگ حق کے خواہاں ہیں ان کے لئے یہ امر بقدر کافی ثابت ہو چکا ہے کیونکہ پیغمبر اسلام نے قرآن جیسا معجزہ ہاتھ میں ہونے باوجود دوسرے معجزات بھی دکھا کر اپنی رسالت کو ثابت کیا تھا۔

۲۔ ایک احتمال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ”حق“ یہاں ”موت“ کے معنی میں ہے یعنی فرشتے صرف موت اور قبضِ روح کے وقت نازل ہوں گے۔ کسی اور وقت نہیں۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ قرآن حکیم میں حضرت ابرہیم اور حضرت لوط (علیہ السلام) کے واقعات میں، یہاں تک کہ مسلمانوں کے بارے میں بعض سے متعلق ہے کہ ان پر فرشتے نازل ہوئے۔

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ ”حق“ سے مراد یہاں وہی آخری دنیاوی عذاب اور نابود کرنے والی مصیبت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ”عذاب استیصال“ ہے یعنی اگر فرشتے نازل ہوں اور پھر یہ ایمان نہ لائیں کیونکہ ان میں موجود ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ ایمان نہیں لائیں گے تو ان کی نابودی بھی ساتھ ہوگی۔

آیت کا دوسرا جملہ ”وما کانوا اذاً منظرین“ بھی اس کے معنی کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر کے مطابق اس کا الگ نیا مفہوم ہے۔

۴۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ”حق“ یہاں شہود کے معنی میں ہے یعنی جب تک یہ افراد اس دنیا میں ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے پردے پڑے ہیں اور یہ ایسے حقائق نہیں دیکھ سکتے کہ جو ماورائے مادہ سے مربوط ہیں صرف دوسرے جہان میں عالم شہود ہوگا کہ جہاں پردے ہٹ جائیں گے تو پھر یہ فرشتگانِ الہی کو دیکھ سکیں گے۔

اس میں بھی دوسری تفسیر والا اشکال موجود ہے کیونکہ قومِ لوط کے بے ایمان اور گمراہ افراد تک نے عذاب پر مامور فرشتوں کو اسی دنیا میں دیکھا تھا۔^(۱)

اس بناء پر صرف پہلی اور تیسری تفسیر ظاہر آیت سے مناسبت رکھتی ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ آیت میں کہ اگر ان تمام واضح دلائل کے بعد بھی ان کے تقاضا کے مطابق حسی معجزہ پیش کیا جائے تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی یہ اس بناء پر ہے کہ ایسی حالت میں ان کے لئے ہر پورے معنی کے لحاظ سے اتمامِ حجت ہو جائے گا، اور تمام بہانے ختم ہو

جائیں گے اور چونکہ زندگی کی مہلت، اتمامِ حجت، احتمالِ تجدیدِ نظر اور حق کی طرف بازگشت کے لئے ہے اور جن پر پوری طرح اتمامِ حجت ہو جائے ان کے لئے مہلت کوئی معنی نہیں رکھتی لہذا ان کی عمر کے اختتام کا اعلان ہو جاتا ہے اور وہ اس سزا اور عذاب تک جا پہنچے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

آیت ۹

۹. ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾

ترجمہ

۹۔ ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم قطعی طور پر اس کی حفاظت کریں گے۔

تفسیر

قرآن کی حفاظت

کفار نے بہت بہانہ سازیاں کیں۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور قرآن کے بارے میں استہزا کیا۔ گذشتہ آیات میں اس کا ذکر موجود ہے اس کے بعد زیر بحث آیت میں ایک عظیم اور نہایت اہم حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یہ بیان حقیقت ایک طرف تو پیغمبر اکرم کی دلجوئی کے لئے ہے اور ہم یقینی طور پر اس کی حفاظت کریں گے (إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ)۔

ایسا نہیں کہ یہ قرآن کسی یا اور مددگار کے بغیر ہے اور وہ اس کے آفتاب وجود کو کیچڑ سے چھپادیں گے یا اس کے نور کو پھونکوں سے بجھادیں گے یہ تو وہ چراغ ہے جسے حق تعالیٰ نے روشن کیا ہے اور یہ وہ آفتاب ہے جس کے لئے غروب ہونا نہیں ہے۔

یہ چند ایک افراد اور ناتواں گروہ تو معمولی سی چیز ہے اگر دنیا بھر کے جابر، اہل اقتدار، سیاستداں، ظالم، منحرف، اہل فکر اور جنگ آزما جمع ہو جائیں اور اس کے نور کو بجھانا چاہیں تو وہ بھی ایسا نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔

یہ کہ قرآن کی حفاظت سے مراد کن امور کی حفاظت ہے اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں:

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ تحریف و تغیر اور کمی بیشی سے حفاظت مراد ہے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ آخر دنیا تک فطا و نابودی سے حفاظت مراد ہے۔

۳۔ بعض دیگر نے کہا ہے کہ قرآن کے خلاف گمراہ کرنے والی منطق کے مقابلے میں حفاظت مراد ہے۔

لیکن یہ تفاسیر یہ صرف کہ یہ ایک دوسرے سے تضاد نہیں رکھتیں بلکہ ”انا له لحفظون“ کے عام مفہوم میں شامل ہیں تو پھر کیوں ہم اس محافظت کو ایک کونے میں محصور کر دیں جبکہ یہ مطلق طور پر اور اصطلاح کے مطابق حذف متعلق کے

ساتھ آئی ہے حق یہ ہے کہ اس آیت کے ذریعے خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ قرآن کی ہر لحاظ سے حفاظت و نگہداری کرے گا اسے ہر قسم کی تحریف سے بچائے گا۔

اسے فنادی نابودی سے محفوظ رکھے گا اور وسوسے پیدا کرنے والے سوفسطائیوں اور بدیہات کے منکر دین سے اس کی محافظت کرے گا۔

باقی رہا بعض قدام مفسرین کا یہ احتمال کہ یہاں ذاتِ پیغمبر مراد ہے اور ”لہ“ کی ضمیر پیغمبر کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ قرآن کی بعض آیات (مثلاً طلاق^(۱)) میں لفظ ”ذکر“ کا اطلاق ذاتِ پیغمبر پر ہوا ہے یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیر بحث آیت سے قبل آیت میں لفظ ”ذکر“ صراحت کے ساتھ قرآن کے معنی میں آیا ہے۔ اور یہ مسلم ہے کہ یہ بعد والی آیت اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

عدم تحریف قرآن

تمام شیعہ سنی علماء مشہور و معروف یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی اور جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے، بالکل وہی قرآن ہے جو پیغمبر اکرم پر نازل ہوا، یہاں تک کہ اس میں کوئی لفظ اور کوئی حرف بھی کم یا زیادہ نہیں ہوا۔

قدما اور متاخرین میں سے وہ عظیم شیعہ علماء کہ جنہوں نے اس حقیقت کی تصریح کی ہے ان میں سے کوئی حسب ذیل علماء کے نام لئے جاسکتے ہیں:

مرحوم شیخ طوسی جو شیخ الطائفہ کے نام سے مشہور ہیں انہوں نے اپنی مشہور کتاب ”تفسیر بیان“ کے آغاز میں اس سلسلے میں روشن واضح اور قطعی بحث کی ہے۔

۲۔ سید مرتضیٰ جو چوتھی صدی ہجری کے اعظم علماء امامیہ میں سے ہیں۔

۳۔ رئیس المحدثین مرحوم صدوق محمد بن علی بن بابویہ وہ عقائد امامیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں ہوئی۔“

۴۔ عظیم مفسر مرحوم طبرسی سے بھی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس سلسلے میں ایک واضح بحث کی ہے۔

۵۔ مرحوم کاشف الغطاء جو بزرگ علماء متاخرین میں سے ہیں۔

۶۔ مرحوم محقق یزدی نے کتاب عرہ الوثقیٰ میں جمہور مجتہدین شیعہ سے عدم تحریف قرآن نقل کیا ہے۔

۷۔ بہت سے دوسرے بزرگواروں مثلاً شیخ مفید، شیخ بہائی، قاضی نور اللہ اور دیگر شیعہ محققین نے یہی عقیدہ نقل کیا ہے۔ اہل سنت کے بزرگ اور محققین بھی زیادہ تر یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

اگرچہ بعض شیعہ اور سنی محدثین کہ جن کی اطلاعات قرآن کے بارے میں ناقص تھیں انھوں نے قرآن میں وقوعِ تحریف کا ذکر کیا ہے لیکن دونوں مذاہب کے بزرگ علماء کی وضاحت سے یہ عقیدہ باطل قرار پا کر فراموش ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ مرحوم سید مرتضیٰ ”المسائل الطرابلسیات“ کے جواب میں کہتے ہیں:

”صحت نقل قرآن دنیا کے مشہور شہروں، تاریخ کے عظیم واقعات اور مشہور معروف کتب کے بارے میں ہماری اطلاعات کی طرح واضح اور روشن ہے۔

کیا کوئی شخص مکہ اور مدینہ یا لندن اور پیرس جیسے شہروں کے ہونے میں کوئی شک و شبہ کر سکتا ہے اگرچہ اس نے کبھی بھی ان شہروں کی طرف سفر نہ کیا ہو۔

کیا کوئی شخص ایران پر مغلوں کے حملے، فرانس کے عظیم انقلاب یا پہلی اور دوسری عالمی جنگ کا منکر ہو سکتا ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا اس لئے یہ تمام چیزیں تو اتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔

قرآن کی آیات بھی اسی طرح ہیں اس تشریح کے ساتھ کہ جو ہم بعد میں بیان کریں گے۔

اگر بعض افراد نے اپنے مفادات کی غرض سے شیعہ سنی میں تفرقہ ڈالنے کے لئے شیعوں کی طرف تحریف کے اعتقاد کی نسبت دی ہے تو ان کے دعویٰ کے بطلان کی دلیل علماء شیعہ کی بڑی اور عظیم کتب ہیں۔

یہ بات عجب نہیں کہ فخر رازی جیسا شخص کہ جو شیعوں سے مربوط مسائل میں خاص حساسیت اور تعصب رکھتا ہے محل بحث آیت کے ذیل میں کہتا ہے کہ یہ آیت ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ مذہب شیعہ کے بطلان کی دلیل ہے کیونکہ وہ قرآن میں تغیر اور کمی بیشی کے قائل ہوتے ہیں۔

ہم صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر اس کی مراد بزرگان اور محققین شیعہ ہیں تو ان میں سے کوئی بھی اس قسم کا عقیدہ نہیں رکھتا تھا اور نہ رکھتا ہے اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اس سلسلے میں میں شیعوں کے درمیان ایک ضعیف قوم موجود ہے تو اس کی نظیر اہل سنت میں بھی موجود ہے کہ جس کی نہ وہ اعتناء کرتے ہیں نہ ہم۔

معروف محقق کاشف الغطاء اپنی کتاب ”کشف الغطاء“ میں کہتے ہیں:-

لاریب انه ”ای القرآن“ محفوظ من النقصان بحفظ الملک الدیان کما دل علیہ صریح القرآن وجماع العلماء فی کل زمان ولا عبرة بنادر۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی حفاظت کے سائے میں ہر قسم کی کمی اور تحریف سے محفوظ رہا ہے جیسا کہ صریح قرآن اس پر دلالت کرتا ہے اور ہر زمانے کے علماء کا اس پر اجماع رہا ہے اور شاذ و نادر افراد کی مخالفت کی کوئی حیثیت نہیں ہے (تفسیر آلاء الرحمن ص ۳۵)

تاریک اسلام نے اس قسم کی ناروا نسبتیں کہ جن کا سرچشمہ تعصب کے سوا کچھ نہیں، بہت دیکھی ہیں ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض دشمنوں کی طرف سے پیدا کردہ غلط فہمیاں تھیں کہ جو اس قسم کے مسائل کھڑے کرتے تھے کہ مسلمانوں کی صفوں اتحاد و وحدت ہرگز برقرار نہ رہے۔

معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مشہور حجازی مؤلف عبداللہ القصیمی اپنی کتاب الصراع میں شیعوں کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے :-

شیعہ ہمیشہ سے مساجد کے دشمن تھے یہی وجہ ہے کہ جو شیعوں کے شہروں میں جائے، شمال سے جنوب تک، اور مشرق سے مغرب تک اسے بہت کم مساجد دکھائی دیں گی۔^(۲)

خوب غور کریں کہ ہم ان تمام مساجد کو شمار کرتے تھک جاتے ہیں کہ جو شاہراہوں، بازاروں، کوچوں بلکہ شیعہ محلوں میں موجود ہیں۔ بعض مقامات پر تو ایک ہی علاقے میں اتنی مسجدیں ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بس کمر، آؤ کوئی اور کام بھی کرو۔

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک مشہور مؤلف اس صراحت سے ایسی بات کرتا ہے جو ہم جیسے لوگوں کے نزدیک تو محض مضحکہ خیز ہے کہ جو ان مناطق اور شیعہ علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر فخر رازی کوئی ایسی نسبت دیتا ہے تو زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔

عدم تحریف قرآن کے دلائل

۱۔ حافظان قرآن:

عدم تحریف قرآن کے بارے میں ہمارے پاس بہت زیادہ دلائل و براہین موجود ہیں ان میں زیادہ واضح اور روشن زیر بحث آیت اور قرآن کی کچھ اور آیات کے علاوہ اس عظیم آسمانی کتاب کی تاریخ بھی ہے۔

مقدمہ کے طور پر اس نکتہ کی یاد دہانی ضروری ہے کہ وہ ضعف اقلیت کہ جس نے تحریفِ قرآن کا احتمال ذکر کیا ہے، وہ صرف قرآن میں کمی کے سلسلے میں ہے۔ ورنہ کسی نے بھی یہ احتمال پیش نہیں کیا کہ موجودہ قرآن میں کسی چیز کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (غور کیجئے گا)

یہاں سے گذر کر اگر ہم اس موضوع پر غور و فکر کریں کہ قرآن مسلمانوں کے لئے کچھ تھ قانون اساسی، زندگی کا دستور العمل، حکومت کا پروگرام، مقدس آسمانی کتاب اور رمز عبادت سب کچھ تو قرآن تھا تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصولی طور پر اس میں کمی بیشی کا امکان نہیں۔

قرآن ایک ایسی کتاب تھی کہ پہلے دور کے مسلمان ہمیشہ نمازوں میں، مسجدوں میں، گھروں میں، میدان جگ میں دشمن کا سامنا کرتے ہوئے اپنے مکتب کی حقانیت پر استدلال کرنے کے لئے اسی سے استفادہ کرتے تھے یہاں تک کہ تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم قرآن عورتوں کا اہق مہر قرار دیتے تھے اور اصولی ور پر تنہا وہ کتاب کہ جو تمام محافل کا موضوع تھی اور ہر بچے کو ابتدائے عمر سے جس سے آشنا کیا جاتا تھا اور جو شخص بھی اسلام کا کوئی درس پڑھنا چاہتا اسے اس کی تعلیم دی جاتی تھی جی ہاں وہ قرآن یہی قرآن مجید ہے۔

کیا اس کیفیت کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو یہ شخص کو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آسمانی کتاب میں تغیر و تبدل ہو گیا ہو خصوصاً جبکہ ہم نے اسی تفسیر کی جلد اول کی ابتداء میں ثابت کیا ہے کہ قرآن ایک مجموعہ کی صورت میں اسی، موجود ہ صورت میں خود زمانہ پیغمبر میں جمع ہو چکا تھا اور مسلمان سختی سے اسے یاد کرنے اور حفظ کرنے کو اہمیت دیتے تھے۔ اصولی طور پر اس زمانے میں افراد کی شخصیت زیادہ تر اس بات سے پہچانی جاتی تھی کہ انھیں قرآن کی آیات کس حد تک یاد ہیں۔

قرآن کے حافظوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ تواریخ میں ہے کہ حضرت ابو بکر کے زمانے میں ایک جنگ میں قرآن کے چار سو قاری مارے گئے تھے۔^(۱)

”بَر مَعُونہ“ مدینہ کی نزدیکی آبادیوں میں سے تھی۔ یہاں ایک واقعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں رسول اللہ کی زندگی میں اس علاقے میں ایک جنگ رونما ہو گئی تھی۔ یہاں ایک واقعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں رسول اللہ کی زندگی میں اس علاقے میں ایک جنگ رونما ہو گئی۔ اس جنگ میں اصحاب پیغمبر میں سے قاریان قرآن کی ایک کثیر جماعت نے شہادت نوش

کیا یہ تقریباً ستر افراد تھے۔^(۲)

ان سے اور ان جیسے دیگر واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حافظ وقاری اور معلمین قرآن اس قدر زیادہ تھے کہ صرف ایک میدان جنگ میں ان میں سے اتنی تعداد نے جام شہادت نوش کیا اور تعداد ایسی ہونا چاہیے تھی کیونکہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے لئے صرف قانون اساسی نہیں ہے بلکہ ان کا سب کچھ اسی سے تشکیل پاتا ہے۔ خصوصاً ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی کتاب نہ تھی اور تلاوت و قرأت اور حفظ و تعلیمِ قرآن کے ساتھ مخصوص تھا قرآن ایک تروک کتاب نہ یہ گھری مسجد کے کسی کونے میں فراموشی کے گرد و غبار کے نیچے پڑی ہوئی نہ تھی کہ کوئی اس میں کمی یا زیادتی کر دیتا۔

حفظ قرآن کا مسئلہ ایک سنت اور ایک عظیم عبادت کے عنوان سے ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان تھا اور ہے یہاں تک کہ قرآن ایک کتاب کی صورت میں بہت زیادہ پھیل گیا اور تمام جگہوں پر پہنچ گیا بلکہ آج بھی چھاپہ خانے کی صنعت کے وجود میں آنے کے بعد جبکہ اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ قرآن ہی چھپتا اور نشر ہوتا ہے پھر بھی حفظ قرآن کے مسئلے نے ایک قدیم سنت اور عظیم افتخار کے طور پر اپنی اہمیت و حیثیت کو محفوظ رکھا ہے اور ہر شہر و دیار میں ہمیشہ ایک جماعت حافظ قرآن تھی اور آج بھی ہے۔

اس وقت حجاز اور کئی دیگر اسلامی ممالک میں ”تحفظ القرآن الکریم“ یا دوسرے ناموں سے ایسے مدارس موجود ہیں، جہاں طالب علموں کو پہلے مرحلے میں قرآن حفظ کرایا جاتا ہے۔ سفر مکہ کے دوران اس شہر مقدس میں ان مدارس کبر براہوں سے جو ملاقات ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے ان مدارس میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مشغول تحصیل ہیں۔ جاننے والوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ اس وقت پاکستان میں تقریباً پندرہ لاکھ حافظان قرآن موجود ہیں۔

جیسا کہ دائرۃ المعارف فرید وجدی نے نقل کیا ہے کہ جامعۃ الازھر مصر کی یونیورسٹی میں داخلے کی ایک شرط پورے قرآن کا حفظ ہونا ہے اس کے لئے چالیس میں سے کم کم بیس نمبر رکھے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ خود آنحضرت کے حکم و تاکید سے کہ جو بہت زیادہ روایات میں آئی ہے حفظ قرآن کی سنت زمانہ پیغمبر سے لے کر آج تک ہر دور میں جاری و ساری ہے۔ کیا ایسی حالت میں تحریف قرآن کے بارے میں کسی احتمال کا امکان ہے؟

ان تمام امور کے علاوہ کاتبانِ وحی کا معاملہ بھی غور طلب ہے یہ وہ افراد تھے جو آنحضرت کے حکم اور تاکید سے آپ پر قرآن کی آیات نازل ہونے کے بعد انھیں لکھ لیتے تھے ان کی تعداد چودہ سے لے کر تتالیس تک بیان کی گئی ہے۔
ابو عبد اللہ زنجانی اپنی نہایت قیمتی کتاب ”تاریخ قرآن“ میں لکھتے ہیں۔

كان للنبي كتابا يكتبون الوحي وهم ثلاثة و اربعون اشهر هم الخلفاء الاربعة و كان الزمهم للنبي زيد بن ثابت و
علي بن ابي طالب عليه السلام۔

پیغمبر کے مختلف کاتب اور لکھنے والے کہ جو وحی لکھا کرتے تھے اور وہ تتالیس افراد تھے کہ جن میں زیادہ مشہور خلفاء اربعہ تھے۔ لیکن اس سلسلے میں پیغمبر کے سب سے بڑھ کر ساتھی زید بن ثابت اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔^(۳)
وہ کتاب کہ جسے اس قدر لکھنے والے تھے کیسے ممکن ہے کہ تحریف کرنے والے اس کی طرف ہاتھ بڑھا سکتے۔

۱۔ البیان فی تفسیر القرآن ص ۲۶۰ بحوالہ منتخب کنز العمال۔

۲۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۷۔

۳۔ تاریخ القرآن ص ۳۴۔

۳۔ تمام رہبران اسلام نے اسی قرآن کی دعوت دی ہے:

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیشواؤں کے کلمات کا مطالعہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ابتدائے اسلام سے باہم بیک زبان لوگوں کو اسی موجودہ قرآن کی تلاوت، مطالعہ اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے تھے اور یہ امر خود نشاندہی کرتا ہے کہ یہ آسمانی کتاب اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر بعد تک تحریف ناپذیر مجموعہ کی صورت میں موجود ہی ہے۔

نبج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کے کلمات اس دعویٰ کے زندہ گواہ ہیں۔

خطبہ ۱۳۳ میں آپ (علیہ السلام) فرماتے ہیں:-

وكتاب الله بين اظهر كم ، ناطق لا يعيالسانه، و بيت لا تهدم اركانه ، و عزلا تهزم اعوانه۔

اور اللہ تمہارے درمیان ایسا ناطق ہے جس کی زبان کبھی گنگ نہیں ہوتی۔ یہ ایسا گھر ہے جس کے ستون کبھی منہدم نہیں ہوتے اور یہ ایسا سرمایہ عزت ہے کے انصار کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔

خطبہ ۱۷۶ میں فرماتے ہیں:- و اعلموا ان هذا القرآن هو الناصح الذی الیغش والهادی الذی لایضل۔

جان لو کہ یہ قرآن ایسا ناصح ہے جو اپنی نصیحت میں کبھی خیانت نہیں کرتا اور ایسا ہادی ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا۔ نیز اسی خطبے میں ہے: وما جالس هذا القرآن احد الا قام عنه بزيادة او نقصان، زيادة من هدی ، او نقصان من عمی

کوئی شخص اس قرآن کا ہم نشین نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس سے پاس زیادتی یا نقصان کے ساتھ اٹھتا ہے۔ ہدایت کی زیادتی یا گمراہی کی کمی۔

اسی خطے کے آخر میں ہے: ان الله سبحانه لم يعظ احداً بمثل هذا القرآن ، فانه حبل الله المتين و سببه الامين۔

خدا نے کسی کو اس قرآن جیسی وعظ و نصیحت نہیں کی۔ کیونکہ یہ خدا کی محکم رسی اور اس کا قابل اطمینان وسیلہ ہے

خطبہ ۱۹۸ میں ہے:- ثم انزل عليه الكتاب نوراً لا تطفأ مصابيحہ، و سراجاً لا یخبو توقده، و منها جا لا یضل نهجه و فرقاناً لا یخمد برهانه

اس کتاب کے بعد خدا نے اپنے نبی پر ایک کتاب نازل کی وہ کتاب جو خاموش نہ ہونے والا نور ہے اور جو ایسا چراغ پر فروغ ہے کہ جس میں تاریکی آہی نہیں سکتی اور یہ ایسا راستہ ہے جس پر چلنے والے گمراہ نہیں ہو سکتے اور یہ حق کی باطل سے جدائی کا ایسا سبب ہے جس کی برہان خاموش نہیں ہوتی۔

ایسی تعبیرات حضرت علی السلام اور دیگر پیشوایان دین کے کلمات و ارشادات میں بہت زیادہ ہیں۔ فرض کریں کہ اگر دست تحریف اس آسمانی کتاب کی طرف بڑھا ہوتا تو کیا پھر بھی ممکن تھا کہ اس کی طرف دعوت دی جاتی۔ اور اسے راہ کشا، حق کی باطل جدائی کا ذریعہ، نہ بچھنے والا نور، خاموش نہ ہونے والا چراغ، خدا کی محکم رسی اور اس کا امین و قابل اطمینان وسیلہ قرار دے کر تعارف کروایا جاتا۔

۴۔ آخری دین اور ختم نبوت کا تقاضا:

اصولی طور پر پیغمبر اسلام کی خاتمیت قبول کر لینے کے بعد اور یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ دین اسلام آخری خدائی دین ہے اور قرآن کا پیغام دنیا کے خاتمے تک برقرار رہے گا کس طرح یہ باور کیا جاسکتا ہے خدا اسلام اور پیغمبر خاتم کی اس واحد سند کی حفاظت نہیں کرے گا۔

اسلام کے ہزاروں سال کے بعد باقی رہنے، جاودا ہونے اور آخری دنیا تک رہنے کے ساتھ کیا تحریف قرآن کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے؟

۵۔ روایات ثقلین:

روایات ثقلین کہ جو طرق معتبر و متعددہ سے پیغمبر اسلام سے نقل ہوئی ہیں قرآن کی اصالت اور ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہنے پر ایک ایک اور دلیل ہیں کیونکہ ان روایات کے مطابق پیغمبر اکرم فرماتے ہیں:

میں تمہارے درمیان میں سے جا رہا ہوں اور دو گرانمایہ چیزیں تمہارے لئے بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں، پہلی اور دوسری میری اہل بیت۔ اگر تم نے ان کا دامن نہ چھوڑا، توہ رگز گمراہ نہیں ہو گے۔^(۱)

۱۔ حدیث ثقلین متواتر احادیث میں سے ہے یہ حدیث اہل سنت کی بہت سے کتب میں صحابہ کی ایک جماعت کی وساطت سے پیغمبر اکرم سے نقل ہوئی ہے ان صحابہ میں ابو سعید خدری، زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابو ہریرہ، حذیفہ بن اسید، جابر بن عبد اللہ انصاری، عبد اللہ حنطب، عبد بن حمید، جبیر بن مطعم، ضمہ اسلمی، ابوذر غفاری، ابو رافع اور ام سلمہ وغیرہ شامل ہیں۔

کیا ایسی بات کسی ایسی کتاب کے لئے صحیح ہے جو تحریف کا شکار ہو گئی ہو۔

۶۔ قرآن جھوٹی اور سچی روایات کے لئے کسوٹی ہے:

ان سب پہلوؤں سے قطع نظر قرآن کا تعارف سچی اور جھوٹی روایات و احادیث کو پرکھنے کے لئے معیار کے طور پر کروایا گیا ہے بہت سے روایات کہ جو منابع اسلام میں آئی ہیں ان میں سے کہ جو حدیث کے سچے یا جھوٹے ہونے کے بارے میں شک کرو اسے قرآن کے سامنے پیش کرو، جو حدیث کے موافق وہ حق ہے اور جو حدیث اس کے مخالف ہے وہ باطل اور غلط ہے۔

فرض کریں کہ قرآن میں کسی کے لحاظ سے ہی تحریف ہوتی تب بھی ہرگز ممکن نہ تھا کہ اس کا تعارف حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی کے طور پر کروایا جاتا۔

روایات تحریف

مسئلہ تحریف کے بارے میں جو بعض لوگوں کے ہاتھ اہم ترین دستاویز ہے وہ ایسی مختلف روایات ہیں جن کا حقیقی مفہوم نہیں سمجھا گیا یا پھر ان کی سند کے بارے میں تحقیق نہیں کی گئی جس کی وجہ سے اس قسم کی بری تعبیر وجود میں آئی ہے۔

ایسی روایات مختلف قسم کی ہیں:

۱۔ ایسی روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت علی (علیہ السلام) نے قرآن جمع کرنا شروع کیا جب اسے جمع کر چکے تو اسے صحابہ کے ایک گروہ کے پاس لے آئے انہوں نے مقام خلافت کے ارد گرد کو گھیر رکھا تھا۔ آپ نے پیش فرمایا تو انہوں نے اسے قبول نہ کیا اس پر حضرت علی (علیہ السلام) نے کہا: پھر تم اسے کبھی نہ دیکھو گے۔

لیکن ان روایات میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس جو قرآن تھا وہ دوسرے قرآنوں سے مختلف نہیں تھا۔ البتہ تین چیزوں کا فرق تھا۔

پہلا یہ کہ اس کی آیات اور سورتیں ترتیب نزولی کے مطابق منظم کی گئی تھیں۔

دوسرا یہ کہ ہر آیت اور سورۃ کی شان نزول اس کے ساتھ لکھی گئی تھی۔

تیسرا یہ کہ جو تفاسیر آپ نے پیغمبر اکرم سے سنی تھیں وہ اس میں درج تھیں، نیز اس میں آیاتِ ناسخ و منسوخ کی نشاندہی بھی کی گئی تھی۔

لہذا وہ قرآن جو حضرت علی علیہ السلام نے جمع کیا تھا اس میں اس قرآن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہ تھی اور جو چیز زیادہ تھ تھی وہ تفسیر تاویل، شان نزول اور ناسخ و منسوخ کی تمیز وغیرہ تھی دوسرے لفظوں میں وہ قرآن بھی تھا اور قرآن کی اصلی تفسیر بھی تھی۔

کتاب سلیم بن قیس میں ہے:-

ان امیر المؤمنین (علیہ السلام) لما رای غدر الصحابة وقلة و فائهم لزم بيته، و اقبل على القرآن، فلما جمعه كله، و كتابه بيده، و تأويله الناسخ و المنسوخ، بعثت اليه ان اخرج فبايع، فبعث اليه انى مشغول فقد آليت على نفسي لا ارتدى بردائي الا لصلاة حتى اؤلف القرآن و اجمعه۔^(۱)

جس وقت امیر المؤمنین (علیہ السلام) نے صحابہ کی بے وفائی اور دوستوں کی کسی دیکھی تو گھر نہ چھوڑا اور قرآن کی طرف توجہ ہوئے آپ قرآن جمع کرنے اور اسے اپنے ہاتھ سے لکھنے میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ تاویل اور ناسخ و منسوخ سب کو جمع کر لیا اس دوران میں انہوں نے آپ کے پاس کسی کو بھیجا کہ گھر سے باہر نکلیں اور بیعت کریں آپ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ مشغول ہوں، میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کر لوں سوائے نماز کے عبا کندے پر نہیں ڈالوں گا۔

۲۔ روایات کی دوسری قسم وہ ہے جو تحریف معنوی کی طرف اشارہ کرتی۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تحریف تین طرح کی ہے:-

۱۔ تحریف لفظی

۲۔ تحریف معنوی

۳۔ تحریف معنوی

۱۔ لفظی یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور عبارت میں کسی بیشی اور تغیر کیا جائے اور یہ وہ تحریف ہے جس کا ہم اور تمام محققین اسلام شدت سے انکار کرتے ہیں۔

۲۔ تحریف معنوی یہ ہے کہ آیت کا معنی اور تفسیر اس طرح سے کی جائے کہ وہ اس کے حقیقی مفہوم کے برخلاف ہو

۳۔ تحریف عملی یہ ہے کہ اس کے خلاف عمل کیا جائے۔

مثلاً تفسیر علی بن ابراہیم میں ابوذر منقول ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی:-

یوم بیض وجوہ و تسود وجوہ

جس دن کچھ لوگوں کے چہرے تو سفید ہوں گے اور کچھ کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ (آل عمران ۱۰۶)۔

تو پیغمبر نے فرمایا:-

روز قیامت لوگوں سوال کیا جائے گا تم تم نے ثقلین (قرآن و عترت پیغمبر) کے ساتھ کیا سلوک کیا تو لوگ کہیں گے

:اما الاکبر فحرقناه، ونبذناه وراء طهورن

ہم نے ثقل اکبر (قرآن) کی تحریف کی اور اسے پس پشت ڈال دی

واضح ہے کہ یہاں تحریف سے مراد وہی مفہوم قرآن کو درگوں کرنا اور اسے پس، پشت ڈال دینا ہے۔

۳۔ تیسری قسم ان روایات کی ایسی روایات ہیں۔ یہ روایات دشمنوں، منخرفوں یا نادانوں نے قرآن کو بے اعتبار کرنے کے لئے گھڑی ہیں مثلاً وہ متعدد روایات جو احمد بن سیاری سے نقل ہوئی ہیں کہ جن کی تعداد ایک سو اٹھاسی (یہ تعداد کتاب ”برہان روشن“ کے مؤلف نے لکھی ہے)۔ تک جا پہنچی ہے۔ مرحوم حاجی نوری نے کتاب ”فصل الخطاب“ میں انھیں فروانی سے نقل کیا ہے۔

ان احادیث کا راوی سیاری بہت سے بزرگ علماء رجال کے بقول فاسد المذہب، ناقابل اعتماد ضعیف الحدیث تھا اور بعض کے بقول صاحب غلو، منخرف، تناسخ کے ساتھ مشہور اور کذاب تھا۔ مشہور صاحب کتاب رجال کشی کے بقول امام جواد علیہ السلام نے اپنے خط میں سیاری کے دعووں کو باطل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

البتہ روایات تحریف سیاری میں منحصر نہیں ہیں لیکن ان کا زیادہ تر حصہ اسی کی طرف سے ہے۔

ان جعلی روایات میں کچھ مضحکہ خیز روایات بھی نظر آتی ہیں جو شخص تھوڑا بہت بھی مطالعہ رکھتا ہے وہ فوراً ان روایات کی خرابی کو سمجھ لیتا ہے مثلاً ایک روایت کہتی ہے کہ سورہ نساء کی آیہ ۳ میں ”﴿وَانْ خَفْتُمْ لَا تُقْسِطُوا فِی الْیَمَیْنِ﴾“ اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں اچھی لگتی ہیں) شرط اور جزاء کے درمیان میں سے ایک تنہائی سے زیادہ قرآن ساقط ہو گیا ہے۔

حالانکہ ہم سورہ نساء کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ اس آیت میں شرط اور جزاء پوری طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں یہاں تک کہ اس میں سے ایک لفظ بھی ساقط نہیں ہوا۔

علاوہ ازیں ایک تہائی سے زیادہ تو پھر اس حساب سے کم از کم چودہ پاروں کے برابر بنتا ہے۔
یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ ان سب کاتبان، وحی اور زمانہ پیغمبر سے لے کر آج تک قرآن کے حافظوں اور قاریوں کے ہوتے ہوئے اس کے چودہ پارے ضائع ہو گئے اور کوئی آگاہ نہ ہوا۔
ان جھوٹوں اور جعل سازوں نے اس تاریخی حقیقت کی طرف توجہ نہیں کہ قرآن کہ جو اسلام کا قانون اساسی ہے اور شروع سے مسلمانوں کا سب کچھ اسی سے تشکیل پاتا ہے رات دن گھروں اور مسجدوں میں اس کی تلاوت ہوتی رہتی ہے کیا اس عالم میں اس کا ایک لفظ بھی ساقط کیا جاسکتا ہے تھا چہ جائیکہ اس کے چودہ پارے غائب کر دئے جائیں۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ایسی احادیث گھڑنے والوں کے پیدا ہونے کی واضح دلیل ہے۔

بہت سے بہانہ تراش کتاب فصل الخطاب کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کتاب کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے یہ مرحوم حاجی نوری کی تالیف ہے اور تحریف کے سلسلے میں لکھی گئی ہے اس کے ابرے میں ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کے علاوہ اس باقی اس کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے کہ مرحوم حاج شیخ آقا بزرگ تهرانی کہ جو مرحوم حاجی نوری کے شاگرد مبرز ہیں، اپنے استاد کے حالات کے ذیل میں ”مستدرک الوسائل“ کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں:-

باقی رہا کتاب ”فصل الخطاب“ کے بارے میں تو میں نے بارہا اپنے استاد سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ وہ مطالب جو فصل الخطاب میں ہے وہ میرا ذاتی عقیدہ نہیں ہے۔ یہ کتاب تو میں نے بحث و اشکال کے لئے لکھی ہے اور اشارتاً عدم تحریف کے بارے میں اپنا عقیدہ بھی بیان کر دیا ہے اور بہتر تھا کہ میں کتاب کا نام ”فصل الخطاب فی عدم تحریف الكتاب“ رکھتا۔

اس کے بعد مرحوم محدث تهرانی کہتے ہیں:

عملی لحاظ سے ہم اپنے استاد کی روش اچھی طرح دیکھتے تھے کہ وہ روایات تحریف کو کچھ بھی وزن دینے کے قائل نہ تھے بلکہ انہیں ایسی روایات سمجھتے تھے جنہیں دہوار پر دے مارنا چاہیئے۔ ہمارے استاد کی طرف تحریف کی نسبت وہی شخص دے سکتا ہے جو ان کے عقیدہ سے آشنائی نہ رکھتا ہو۔

آخری بات یہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جو مسلمانوں کے لئے اس آسمانی کتاب کی عظمت کو محسوس نہیں کرتے تھے انھوں نے کوشش کی کہ اس قسم کے خرافات اور باطل سے قرآن کو اس کی اصالت اور بنیاد سے گرا دیں۔ گذشتہ اور موجودہ زمانے میں بہت سی آیات تبدیل کر دیں لیکن یہ ان کا اندھا پن تھا، علماء اسلام فوراً دشمن کی اس سازش سے آگاہ ہوئے اور ان نسخوں کو اکٹھا کر لیا۔ یہ سیاہ دل دشمن نہیں جانتے تھے کہ قرآن میں سے ایک نقطہ بھی تبدیل ہو جائے تو قرآن کے مفسرین، حفاظ و قارئین فوراً اس سے آگاہ ہو جائیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ نور خدا کو بجھا دیں لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ ﴿يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نَوْرَ اللَّهِ بِأَفْوَهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ ۖ إِلَا أَن يَتِمَّ نُورُهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ (توبہ - ۳۲)

۱۔ اس کی عبارت اس طرح ہے۔ و الشيعة هم ابداء اعداء المساجد ولهذا يقل ان يشاهد الضارب في طول بلادهم عرضها مسجداً

آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵

- ۱۰۔ ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ الْأَوَّلِينَ﴾ -
 ۱۱۔ ﴿وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾ -
 ۱۲۔ ﴿كَذَلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ﴾ -
 ۱۳۔ ﴿لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ﴾ -
 ۱۴۔ ﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ﴾ -
 ۱۵۔ ﴿لَقَالُوا إِنَّمَا سُكَّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ﴾

ترجمہ

- ۱۰۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) گزشتہ امتوں کے درمیان پیغمبر بھیجے ہیں۔
 ۱۱۔ کوئی پیغمبر ان کے پاس نہیں آیا تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔
 ۱۲۔ ہم اسی طرح (اور تمام وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے) قرآن کو مجرموں کے دلوں کے اندر راستہ دیتے ہیں

- ۱۳۔ (لیکن اس کے باوجود) وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور گزشتہ امتوں کی روش بھی اسی طرح تھی۔
 ۱۴۔ اور اگر ہم آسمان سے ان کے لئے کوئی دروازہ کھول دیں اور وہ مسلسل اس میں اوپر کی طرف جائیں۔
 ۱۵۔ تو کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کی گئی ہے بلکہ ہمیں (سرتاپا) مسحور کر دیا گیا ہے

تفسیر

ہٹ دھرمی اور محسوسات کا انکار

ان آیات میں پیغمبر اکرم اور مومنین کو اپنی دعوت میں درپیش مشکلات کے مقابلے میں تسلی و تشفی کے لئے گزشتہ انبیاء کی زندگی اور گمراہ و متعصب قوموں کے مقابلے میں ان کی مصیبتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے پہلے ہم نے گزشتہ امتوں کے درمیان بھی نبی بھیجے تھے ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْعِ

الْأَوَّلِينَ﴾ -

لیکن وہ لوگ ایسے ہٹ دھرم اور سخت مزاج تھے کہ ”جو پیغمبر بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا تمسخر اڑاتے ﴿وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾۔

یہ استہزاء چند امور کی وجہ سے ہوتا تھا

- انبیاء کی شان و شوکت کو کم کرنے اور حق کے متلاشی اور حق طلب افراد کو ان سے دور کرنے کے لئے۔
- خدائی رسولوں کی منطق کے مقابلے میں ان کی اپنی ناتوانی کی وجہ سے چونکہ وہ لوگ ان کے دندان شکن دلائل کا جواب نہیں دے سکتے تھے لہذا تمسخر کا سہارا لیتے یعنی بے منطق نادان کا حربہ استعمال کرتے تھے۔
- اس بناء پر کہ انبیاء بدعت شکن تھے اور غیر مناسب رسوم و رواج کے خلاف قیام کرتے تھے لیکن جاہل متعصب کہ ان غلط رسول و رواج کو ابدی سمجھتے تھے انہیں ان کام پر تعجب ہوتا تھا اور وہ استہزاء کرنے لگتے تھے۔
- یہ لوگ اس لئے بھی استہزاء کرتے تھے کہ اپنے خوابیدہ ضمیر کو سلائے رکھیں اور کہیں کوئی ذمہ داری اور مسئولیت ان کے سر نہ آجائے۔

- اس لئے کہ بہت سے انبیاء کے ہاتھ مال دنیا سے تہی ہوتے تھے اور ان کی زندگی سادہ ہوتی تھی جو لوگ اپنے دل کے اندھے پن کی وجہ سے شخصیت کو نئے لباس، اعلیٰ سواری اور نگین زندگی میں منحصر سمجھتے تھے انہیں تعجب ہوتا تھا کہ کیا ایک فقیر اور تہی دست انسان ان دولت مندوں اور خوشحال لوگوں کا رہبر ہو سکتا ہے؟ لہذا وہ اس کا تمسخر اڑانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

- آخر کار یہ بھی تھا کہ وہ دیکھتے تھے کہ انبیاء کی دعوت قبول کرنے سے ان کی شہوات و خواہشات محدودہ و جائیں گی اور ان کی حیوانی آزادی چھن جائے گی۔ اور ان کے لئے فرائض اور ذمہ داریاں پیدا ہو جائیں گی لہذا وہ استہزاء سے کام لیتے تاکہ اپنے آپ کو ان فرائض اور ذمہ داریوں سے بچا سکیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا: اسی اسی طرح ہم آیات قرآن مجرموں کے دلوں میں ں بھیجتے ہیں ﴿كَذَلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ﴾۔

لیکن ان تمام تبلیغ، تاکید، منطقی بیان اور معجزات دکھانے کے باوجود یہ متعصب تمسخر اڑانے والے ”اس پر ایمان نہیں لاتے“ ﴿لَا يُؤْمِنُونَ﴾ بہ۔

البتہ یہ انہی پر منحصر نہیں ہے ”ان سے پہلے گزشتہ اقوام کی بھی یہی روش تھی ﴿وَقَدْ خَلَّتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ﴾۔

شہوات میں غوطہ زنی اور باطل پر ہٹ دھرمی کے باعث معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اگر ہم ان کے لئے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں اور ہمیشہ آسمان کی طرف چڑھیں اور اتریں ﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ﴾۔

تو کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کی گئی ہے ﴿لَقَالُوا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا﴾۔ بلکہ ہمیں جادو گر دیا گیا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس میں قطعاً کوئی حقیقت نہیں ہے ﴿بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ﴾۔

یہ جائے تعجب نہیں کہ انسان عناد اور دھرمی کے اس درجے پر پہنچ جائے کیونکہ انسان کی پاک روح اور خرابی سے بچی ہوئی فطرت کہ جو ادراک حقائق اور واقعات کے اصلی چہرے کے مشاہدہ پر قدرت رکھتی ہے، گناہ جہالت اور حق سے دشمنی رکھنے کے زیر اثر آہستہ آہستہ تاریکی میں جا گرتی ہے البتہ ابتدائی مراحل میں اسے پاک کرنا پوری طرح ممکن ہے لیکن اگر خدا نخواستہ یہ حالت انسان میں راسخ ہو جائے اور ”ملکہ“ کی شکل اختیار کر لے تو پھر اسے آسانی سے ختم کیا جاسکتا اور یہ وہ مقام ہے کہ حق کا چہرہ انسان کی نظر میں دگرگوں ہو جاتا ہے یہاں تک کہ محکم ترین عقلی دلائل اور واضح ترین حسی براہین اس کے دل پر اثر نہیں کرتے اور اس کا معاملہ معقولات اور محسوسات دونوں کے انکار تک جا پہنچتا ہے

چند اہم نکات

۱۔ ”شیعہ کا مفہوم“

”شیعہ“ ”شیعہ“ کی جمع ہے۔ ”شیعہ“ ایسی جمیعت اور گروہ کو کہا جاتا ہے جس کے افراد خط، مشترک کے حامل ہوں مفردات میں راغب نے کہا ہے:

”شیعہ“ ”شیعہ“ کے مادہ سے پھیلاؤ اور تقویت کے معنی میں ہے ”شاع الخبر“ اس وقت کہا جاتا ہے جب خبر متعدد اور قوی ہو جائے ”شاع القوم“ اس وقت کہا جاتا ہے جب جمیعت پھیل جائے اور زیادہ تعداد میں ہو اور ”شیعہ“ ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ انسان جن کی وجہ سے قوی ہو۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس کی اصل ”مشایعت“ بمعنی متابعت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعہ پیروکار اور تابع کے معنی میں ہے اور شیعہ علی (علیہ السلام) انھیں کہا جاتا ہے جو حضرت علی (علیہ السلام) انھیں کہا جاتا ہے جو حضرت

علی (علیہ السلام) کے پیروکار ہوں اور ان کی امامت کا اعتقاد رکھتے ہوں۔ پیغمبر اکرم کی یہ مشہور حدیث حضرت امام سلمہ سے مروی ہے۔ شیعة علی ہم الفائزون یوم القيامة

(قیامت کے دن نجات پانے والے علی (علیہ السلام) کے پیرو ہیں)

یہ حدیث بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

بہر حال اس لفظ کی اصل ”شیاع“ بمعنی پھیلاؤ اور تقویت سمجھیں یا مشایعت بمعنی متابعت جانیں شیعہ اور تشیع کے مفہوم میں ایک طرح کی فکری و مکتبی ہم بستگی موجود ہونے کی دلیل ہے کہ وہ انبیاء کے خلاف پر اگندہ صورت میں عمل نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خط مشترک اور ایک ہی پروگرام کے حامل تھے کہ جو ہم آہنگ اقدامات سے تقویت پاتا ہے۔ اگر گمراہ لوگ اس طرح باہم مل کر اقدامات کرتے ہوئے تو کیا راہ حق کے سچے پیروکاروں کو اپنے راستے میں ہم آہنگی اور مشترکہ منصوبہ بندی اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ ”نسلکہ“ کی ضمیر کا مرجع

یہ لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجرموں اور مخالفوں کو اپنی آیات اس طرح سمجھا جاتا ہے کہ گویا ان کے دلوں میں داخل ہو گئی ہوں۔

لیکن افس کی بات ہے کہ عدم قابلیت اور عدم آمادگی کے سبب باہر نکل آتی ہیں جیسے مقوی اور مفید غذا خراب اور غیر صحیح معدہ میں جذب نہیں ہوتی۔ بالک یہی حقیقت ”نسلکہ“ کہ جس کا مادہ اصلی ”سلوک“ سے ہے سمجھی جاسکتی ہے۔

لہذا ”نسلکہ“ کی ضمیر ”ذکر“ (قرآن) کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گزشتہ آیات میں آیا ہے کہ اس طرح بعد والے جملے ”لایومنون بہ“ میں ”بہ“ کی ضمیر اس کی معنی کی طرف لوٹتی ہے یعنی ان تمام چیزوں کے باوجود وہ لوگ ان آیات پر ایمان نہیں لائیں گے اس بناء پر دو ضمیروں کے درمیان پوری طرح ہم آہنگی موجود ہے۔

اسی معنی میں اس تعبیر کی نظیر سورہ شعراء کی آیہ ۲۰۰ اور ۲۰۱ میں نظر آتی ہے۔

بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ ”نسلکہ“ کی ضمیر استہزاء کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گزشتہ آیت سے مستفاد ہوتا ہے لہذا جملے کا معنی یہ ہوگا: ہم نے اس استہزاء کرنے کو (ان کے گناہوں اور ہٹ دھرمیوں کی وجہ سے) ان کے دل میں داخل کر دیا ہے۔

لیکن یہ تفسیر کوئی اور اشکال نہ بھی رکھتی ہوتا ہم دو ضمیروں کے درمیان سے ہم آہنگی ختم کر دیتی ہے اور اس کی کمزوری کے لئے یہی کافی ہے (غور کیجئے گا)۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مبلغین کا فریضہ صرف یہ نہیں کہ مسائل لوگوں کے کانوں کو سنا دیں بلکہ انھیں تمام وسائل سے استفادہ کرنا چاہیئے تاکہ حق بات ان کے دل میں اتار دیں اس طرح سے کہ وہ دلنشین ہو جائے یوں حق طلب لوگوں کو ارشاد و ہدایت ہو جائے گی اور ہٹ دھرم افراد پر اتمام حجت ہو جائے گی۔

یعنی تمام سمعی و بصری اور عملی ذرائع سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ واقعات اور داستانوں سے کام لینا چاہیئے۔ شعر و ادب و ہنر و فن سے حقیقی اور اصلاحی معنی میں استفادہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ کلمات حق لوگوں کے دلوں میں جا گزریں ہو جائیں۔

۳۔ گذشتہ لوگوں کی روش

انبیاء پر طرف دار باطل کی نکتہ چینی اور مردانِ خدا سے لوگوں کو دور کرنے کی سازشیں کوئی نئی چیز نہیں اور کسی خاص زمانے یا علاقے میں منحصر نہیں بلکہ جیسا کہ مذکورہ بالا تعبیر سے معلوم ہوتا ہے قدیم زمانے سے گمراہ قوموں میں ایسی سازشیں موجود ہیں۔

لہذا ان سے ہرگز وحشت زدہ نہیں ہونا چاہیئے اور اپنے اندر مایوسی اور ناامیدی کو جگہ نہیں دینا چاہیئے۔ یاد دشمنوں کی طرف سے پیدا کردہ کثیر مشکلات سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔

یہ بات تمام راہبان حق کے لئے ایک موثر دلجوئی اور تسلی ہے۔

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دور اور کسی علاقہ میں ہم دعوتِ حق نشر کریں اور پرچمِ عدم لہرائیں لیکن ہٹ دھرم اور سخت مخالفت کرنے والے دشمن کی طرف سے ہمیں ردِ عمل کا سامنا نہ کرنا پڑے تو ہم بہت ہی زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انبیاءِ الہی اور ان کے سچے پیروکار ان مخالفتوں کی وجہ سے کبھی مایوس نہیں ہوئے بلکہ ان کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ ہر روز اپنی دعوت کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ کریں۔

۴۔ ﴿فَظْلَمُوا فِيهِ يَعْزُونَ﴾ کا مفہوم

یہ جملہ اور مندرجہ بالا آیات میں آنے والے بعد کے جملے اچھی طرح نشانہ دہی کرتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ آسمان سے کوئی دروازہ ان کے لئے کھول دیا جائے (ظاہراً آسمان یہاں اس تہ بہ فضا کی طرف اشارہ ہے جو زمین کے اطراف میں ہے کہ

جس سے آسانی سے نکلنا ممکن نہیں ہے) اور مسلسل روز روشن میں اس آئیں جائیں پھر بھی وہ شدید ہسٹ دھرمی سے کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کردی گئی ہے اور ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

توجہ رہے کہ ”ظلموا“ دن میں کسی کام کو جاری رکھنے کی دلیل ہے عرب یہ لفظ رات کے موقع کے لئے استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ ”باتوا“ کہتے ہیں جو مادہ ”یتوتہ“ (رات گزارنا) سے ہے۔

زیادہ تر مفسرین نے یہی تفسیر انتخاب کی ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ ”ظلموا“ میں ضمیر فرشتوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی اگر وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ وہ آسمان کی طرف جارہے ہیں اور پلٹ رہے ہیں تو پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

علاوہ اس کے کہ یہ تفسیر قبل اور بعد کی آیات سے کہ جو عموماً مشرکین کے بارے میں ہیں سے مناسبت رکھتی (کیونکہ ملائکہ کا ذکر صرف پہلی چھ آیات میں آیا ہے اور ان کی طرف ضمیر کا لوٹنا بہت بعید ہے) بلاغت کلام میں بھی نقص کا باعث ہے کیونکہ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہاں تک کہ اگر یہ لوگ خود بصورت اعجاز روز روشن میں آسمان کی طرف جائیں اور پلٹ آئیں تو بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ (غور کیجئے گا)۔

۵۔ سکرات ابصارنا“ کا مطلب

”سکرت“ ”سکر“ کے مادہ سے چھپانے کے معنی میں ہے یعنی ہسٹ دھرم کا فر کہتے ہیں کہ ہماری حقیقت میں آنکھ پر گویا پردہ ڈال دیا گیا ہے اور اگر ہم اپنے تئیں آسمان کی طرف محو پرواز دیکھیں تو یہ ایک خیالی بات ہے یہ بالکل وہی چیز ہے جسے فارسی زبان میں ”چشم بندی“ اور نظر بندی (اردو میں اسے فریب نظر کہتے ہیں) (مترجم)۔ سے تعبیر کرتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کے ہاتھ کی صفائی کی وجہ سے انسان حقیقت کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتا بلکہ اس کے خلاف محسوس کرتا ہے۔

یہ جو اس کے بعد جملہ ”بل نحن قوم مسحورون“ (بلکہ ہم تو جادو زدہ ہیں) آیا ہے اگرچہ فریب نظر بھی ایک قسم کا جادو ہے لیکن شاید یہ اس طرف اشارہ ہو کہ معاملہ چشم بندی سے بھی بالا ہو گیا ہے اور ہمیں سرتاپا جادو کر دیا گیا ہے نہ صرف ہماری آنکھ جادو کے زیر اثر ہے بلکہ ہمارا سارا وجود جادو کے سبب اپنا حقیقی احساس گنوا بیٹھا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے، خلاف حقیقت ہے۔

دوسرے لفظوں میں جب ہم کسی انسان کو کسی ذریعے سے اوپر لے جائیں اور نیچے لے آئیں تو وہ اس حالت کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے بلکہ پورے وجود کے ساتھ محسوس کرتا ہے لہذا اگر کسی کی پوری طرح چشم بندی کر دی جائے تو وہ پھر بھی اپنے اوپر نیچے آنے جانے کو محسوس کرے گا، یعنی فرض کریں کہ ان مشرکین کو ہم آسمان کی طرف لے جائیں تو پہلے کہیں گے کہ ہماری نظر کو فریب دیا گیا ہے اور بعد میں متوجہ ہوں گے کہ یہ حالت تو بدون چشم قابل احساس ہے تو کہیں گے اصولی طور پر تو سر سے لے کر پاؤں تک ہمارا وجود سحر زدہ ہے اور اس پر جادو کیا گیا ہے۔

آیات ۱۶، ۱۷، ۱۸

۱۶۔ ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ﴾ -

۱۷۔ ﴿وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ﴾ -

۱۸۔ ﴿إِلَّا مَنْ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ﴾ -

ترجمہ

۱۶۔ ہم نے آسمان میں برج قرار دیئے ہیں اور انھیں ناظرین کے لئے زینت عطا کی ہے۔

۱۷۔ اور اس کی ہر شیطان مردود سے حفاظت کی ہے۔

۱۸۔ مگر اشتراق سمع کرنے والے کہ شہابِ مبین جن کا تعاقب کرتے ہیں (اور انھیں ہانکتے ہیں)۔

تفسیر

شیطان شہاب کے ذریعے ہانکے جاتے ہیں:

ان آیات میں توحید اور شناختِ خدا کی دلیل کے طور پر نظامِ افریش کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان آیات کے ذریعے قرآن و نبوت کے بارے میں گزشتہ آیات کی بحث مکمل کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے آسمان میں برج قرار دیئے ہیں ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا﴾۔

”بروج“ ”برج“ کی جمع ہے اس کا اصلی معنی ”ظہور“ ہے اسی بنا پر اطرافِ شہر کی دیوار یا اجتماعِ لشکر کے اس مخصوص حصے کو برج کہا جاتا ہے جو خاص ظہور کرتا ہو۔ نیز اسی بناء پر جب عورت اپنی زینت ظاہر و آشاکر کرے تو ”تبرجت المراءۃ“ کہتے ہیں۔

بہر حال آسمانی برج سورج اور چاند کی منازل کی طرف اشارہ ہیں زیادہ دقیق تعبیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب ہم کمرہ زمین سے چاند اور سورج کی رف نگاہ کریں تو سال کے مختلف مواقع پر انھیں ہم ایک خاص صورتِ فلکی میں دیکھتے ہیں (سیاروں کے مختلف مجموعے ہیں ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص شکل اختیار کی ہوتی ہے، اسے صورتِ فلکی کہتے ہیں

(اور کہا جاتا ہے کہ سورج برج حمل، ثور، میزان، عقرت، یا قوس میں ہے۔^(۱))

ان آسمانی برجوں کا وجود، آفتاب و ماہتاب کی منزلیں اور وہ خاص نظام جو ان کی حرکت کے لئے ان پر برجوں میں موجود ہے کہ جس سے ہماری دنیائے ہستی کی تقویم بنتی ہے آفریدگار اور خالق کے علم و قدرت پر یہ ایک واضح دلیل ہے یہ عجیب و غریب نظام جو دقیق بھی ہے اور باریک حساب کا حامل ہے۔ مسلسل اور رواں دواں ہے، ظاہر کرتا ہے کہ جہان کی خلقت ایک منصوبے اور ہدف کے تحت ہے اور اس میں ہم جتنا زیادہ غور و فکر کریں ہم اس جہان کے خالق اتنا ہی قریب ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے آسمان کو اور ان کی فلکی صورتوں کو ناظرین کی زینت عطا کی ہے ﴿وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ﴾ (۲)

ایک تاریک ستاروں بھری رات میں آسمان کی طرف نظر اٹھائیں تو ہم دیکھیں گے کہ مختلف گوشوں میں ستاروں کے مختلف گروہ موجود ہیں گویا ہر گروہ کی اپنی انجمن ہے۔ اور وہ آپس میں آہستہ آہستہ راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں۔ بعض خیرہ خیرہ ہماری طرف دیکھتے ہیں مگر آنکھ سے اشارہ بھی نہیں کرتے اور بعض ہیں کہ مسلسل اشارہ کر رہے ہیں گویا ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ بعض چمکتے ہوئے یوں لگتے ہیں کہ جیسے ہمارے قریب ہوتے جا رہے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے کم رنگ نور کے ساتھ گویا آسمانوں کی ان پہنائیوں سے بغیر آواز کے صدا دے رہے ہیں کہ ہم بھی یہاں ہیں یہ خوبصورت شاعرانہ منظر جو شاید بعض کے لئے مشاہدہ کے باعث معمول کا جلوہ ہو لیکن اس پر جتنا بھی غور و فکر کریں یہ قابل دید، جاذب نظر اور شوق انگیز ہے اور جب چاند اپنی مختلف شکلوں میں ان گروہ درگروہ ستاروں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو یہ منظر اور بھی تازہ اور اعجاب انگیز ہو جاتا ہے۔

غروب آفتاب کے بعد ستارے یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے ہیں گویا کسی پردے کی اوٹ سے باہر کی طرف دوڑ رہے ہوں۔ یہی تارے دم صبح خیرہ کن آفتاب کی قوت کے سامنے ٹھہر نہیں پاتے، بھاگ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر علمی زیبائیوں اور فراواں اسرار کی نگاہ سے آسمان کا چہرہ اس قدر خوبصورت ہے کہ ہزاروں سال تمام علماء اور دانش مندوں کی آنکھ اسی کی طرف لگی ہوئی ہے۔ خصوصاً آج کی دنیا میں نہایت طاقتور ٹیلی سکوپس اور ستارے دیکھنے والی عظیم دوربینوں کے ذریعے اس کی طرف دیکھا جاتا ہے اور ہر وقت اس سے ظاہراً خاموش مگر غوغا کا کم کے تازہ اسرار اہل دنیا کے لئے منکشف ہو رہے ہیں، سچ ہے کہ:

چرخ بایں اختران نغزو خوش و زیباستی
 آسمان ان عمدہ، اچھے اور زیبا ستاروں کے ساتھ ہے
 بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے اس آسمان ک وپر مردود، شوم اور ملعون شیطان سے محفوظ رکھا ہے۔
 ﴿وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِیمٍ﴾۔

مگر وہ شیطان کہ جو اشتراق سمع“ (خبریں چرانا) کی ہوس کرتے ہیں ان کا تعاقب شہابِ مبین کرتے ہیں اور انھیں پیچھے کی طرف ہانکتے ہیں ﴿إِلَّا مَنْ اسْتَرْقَ السَّمْعَ فَاتَّبَعَهُ شَهَابٌ مُبِینٌ﴾۔

شیطان شہاب کے ذریعے کیسے ہانکے جاتے ہیں؟

زیر نظر آخری آیت ان آیات میں سے ہے جس کے متعلق مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے اور ہر ایک نے ایک خاص راستہ طے کیا ہے اور اسے ایک معین نتیجہ نکالا ہے۔

چونکہ بعینہ یہی مضمون سورہ صافات (آیہ ۷، ۶) اور سورہ جن (آیہ ۹) میں آیا ہے اور یہ ایسے مسائل میں سے ہے کہ جس کے بارے میں ممکن ہے بے خبر افراد کچھ ایسے سوالات اٹھائیں جو جواب کے بغیر رہ جائیں لہذا ضروری ہے کہ پہلے بزرگ عظیم اسلامی مفسرین کی آراء پر ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر جس رائے کو ہم ترجیح دیں اسے بیان کیا جائے۔

۱۔ بعض مفسرین مثلاً تفسری فی ظلال کا مولف ان آیات اور اس قسم کی دیگر آیات سے برے آرام سے یہ کہہ کر گزر گئے ہیں کہ یہ ایسے حقائق ہیں جن ک ادراک ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اور ضروری ہے کہ جو کچھ ہمارے حقیقی اعمال میں سے ہماری زندگی میں موثر ہے اسے اہمیت دیں۔ لہذا انھوں نے ان آیات کی اجمالی سی تفسیر پر قناعت کرتے ہوئے اس مسئلے کی توضیح سے صرف نظر کیا ہے۔

تفسیر فی ظلال کا مولف لکھتا ہے:

شیطان کیا ہے وہ کس طرح اشتراق سمع کرنا چاہتا ہے اور وہ کیا چرانا چاہتا ہے؟

یہ سب چیزیں خدائی غیوب میں سے ہیں کہ نصوص کے ذریعے جن کی دست یابی نہیں ہو سکتی اور ان کے بارے میں تحقیق و جستجو کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس سے ہمارے عقیدے میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں کہ فکر انسانی ایسی چیزیں مشغول ہوجاتی ہے جو اس کے ساتھ کوئی خاص ربط نہیں رکھتی اور اسے انسان اپنی زندگی

میں حقیقی عمل انجام دینے سے رک جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے بارے میں تحقیق سے کسی جدید حقیقت کے بارے میں ہمیں کوئی نیا ادراک نہیں ملتا^(۲)

لیکن اس میں نہیں کہ قرآن ایک ایسی عظیم انسان ساز، تربیت کنندہ اور حیات بخش کتب ہے کہ اگر کوئی چیز حیات انسانی کے ساتھ ربط نہ رکھتی ہو تو وہ اس میں ہرگز نہ ہوگی۔

یہ کتاب ساری کی ساری درس ہے درس زندگی ہے علاوہ ازیں کوئی شخص اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ قرآن میں ایسے حقائق ہوں کہ جنہیں معلوم نہ کیا جاسکتا ہو، کیا قرآن نور کتابِ مبین نہیں ہے اور کیا یہ لوگوں کے فہم و تدبر اور ہدایت کے لئے نازل نہیں ہوا۔ تو کیسے ان آیات کو سمجھنا ہم سے ربط نہیں رکھتا؟

بہر حال ان آیات اور ان جیسی آیات کے بارے میں یہ طرز اعتراض ہمیں پسند نہیں ہے۔

۲۔ مفسرین کی ایک اہم جماعت خصوصاً متقدمین مفسرین کا اصرار ہے کہ آیت کے ظاہری معنی کو پوری طرح محفوظ رکھا جائے۔ ان کے نزدیک ”سماں“ اسی آسمان کی طرف اشارہ ہے اور ”شہاب“ اسی ”شہاب“ کی طرف اشارہ ہے یعنی وہی سرگرداں سنگریزے جو اس فضائے بیکراں میں گردش کر رہے ہیں اور کبھی کبھار وہ زمین کی قوت ثقل کی زد میں آجاتے ہیں تو زمین کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ ہوا کی لہروں سے تیزی سے ٹکرانے کی بنا وہ سرخ اور شعلہ ور ہو جاتے ہیں اور خاکستر بن جاتے ہیں۔

نیز ”شیطان“ وہی خبیث، راندہ اور سرکش موجودات ہیں جو آسمانوں کی طرف جانا چاہتے ہیں اور ہمارے اس جہان کی کچھ خبریں کہ جو آسمان میں منعکس ہوتی ہیں انھیں استراق سمع سے (مخفی طور پر کان لگا کر) معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شہاب تیروں کی طرح ان کی طرف آتے ہیں اور انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔^(۳)

۳۔ مفسرین کی ایک اور جماعت نے ان آیات کی تعبیرات کو تشبیہ کنایہ اور امثال کے طور پر لیا ہے۔ یعنی اصطلاحاً انھیں سمبالک (SYMBOLIC) سمجھا ہے ان مفسرین میں المیزان کے عالی قدر مفسر اور صاحب تفسیر الجواہر طنطاوی شامل ہیں۔ ان مفسرین نے اس تشبیہ و کنایہ کو مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے۔

الف۔ تفسیر المیزان میں ہے:

مفسرین نے شیاطین کے استراق سمع اور شہاب کے ذریعے ان کے ہانکے جانے کے بارے میں جو مختلف توجیہات کی ہیں ایسی چیز پر مبنی ہیں جو کبھی کبھی ظاہر آیات و روایات سے ذہن میں آتی ہیں وہ یہ کہ افلاک زمین پر محیط ہیں ان میں

فرشتوں کے مختلف گروہ موجود ہیں ہر گروہ کے لئے ان افلاک میں کئی دروازے ہیں کہ جن میں سے ان فرشتوں کے علاوہ کوئی نہیں آجا سکتا۔ ان فرشتوں میں سے کچھ اپنے ہاتھ میں شہاب لئے ہوئے ہیں اور وہ استراق سمع کرنے والے شیاطین کی تاک ہیں کہ ان کے ذریعے ان کی سرکوبی کریں اور انھیں ہانکیں۔

حالانکہ آج کی دنیا میں واضح ہو چکا ہے کہ ایسے نظریات بے بنیاد ہیں ایسے کوئی افلاک ہیں نہ دروازے اور نہ ہی ایسی اور چیزیں۔

جو کچھ یہاں بطور احتمال کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ایسے بیانات کلام الہی میں امثال کی طرح ہیں کہ جو غیر حسی حقائق واضح کرنے کے لئے حسی لباس میں ذکر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے: ﴿لَكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالَمُونَ﴾

(یہ امثال ہیں کہ جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور صاحبانِ علم کے علاوہ انھیں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔) (عنکبوت ۴۳)۔

ایسی مثالیں قرآن میں بہت زیادہ ہیں مثلاً عرش، کرسی، لوح اور کتاب۔ لہذا آسمان کہ جو فرشتوں کا مسکن ہے سے مراد ایک عالم ملکوتی ہے جو عالم طبیعت سے ماوراء ہے کہ جو اس جہانِ محسوس سے برتر و بالاتر ہے اور اس آسمان کی باتیں چوری چھپے سننے کے لئے شیطانوں کے قریب ہونے اور ان کی طرف شہاب پھینکے جانے سے مراد ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ عالمِ ملائکہ قریب ہوں تاکہ اسرارِ خلقت اور حوادثِ آئندہ کے بارے میں آگاہی حاصل کریں لیکن وہ ملائکہ معنوی و ملکوتی انو اسے شیطانوں کو ہانکتے ہیں۔ کیونکہ ان انوار کو برداشت کرنے کی وہ تاب نہیں رکھتے (۵)

ب: طنطاوی اپنی مشہور تفسیر میں لکھتا ہے:-

ایسے علماء جو حیلہ گمر اور ریاکار ہیں اور عام لوگ جو ان کی پیروی کرتے ہیں یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ آسمانوں کی عجائب، عالم بالا کی شگفتیاں، اس کے بے کراں کمراں اور ان پر حکم فرماں نظم و حساب سے آگاہ ہوں خدا نے انھیں اس علمِ دانش سے محروم رکھا ہے اور ستاروں بھرے، خوبصورت اور مزین از آسمان کے تمام اسرار ان کے افراد کے اختیار میں دیئے ہیں جو عقل و ہوش اور اخلاص و ایمان رکھتے ہیں۔

فطری اور طبعی ہے کہ پہلا گروہ اس آسمان کے اسرار میں نفوذ سے روک دیا جاتا ہے اور درگاہ الہی سے دھتکارا ہوا شیطان چاہے نوع بشر سے ہو یا غیر بشر سے، ان حقائق تک رسائی کا حق نہیں رکھتا اور جس وقت وہ ان کے نزدیک ہوتا ہے تو دھتکار دیا جاتا ہے۔

ایسے افراد ممکن ہے بہت سال جڑیں اور مرجائیں مگر ان اسرار تک ہرگز نہیں پہنچ پاتے۔ ان کی آنکھیں کھلی تو ہوتیں ہیں لیکن حقائق دیکھنے کی تاب نہیں رکھتیں۔

کی ایسا نہیں کہ اس کا علم اس کے عاشقوں کے سوا کسی کو نہیں ملتا اور اس کے جمال کا نظارہ اس کے عارفوں کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔^(۶)

اس میں کیا مانع ہے کہ یہ تعبیرات کنایہ ہوں، منع حسی منع عقلی کی طرف اشارہ ہو جبکہ کنایہ بلاغت کی بہترین انواع میں سے ہے۔

کیا ہم دیکھتے نہیں کہ بہت سے لوگ جو ہمارے آس پاس زندگی گزارتے ہیں وہ اس زمین کے حدود اربعہ میں محبوس اور قید ہیں ان کی آنکھ کبھی جہان و بلا کی طرف نہیں اٹھتی اور وہ صدائے بالا پر کان نہیں دھرتے اور اس جہان کے امور اور عجائبات کی انھیں کوئی خبر نہیں وہ خود خواہی، شہوت، کینہ وری، طمع و حرص اور خانمان ساز شہاب کے ذریعے ان اعلیٰ معانی کے ادراک سے ہانکے گئے ہیں (اور اگر کسی روز وہ ایسی خواہش ظاہر کریں تو اپنے قلب و روح کی ان آلودگیوں کے باعث وہ ہانکے جائیں گے)^(۷)

ج:- ایک اور مقام پر اس نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

جس وقت انسانوں کی ارواح اس دنیا سے جہان برزخ کی طرف منتقل ہوتی ہیں ان کا زندوں کی روح کے ساتھ تعلق اور ارتباط ہوتا ہے اور جہاں ان کے درمیان مناسبت اور میلان ہو اور وہ احضار ارواح وغیرہ کے ذریعے ان سے ارتباط اور تفہیم برقرار رکھ سکیں تو کچھ مسائل ان کے اختیار میں دئے جاتے ہیں جو بعض اوقات حق اور بعض اوقات باطل ہوتے ہیں کیونکہ وہ عوالم اعلیٰ تک رسائی نہیں کر سکتے بلکہ ان کی رسائی صرف نچلے عوالم تک ہو سکتی ہے، مثلاً جسے مچھلی اپنے محیط سے باہر نکل کر ہوا میں پرواز نہیں کر سکتی، وہ بھی طاقت رکھتے کہ اپنے جہان کے حدود اربعہ سے نکل کر بالاتر چلے جائیں۔

و: بعض دوسرے کہتے ہیں جدید سائنسی انکشافات نشاندہی کرتے ہیں کہ بہت دور کی فضا سے طاقتور ریڈ لہروں کا ایک سلسلہ جاری ہے انھی کرہ زمین میں ریڈیائی پیغامات وصول کرنے والے مخصوص مرکز کے لئے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ کسی شخص کو معلوم نہیں کہ ان انتہائی طاقتور لہروں کا سرچشمہ کہاں ہے۔

بعض سائنسدان کہتے ہیں کہ قوی احتمال ہے کہ دور کے آسمانی کمروں میں بہت سی زندہ موجودات کہ جو تمدن کے لحاظ سے ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں لہذا وہ چاہتی ہیں کہ اپنی خبریں اس دنیا تک پہنچائیں ان خبروں میں ایسے مسائل بھی موجود ہیں جو ہمارے لئے نئے ہیں اور موجودات کہ جنہیں دیو اور پری کہتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ ان لہروں سے فائدہ اٹھائیں لیکن طاقتور شعائیں انہیں دور پھینک دیتی ہیں^(۸)

۳۔ تفسیر فی ظلال ج ۵ ص ۳۹۶۔

۴۔ فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر اور آلوسی نے روح المعانی میں اس تفسیر کا ذکر کرنے کے بعد پیٹ قدیم کے حوالے سے پیدا ہونے والے مختلف اشکالات کے جواب بھی دیئے ہیں اور کہا ہے کہ آج کی پیٹ کی طرف توجہ کرتے ہوئے افلاک کا پیاز کے چھلکوں کی طرح ہونے کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۵۔ المیزان ج ۱۷ ص ۱۳۰۔ سورہ صافات کی آیات کے ذیل میں۔

۶۔ تفسیر طنطاوی، ج ۸ ص ۱۱۔

۷۔ تفسیر طنطاوی، ج ۱۸ ص ۱۰۔

۸۔ تفسیر قرآن بر فراز اعصار۔ مولفہ ع نوافل صفحہ ۲۵۸۔

نتیجہ بحث

ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں مباحث بہت طویل ہو گئے ہیں اب مکمل نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ہمیں چند نکات کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔

۱۔ لفظ ”سما“ (آسمان) بہت سی آیات قرآن میں ایسی مادی آسمان کے معنی میں مثلاً سورہ اعراف کی آیہ ۴۰ میں ہے:- ان الذین کذبوا بآیاتنا و استکبروا و اعنھا لا تفتح لهم ابواب السماء وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور ان کے سامنے تکبر اختیار کیا ہے آسمان کے دروازے ان کے رخ پر نہیں کھلیں گے۔

ہو سکتا ہے یہاں آسمان قرب خدا کے لئے کنایہ ہو جیسا کہ سورہ فاطر کی آیہ ۱۰ میں ہے۔

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾

پاکیزہ باتیں اس کی طرف اوپر جاتی ہیں اور وہ عمل صالح کو بلند کرتا ہے۔

واضح ہے کہ اعمال صالح اور پاکیزہ باتیں کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو اس آسمان کی طرف اوپر جائیں بلکہ ان کی پیش رفت مقام قرب خدا کی طرف ہوتی ہے اور وہ روحانی عظمت و رفعت حاصل کرتے ہیں۔

اصولی طور پر آیات قرآن کے بارے میں ”انزل“ اور ”نزل“ کی تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ مقام قدس پروردگار سے قلب پیغمبر پر نزول مراد ہے۔

سورہ اجراہیم کی آیہ ۲۴ میں ہے:- ألم ترا کیف ضرب الله مثلاً کلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت فرعها فی السماء

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے اچھی بات کی مثال پیش کی ہے کہ گویا ایک پاکیزہ درخت ہے اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی ٹہنیاں آسمان میں ہیں۔

اس کی تفسیر میں ہم نے پڑھا ہے کہ یہ پاکیزہ درخت جسے خدا نے مثال کے طور پر بیان کیا ہے اس کی جڑ پیغمبر ﷺ ہیں۔ اور علی (علیہ السلام) اس کی جڑ اور شاخ (وہی شاخ کہ جو آسمان تک پہنچی ہوئی ہے) اور دیگر آئمہ اس کی کچھ چھوٹی

شاخیں ہیں^(۱)

ایک حدیث میں ہے: کَذَلِكَ الْكَافِرُونَ لَا تَصْعَدُ أَعْمَالُهُمُ إِلَى السَّمَاءِ

اسی طرح کفار کہ جن کے اعمال آسمان کی طرف اوپر نہیں جاتے۔

واضح ہے کہ اسی احادیث میں آسمان اس حسی آسمان کی طرف اشارہ نہیں ہے یہاں سے ہم نتیجہ نکال تے ہیں کہ آسمان مادی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے اور معنوی مفہوم میں بھی۔

۲۔ نجوم (ستارے) بھی ایک مادی مفہوم رکھتے ہیں کہ جو یہی ستارے ہیں جو آسمان میں نظر آتے ہیں اور ایک لفظ کا معنوی مفہوم ہے کہ جو علماء اور بڑی شخصیت کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی معاشروں کو روشنی بخشتے ہیں اور جیسے لوگ ستاروں کے ذریعے تاریک راتوں میں بیابانوں میں اور سمندوں میں اپنا راستہ ڈھونڈتے ہیں، انسانی معاشروں میں عام لوگ بھی زندگی اور سعادت کی راہ علماء آگاہ اور صاحب ایمان رہبروں کی مدد سے پاتے ہیں۔

مشہور حدیث جو پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل ہوئی ہے:۔ مثل اصحابی فیکم کمثل النجوم بایہا اخذ اہتدی میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کی اقتداء ہو جائے باعث ہدایت ہے^(۲)

سورہ انعام آیت اس طرح ہے: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي الظُّلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اور وہ ذات کہ جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تاکہ خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں ان کے ذریعے تمہاری ہدایت ہو

تفسیر علی بن ابراہیم میں اس آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ امام (علیہ السلام) فرمایا: النجوم آل محمد ستارے سے مراد خاندان پیغمبر ہے۔^(۳)

۳۔ بحث آیات کی تفسیر میں وارد ہونے والی متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی طرف شیاطین کے صعود کی ممانعت اور ستاروں کے ذریعے ان کا ہانکا جانا پیغمبر اکرم کی ولادت کے وقت سے ہوا اور بعض روایات سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہونے کے وقت سے شیاطین ایک حد تک ممنوع ہوئے اور پیغمبر کی ولادت کے بعد مکمل طور پر ممنوع ہو گئے^(۴)

ان باتوں سے جو ہم نے بیان کی ہیں یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ”سما“ کا یہاں معنوی مفہوم ہے اور یہ حق، ایمان اور روحانیت کے آسمان کی طرف اشارہ ہے اور ہر وقت شیطانوں کی کوشش ہے کہ وہ اس چار دیواری میں داخل ہونے کے لئے راہ پالیں اور سچے مومنین اور حامیان حق کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسوں کے ذریعے نفوذ پیدا کر لیں

لیکن مراد ان الہی اور راہبران راہ حق انبیاء و آئمہ سے لے کر مجتہد علماء تک اپنے علم و تقویٰ کی طاقتور موجوں کے ساتھ ان پر حملہ کرتے ہیں اور انہیں اس آسمان سے قریب ہونے سے ہانکتے ہیں۔

اسی مقام پر حضرت مسیح کے تولد اور اس سے بالآخر حضرت محمد ﷺ کے تولد اور شیطان کے دھتکارنے کے درمیان ربط معلوم کیا جاسکتا ہے۔

نیز یہیں پر آسمان کی طرف صعود اور اسرار سے آگاہی کے درمیان ارتباط معلوم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس مادی آسمان میں کوئی خاص خبریں نہیں ہیں سوائے خلقت کی عجیب و غریب چیزوں کے جو روئے زمین سے بھی قابل مطالعہ ہیں۔ نیز آج کی دنیا میں یہ مسئلہ یقینی ہو چکا ہے کہ اس بیکراں فضا میں پھیلے ہوئے آسمانی کمراٹ میں سے بعض مردہ ہیں اور بعض زندہ ہیں اور ان کے ساکنان بھی ہیں لیکن شاید ان کی زندگی ہم سے بہت زیادہ مختلف ہو۔

یہ موضوع بھی بہت قابل ملاحظہ ہے کہ شہاب صرف زمین کی فضا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اطراف زمین کی ہوا سے پتھر کے ٹکڑے اٹھتے ہیں اور شعلہ ور ہوتے ہیں انہی سے شہاب پیدا ہوتے ہیں ورنہ زمین کی فضا سے باہر کوئی شہاب نہیں ہوتا البتہ زمینی فضا سے باہر کچھ پتھر سرگرداں ہیں لیکن انہیں شہاب نہیں کیا جاتا لیکن جب وہ زمینی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو گرم ہو کر شعلہ ور ہو جاتے ہیں اور انسان کی نظروں سے سامنے آگ کی ایک لکیر کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں یو لگتا ہے کہ جیسے یہ حرکت کرتے ہوئے ستارے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آج کے انسان نے کئی مرتبہ زمین کی فضا سے باہر کی طرف عبور کیا ہے اور اس سے بہت بلند یہاں تک کہ چاند تک پہنچا ہے (توجہ رہے کہ زمین کی فضا ایک سو سے لیکر دو سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے جبکہ چاند ہم سے تیس لاکھ کلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر ہے)۔

لہذا اگر مراد یہی مادی شہاب اور مادی آسمان ہو تو یہ مان لینا چاہئیے کہ یہ علاقہ انسانی سائندانوں پر ظاہر ہو چکا ہے اور اس میں کوئی اسرار کی بات نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ بہت سے قرائن و شواہد جو ہم نے ذکر کئے ہیں، سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے مراد حق و حقیقت کا آسمان ہے، اور شیاطین وہی وسوسہ پیدا کرنے والے ہیں کہ جو کوشش کرتے ہیں کہ اس آسمان تک رسائی حاصل کر سکیں اور مخفی طور پر کان لگا کر باتیں سنیں اور لوگوں کو گمراہ کریں۔ ستارے اور شہاب یعنی راہبران الہی اور علماء اپنے قلم کی طاقتور لہروں اور موجوں سے انہیں پیچھے کی طرف ہانکتے ہیں اور دھتکارتے دیتے ہیں۔

لیکن قرآن بحر بیکراں ہے اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے علماء ان آیات کے سلسلے میں نئے حقائق تک دسترس حاصل کر لیں کہ آج جن تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

۱۔ تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۱۰۔

۲۔ سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۹۔ یہ روایت سنی روایات سے ملتی جلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق اور عموم قابل عمل نہیں ہے کیونکہ صحابہ میں ہر قسم کے لوگ حتیٰ کہ منافقین بھی داخل ہیں اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے یا تو سلما و ابوذر جیسے خاص اصحاب مراد ہیں یا اصحاب کساء اور اہل بیت مراد ہیں ہمارے اس نظریہ کی تائید سورہ انعام کی آیہ ۹۷ کے ذیل میں آنے والی مذکورہ بالا روایت کی بھی کرتی ہے۔

یہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ نور الثقلین جلد ۱ ص ۷۵۰۔

۴۔ نور الثقلین جلد ۳، ص ۵ تفسیر قرطبی ج ۵ ص ۳۶۲۶۔

آیات ۱۹، ۲۰، ۲۱

۱۹۔ ﴿وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ﴾۔

۲۰۔ ﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ﴾۔

۲۱۔ ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنْزِلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُومٍ﴾۔

ترجمہ

۱۹۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں ثابت پہاڑ ڈالے اور تمام موزوں نباتات میں سے اس میں اگایا۔
۲۰۔ اور ہم نے تمہارے لئے طرح طرح کے وسائل زندگی فراہم کئے اور اسی طرح ان کے لئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دے سکتے۔

۲۱۔ تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم معین انداز سے سوا اسے نازل نہیں کرتے۔

تفسیر

ہر چیز کا خزانہ ہمارے پاس ہے:

یہاں آیات آفرینش ایک حصہ اور زمین میں عظمت خدا کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں تاکہ گذشتہ بحث تکمیل کو پہنچے۔
پہلے بات زمین سے شروع کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہوتا ہے: ہم نے زمین کو پھیلایا ﴿وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا﴾۔

”مد“ دراصل وسعت دینے اور پھیلانے کے معنی میں ہے اور احتمال قوی یہ ہے کہ یہاں زمین کی خشکیوں کے ذریعے سے باہر نکلنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدا میں کرہ زمین کی ساری سطح سیلابی بارشوں کے زیر اثر پانی کے نیچے ڈوبی ہوئی تھی ساہا سال اسی حال میں گذر گئے۔ سیلابی بارشیں کم ہوئیں، پانی زمین کے گڑھوں میں جا گریں ہوا۔ آہستہ آہستہ خشکیاں پانی کے نیچے سے نمودار ہونے لگیں۔ یہی وہ چیز ہے جو روایات اسلامی میں ”دحو الارض“ کے نام سے مشہور ہے۔ پہاڑوں کی خلقت چونکہ ان کے زیادہ فوائد کی وجہ سے توحید کی ایک نشانی ہے، اسی لئے ان کا ذکر تفرقے ہوئے مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین میں مستقر اور ثابت پہاڑ ڈالے ہیں ﴿وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ﴾۔

پہاڑوں کے لئے ”اللقاء“ (پھینکنا) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ پہاڑ زمین کی وہ سلوٹیں ہیں جو زمین کے چمڑے کے تدریجاً سرد ہونے کی بناء پر یا آتش فشانی مواد کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ ہوئے ہیں، ہو سکتا ہے یہ تعبیر

اس لہذا ہو کہ ”القاء“ ”ایجاد“ کے معنی میں بھی آیا ہے، ہمارے روزمرہ زبان میں کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں زمین کے لئے پلان بنایا ہے اور اس میں چند کمرے ڈالے ہیں یعنی بنائے اور ایجاد کئے ہیں۔

بہر حال یہ پہاڑ علاوہ اس کے کہ جڑ سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں اور روزمرہ کی طرح زمین کے اندرونی خلفشار اور دباؤ کے مقابلے میں لرزتے نہیں، طوفانوں کی طاقت کی بھی درہم برہم کر دیتے ہیں اور ہوا کی رفتاری کو پوری طرح کنٹرول کرتے ہیں یہ پہاڑ، پانی کے ذخیروں کے لئے بہت اچھی جگہ ہیں جو یہاں برف کی صورت میں یا چشموں کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔

خصوصاً لفظ ”رواسی“ استعمال کیا گیا ہے کہ جو ”راسیہ“ جمع ہے اور یہ ثابت اور مضبوط کے معنی میں ہے جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اس کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ خود بھی ثابت اور مستقر ہیں اور زمین کے نازل چمڑے اور انسانی زندگی کے ثبات و قرار کا باعث ہیں۔

انسانی زندگی اور تمام جانداروں کے زندگی کے لئے، بہترین عامل یعنی نباتات کی طرف بات کا رخ رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین پر موزوں نباتات میں سے اگایا ہے ﴿وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ﴾۔
 ”موزون“ کس قدر خوبصورت اور سادہ تعبیر ہے۔ یہ لفظ اصل ”وزن“ کے مادہ سے ہر چیز کے اندر شناسائی کے معنی میں لیا گیا ہے۔^(۱)

یہ دقیق حساب، عجیب نظم و ضبط اور نباتات کے تمام اجزاء کے متناسب اندازوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں طرف اشارہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلکہ ہر ایک کا ہر جز، شاخ، پتہ، پھول، پھل، اور گٹھلی سب کچھ معین حساب کتاب کا حامل ہے،۔

کرہ زمین میں شاید لاکھوں قسم کے نباتات ہیں کہ جو مختلف خواص اور طرح طرح کے آثار رکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک اس کی پہچان کا دریچہ ہے ان میں سے ہر ایک کا پتہ پتہ معرفتِ کردگار کی ایک کتاب ہے۔

اس جملہ کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مختلف معدنیات کا پہاڑوں میں پیدا ہونا ہے کیونکہ عرب لفظ ”انبات“ معدن اور کان کے بارے میں استعمال کرتے ہیں۔

بعض روایات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا:

مراد یہ ہے کہ خدا پہاڑوں میں سونے، چاندی، جواہرات اور باقی دھاتوں کی کانیں اور معدنیات پیدا کی ہیں۔^(۲) یہ احتمال بھی ہے کہ ”انبات“ (اگانا) یہاں وسیع معنی میں ہو کہ جس میں تمام مخلوقات جنہیں خدا نے پیدا کیا ہے، شامل ہوں۔ سورہ نوح میں اس عظیم پیغمبر کی زبانی ہے کہ آپ لوگوں سے کہتے تھے:

﴿وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا﴾ (نوح - ۱۷)

اور خدا نے تمہیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا ہے۔

بہر حال کوئی مانع نہیں کہ آیت وسیع مفہوم رکھتی ہو اور اس میں انسان، نباتات اور معدنیات وغیرہ سبھی شامل ہوں۔

انسان کے وسائل حیات چونکہ نباتات اور معدنیات میں منحصر نہیں ہیں لہذا بعد والی آیات میں ان تمام نعمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین میں تمہارے لئے انواع و اقسام کے وسائل زندگی بنائے ہیں ﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ﴾۔

نہ صرف تمہارے لئے بلکہ تمام زندہ موجودات کے لئے اور وہ کہ جنہیں تم روزی نہیں دیتے اور تمہاری دسترس سے باہر ہیں ﴿وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ﴾۔

جی ہاں! ہم نے ان سب کو ان کی ضروریات فراہم کی ہیں۔

”معايش“ ”معيشة“ کی جمع ہے اور یہ وسیلہ ہیں، ذریعہ، انسانی زندگی کی ضروریات کو کہتے ہیں کہ بعض اوقات جن کے پیچھے خود انسان جاتا ہے اور بعض اوقات وہ اس کے پیچھے آتی ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے لفظ ”معايش“ کی تفسیر صرف زراعت، نباتات اور کھانے پینے کی چیزوں سے کی ہے لیکن واضح ہے کہ مفہوم لغت پوری طرح وسیع ہے اور تمام وسائل حیات پر محیط ہے۔

مفسرین نے ”من لستم له برازقین“ کی دو تفسیریں ہیں۔

پہلی تفسیر یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ انسانوں کو متوجہ کرے کہ ہم نے بھی تمہارے لئے زمین میں وسیلہ زندگی قرار دیا ہے اور زندہ موجودات بھی تمہارے اختیار میں دئے ہیں (مثلاً چوپائے) کہ جنہیں تمام روزی دینے کی توانائی نہیں رکھتے۔ خدا انہیں روزی دیتا ہے اگرچہ یہ کام تمہارے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔^(۲)

۱۔ تفسیر اول کی بناء پر ”من“ (من لستم برازقین) کا عطف ”لکم“ کی ضمیر پر ہوتا ہے اور دوسری تفسیر کی بناء پر ”معاش“ پر۔ بعض نے پہلی تفسیر پر اعتراض کیا ہے کہ مجبور کا اسم ظاہر ضمیر مجرور پر عطف نہیں ہوتا مگر یہ کہ حرف جر کی تکرار ہو یعنی یہاں ضروری تھا کہ لام ”من“ کے سر پر بھی آتی۔

دوسرا یہ ”من“ کا اطلاق انسان کے علاوہ دیگر زندہ پر کس طرح ہوا ہے۔ لیکن یہ دونوں اعتراض صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ عبارات عرب میں حرف جر کی تکرار نہ ہونے پر شواہد موجود ہیں اور اسی طرح غیر ذوی العقول موجودات ”من“ کے اطلاق کی بھی مثالیں ہیں، دوسری تفسیر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ لفظ ”معاش“ اتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ تمام وسائل زندگی یہاں تک کہ چوپائے وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ لہذا ”معاش“ کے ذکر کے بعد اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ اسی بناء پر ہم نے پہلی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

لیکن ہماری نظر میں پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور اس کی ادبی دلیل بھی ہم نے فٹ نوٹ میں بیان کر دی ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں موجود ایک حدیث میں ہم نے اس تفسیر کی تائید میں پاتے ہیں جہاں ”من لستم برازقین“ کے بارے میں ہے لکل ضرب من الحيوان قدرنا شيئاً مقدراً

تمام جانوروں کے لئے ہم نے کوئی نہ کوئی چیز مقرر کی ہے۔^(۳)

زیر بحث آخری آیت در حقیقت ایک سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ جو بہت سے لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ خدا اس قدر اوراق و نعمات انسانوں کے قبضے میں کیوں نہیں دیتا ہے کہ وہ ہر قسم کی سعی و کوشش سے بے نیاز ہو جاتے۔

رشاد ہوتا ہے: تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم ان کی معین مقدار کے علاوہ نازل نہیں کرتے ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ﴾۔

لہذا ایسا نہیں کہ ہماری قدرت محدود ہے اور اپنی نعمات کے ختم ہونے پر ہم وحشت زدہ ہیں بلکہ ہر چیز کا منبع، مخزن اور سرچشمہ ہمارے پاس ہے اور ہم ہر زمانے میں ہر مقدار ایجاد کرنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن اس عالم کی تمام چیزیں کسی حساب کے ماتحت ہیں اور اوراق بھی خدا کی طرف سے بمقدار حساب نازل ہوتی ہیں ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:-

ولو بسط الله الرزق لعباده لبغوا في الارض ولكن يفرج الله الرزق لعلهم يقرءون (شوری ۲۷)

اگر خدا اپنے بندوں کے لئے بے حساب روزی پھیلا دیتا تو وہ جاہد حق سے منحرف ہو جاتے، لیکن جتنی مقدار وہ چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔ (شوریٰ - ۲۷)

پوری طرح واضح ہے کہ سعی و کوشش، انسانی زندگی سے سستی، کاہلی اور دل مردگی دور کرنے کے علاوہ حرکت و نشاط پیدا کرتی ہے اور یہ انسانوں کی صحیح و سالم فکری و جسمانی مشغولیت کے لئے بہت ہی اچھا وسیلہ ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام چیزیں بے حساب انسان کے اختیار میں ہوتیں۔ اور نہ معلوم پھر دنیا کا کیا منظر ہوتا۔

کچھ پیکار انسان سیر شکم کے ساتھ بغیر کسی کنٹرول کے شور و غل مچاتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان جہان کے لوگ اہل جنت کی طرح نیک و بد صفات کے حامل ہیں انہیں اس جہان کی بھٹی سے کندن بن کے نکالنا چاہیئے۔ سعی و کوشش اور صحیح حرکت و اشتغال سے بہتر کندن بنانے کے لئے کون سی چیز ہو سکتی ہے لہذا جس طرح فقر و فاقہ اور احتیاج و نیازی بھی فساد اور تباہی کا باعث ہے۔

۱۔ ”الوزن معرفة قدر الشيء“ (مفردات راغب)

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶ (توجہ رہے کہ اس تفسیر کے مطابق ”فیہا“ کی ضمیر پہاڑوں کی طرف لوٹے گی)۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۹۔

چند اہم نکات

۱۔ خدا کے خزانے کیا ہیں؟

قرآن کریم کی متعدد آیات میں ہے کہ خدا خزانے رکھتا ہے۔ آسمان وزمین کے خزانے خدا کی ملکیت ہیں یا ہر چیز کے خزانے اس کے پاس ہیں۔

”خزائن“ جمع ہے ”خزانہ“ کی جنس کا معنی ہے وہ جگہ جہاں انسان اپنے اموال حفاظت کے لئے جمع کرتا ہے یہ اصل میں مادہ ”خزن“ (بروزن ”وزن“) سے کسی چیز کی حفظ و نگہداری کے معنی میں ہے واضح ہے کہ جمع آوری اور ذخیرہ کرنے اور کسی چیز کو محفوظ کرنے کے لئے وہی شخص اقدام کرتا ہے جس کی قدرت محدود ہو اور جو ہر زمانے میں کچھ چاہے فراہم نہ کر سکے لہذا وہ قدرت کے موقع کے لئے ذخیرہ کر لیتا ہے اور خزانہ میں جمع کر لیتا ہے۔

لیکن کیا یہ امور خدا کے بارے میں تصور کئے جاسکتے ہیں؟ یقیناً نہیں یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع بیان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور راغب نے مفردات میں ”خزائن اللہ“ کی ”مقدرات الہی“ کے ساتھ تفسیر کی ہے یعنی تمام چیزیں قدرت خدا کے خزانے میں جمع ہیں اس میں سے جتنی مقدار وہ ضروری اور قرین مصلحت سمجھتا ہے ایجاد کرتا ہے۔

جبکہ بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ ”خزائن اللہ“ سے مراد امور کا وہ مجموعہ ہے کہ جو عالم ہستی اور جہان مادہ میں موجود ہیں لیکن اس عالم کی اعلیٰ اور مخصوص موجودات محدود مقدار میں پیدا ہوتی ہے بغیر اس کے امکان وجود انہی میں منحصر ہو۔ (المیزان جلد ۱۲، ص ۱۴۸)۔

یہ تفسیر اگرچہ اصولی طور پر قابل قبول مسئلہ ہے لیکن ”عندنا“ (ہمارے پاس) کی تعبیر پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ بہر حال خزائن اللہ جیسی تعبیرات کا انتخاب عام مفہوم میں خدا کے بارے میں صداق نہیں آتا۔ لیکن خدا چاہتا ہے کہ خود لوگوں کی زبان میں ان سے بات کرے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ضمنی طور پر یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کی طرف سے ”خزائن“ کے مفہوم کو پانی اور بارش میں معین و محدود کرنے پر نہ صرف کوئی دلیل، موجود نہیں ہے بلکہ یہ امر مفہوم آیت کی وسعت کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتا۔

۲۔ نزول مقامی اور نزول مکانی

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے نزول ہمیشہ فزول مکانی یعنی اوپر سے نیچے آنے کے معنی میں نہیں ہوتا بلکہ بلکہ کبھی نزول مقامی کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جس وقت کوئی بڑی نعمت کسی بڑے شخص کی طرف سے زیر دست لوگوں کو ملے تو اسے نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی بناء پر قرآن مجید میں یہ لفظ خدا کی نعمتوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے چاہے وہ آسمان سے نازل ہوں مثلاً بارش یا زمین پر پرورش پاتی ہوں مثلاً حیوانات، جیسا کہ سورہ زمر کی آیت ۶ میں ہے: **وانزل لکم من الانعام ثمانية ازواج** (اور اس نے تمہارے لئے آٹھ قسم کے چوپائے نازل کئے۔ نیز لوہے کے بارے سورہ حدید کی آیہ ۲۵ میں ہے۔ ﴿وانزل الحديد﴾

ہم نے لوہا نازل کیا۔

اسی طرح دیگر مثالیں بھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ”نزول“ اور ”انزال“ یہاں وجود، ایجاد اور خلقت کے معنی میں ہے البتہ چونکہ خدا کی طرف سے بندوں کے لئے ہے لہذا اس قسم کے تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

آیات ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵

۲۲۔ ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاحِجَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ﴾۔

۲۳۔ ﴿وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ﴾۔

۲۴۔ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ﴾۔

۲۵۔ ﴿وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾۔

ترجمہ

- ۲۲۔ ہم نے ہوائیں (بادلوں کے ایک دوسرے سے ملنے، ان کے بار آور ہونے اور) تلقیح کے لئے بھیجیں، اور آسمان سے ہم نے پانی نازل کیا اور اس سے سیراب کیا جبکہ تم ان کے حفاظت اور نگہداری کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔
- ۲۳۔ اور ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور ہم (سارے عالم کے) وارث ہیں۔
- ۲۴۔ ہم تمہارے متقدمین کو بھی جانتے تھے اور متاخرین کو بھی۔
- ۲۵۔ تیرا پروردگار یقینی طور پر (قیامت میں) سب کو جمع اور محشور کرے گا کیونکہ وہ حکیم اور دانہ ہے۔

تفسیر

ہوا اور بارش

گذشتہ آیات میں بعض اسرار آفرینش کا تذکرہ تھا اور خدا کی نعمتوں کا بیان تھا۔ مثلاً زمین، پہاڑ، نباتات اور وسائل زندگی کی خلقت۔

زیر نظر پہلی آیت میں ہواؤں کے چلنے اور بارشوں کے غزول میں ان اسرار آفرینش کے نقشِ موثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ہم نے ہوائیں بھیجیں جبکہ وہ بار آور کرنے والی ہیں (بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہیں اور انھیں بار آور کرتی ہیں) ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاحِجَ﴾۔

اور ان کے پیچھے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا ﴿فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾۔ اور اس ذریعہ سے ہم نے سب کو سیراب کیا ﴿فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ﴾۔ حالانکہ تم اس کی حفاظت و نگہداری کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ ﴿وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ﴾۔

”لواح“ ”لوح“ کی جمع ہے جس کا معنی بار آور کرنے والا۔ یہاں ان ہواؤں کی طرف اشارہ ہے جو بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں اور باہم پیوند کرتی ہیں اور انھیں بارش کے لئے تیار کرتی ہیں۔

بعض معاصرین اس آیت کو ہواؤں کے ذریعے نباتات کی تلقیح اور گرد افشانی کے لئے اشارہ قرار دیا ہے اور اس طرح ایک سائنسی مسئلے کے حوالے سے اس کی تفسیر کی ہے کہ جو نزول قرآن کے زمانے میں انسانی معاشرے میں محل توجہ نہ تھا اس طرح انہوں نے اسے قرآن کے اعجاز علمی کے دلائل میں سے شمار کیا ہے لیکن اس حقیقت کو قبول کرنے باوجود کہ ہواؤں کا چلنا و نباتات کے نطفے کو مادہ نباتات تک پہنچانے اور انھیں بار آور کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے، مندرجہ بالا آیت کو اس طرف اشارہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس لفظ کے فوراً بعد آسمان سے نزول باران کا ذکر (وہ بھی فاء تفریع کے ساتھ) آیا ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ ہواؤں کا تلقیح کرنا بارش برسنے کی تمہید ہے۔

بہر حال مذکورہ بالا تعبیر بادلوں اور اس سے بارش پیدا ہونے کے لئے خوب صورت ترین تعبیر ہے ہو سکتا ہے کہ کہا جائے کہ بادلوں کو ماں باپ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو ہواؤں مدد سے ملاپ کرتے ہیں اور بار آور ہوتے ہیں، اور اپنی اولاد یعنی بارش کے دانوں کو زمین پر رکھتے ہیں۔

﴿وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِحَازِنِينَ﴾ (تم ان پانیوں کی حفاظت اور ذخیرہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے) ممکن ہے یہ جملہ آب باران کو نزول سے پہلے ذخیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہو یعنی ان بادلوں پر تمہارا بس نہیں کہ جو بارش کے اصلی منبع ہیں، نیز ممکن ہے نزول باران کے بعد ذخیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہو یعنی تم میں یہ طاقت نہیں کہ فزول باران کے بعد زیادہ مقدار میں پانی جمع اور محفوظ رکھ سکو، یہ خدا ہے جو اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں منجمد کر کے یا زمین کی گہرائیوں میں بھیج کر محفوظ کر لیتا ہے جو بعد میں چشموں، ندیوں اور کنوؤں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مباحث توحید کے بعد معاد و قیامت اور اس کے مقدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں اور ہم ہیں جو مارتے ہیں ﴿وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ﴾۔

یہ حیات و موت کے مسئلے کی طرف اشارہ ہے جو در حقیقت اہم ترین اور قطعی ترین مسائل میں سے ہے یہ مسئلہ معاد کی بحث کے لئے تمہید بھی بن سکتا ہے اور توحید کی بحث کا نقطہ تکمیل بھی۔ کیونکہ ظہور حیات عالم ہستی کے عجیب ترین مسائل میں سے ہے اور اس مظہر کی تحقیق اور اس کا مطالعہ ہمیں خالق حیات سے اچھی طرح آشنا کر سکتا ہے۔ اصولی طور پر موت اور حیات کا نظام بے پایاں قدرت و علم کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسری طرف موت و حیات کا وجود خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس عالم موجودات خود سے کچھ نہیں رکھتے اور جو کچھ رکھتے ہیں وہ کسی اور کی طرف ہے اور آخر کار ان سب کا واٹ اللہ ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم ان کے گذشتگان اور آنے والوں کو جانتے ہیں ﴿وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ﴾۔

لہذا وہ خود بھی اور اس کے اعمال بھی ہمارے علم کے سامنے واضح اور آشکار ہیں اور اس لحاظ سے معاد و قیامت اور ان کے اعمال کا حساب و کتاب پوری طرح ہمارے سامنے ہے۔

اس بناء اس گفتگو کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے: یقیناً تیرا پروردگار ان سب کو قیامت میں ایک نئی زندگی کی طرف پلٹائے گا اور انہیں جمع و محصور کرے گا ﴿وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ﴾۔ کیونکہ وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی ﴿إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾۔

اس کی ”حکمت“ کا تقاضا ہے کہ موت تمام چیزوں کا اختتام نہ بنے کیونکہ اگر زندگی اس جہاں کی انہیں چاروں کی حیات میں منحصر ہو تو آفرینش جہاں لغو اور بے معنی ہو جائے اور خداوند کلیم سے بعید ہے کہ اس کی خلقت ایسی بے نتیجہ ہو لیکن اگر یہ آفرینش ایک لامتناہی حیات اور دائمی سیر و ملوک کی تیاری کے لئے مقدمہ ہے ہوگی یا دو لفظوں میں ابدی اور جاوداں زندگی کے لئے تمہید ہو تو ایک مکمل مفہوم و معنی کی حامل ہوگی اور اس کی حکمت سے ہم آہنگ ہوگی اس لئے کہ کلیم کوئی کام بے حساب و کتاب نہیں کرتا اور اس کا علیم ہونا سبب بنتا ہے کہ معاد و حشر کے معاملے میں کوئی مشکل پیدا نہ ہو وہ ذرہ خالی جو کسی بھی انسان کا کسی گوشے میں جا پڑا ہے وہ اسے جمع کرے گا اور اسے نئی حیات بخشے گا۔ دوسری طرف سب کے اعمال کا دفتر اس جہان طبیعت کے دلیں بھی ثبت ہے اور انسانوں کے قلب و روح میں بھی اور وہ ان سب سے آگاہ ہے۔

اس بناء پر خدا کا علیم و حکیم ہونا حشر و نش او معاد و قیامت پر چچی تلی اور پر مغز دلیل شمار ہوتا ہے۔

متقدمین اور متاخرین کون ہیں؟

”﴿لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ﴾“ اس آیت کے بارے میں مفسرین نے بہت سے

احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

مرحوم طبرسی نے مجمع لابیان میں چھ تفسیریں بیان کی ہیں۔

قرطبی نے آٹھ احتمال ذکر کئے ہیں

ابوالفتح رازی نے تقریباً دس احتمال پیش کئے ہیں۔

لیکن ان سب کا گہرا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک ہیں تفسیر میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ :-

لفظ ”متقدین“ اور ”متاخرین“ وسیع معنی رکھتے ہیں، ان میں زمانے کے لحاظ سے پہلے اور بعد میں آنے والے اعمال خیر میں آگے بڑھ جانے والے، جہاد اور دشمنانِ حق سے مبارزہ کرنے والے یہاں تک کہ نماز جماعت کی صفوں میں آگے اور پیچھے رہنے والے اور اسی قسم کے دیگر لوگ شامل ہیں۔

اس جامع معنی کی طرف توجہ رکھتے ہوئے وہ تمام احتمالات جمع کر کے قبول کئے جاسکتے ہیں اور اس آیت میں تقدم و تاخر کے بارے میں ذکر کئے گئے ہیں

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم نماز نے جماعت کی پہلی صف میں شرکت کی بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔

آپ نے فرمایا :- خدا اور اس کے فرشتے ان صفوں میں پیش قدمی کرنے والوں پر درود بھیجتے ہیں“

اس تاکید کے بعد لوگوں نے پہلی صف میں شرکت کے لئے بہت ہجوم کیا۔ ایک قبیلہ ”بنی عذرہ“ تھا ان لوگوں کے گھر مسجد سے دور تھے انہوں نے کہا کہ ہم اپنے گھریں سے مسجد نبوی کے قریب ہی گھر خرید لیتے ہیں تاکہ صف اول میں پہنچ سکیں۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ خدا تمہاری نیتوں کو جانتا ہے اور یہاں تک کہ تم اگر آخری صف

میں بھی کھڑے ہوئے تو بھی تمہاری نیت چونکہ صف میں کھڑا ہونے کی ہے تمہیں اپنی نیت کی جزا ملے گی۔^(۱)

مسلم ہے کہ اس شانِ نزول کا محدود ہونا آیت کے وسیع مفہوم کے محدود ہونے کا ہرگز سبب نہیں ہو سکتا۔

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

- ٢٦- ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾
- ٢٧- ﴿وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ﴾ -
- ٢٨- ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ -
- ٢٩- ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾ -
- ٣٠- ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾ -
- ٣١- ﴿إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى أَنْ يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ﴾ -
- ٣٢- ﴿قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ﴾ -
- ٣٣- ﴿قَالَ لَمْ أَكُنْ لَأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ -
- ٣٤- ﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ﴾ -
- ٣٥- ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ﴾ -
- ٣٦- ﴿قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾ -
- ٣٧- ﴿قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ﴾ -
- ٣٨- ﴿إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ﴾ -
- ٣٩- ﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ -
- ٤٠- ﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ﴾ -
- ٤١- ﴿قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ﴾ -
- ٤٢- ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ﴾ -
- ٤٣- ﴿وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ -
- ٤٤- ﴿هَآ سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ﴾ -

۲۶۔ ہم نے انسان کو خشک شدہ مٹی سے پیدا کیا کہ جو بدبودار (سیاہ رنگ) کیچڑ سے لی گئی تھی۔

۲۷۔ اور اس سے پہلے ہم جن گرم اور جلا دینے والی آگ سے خلق کیا تھا۔

۲۸۔ اور یاد کرو وہ وقت جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں بشر کو خشک شدہ مٹی جو بدبودار کیچڑ سے لی گئی ہے، سے خلق کروں گا۔

۲۹۔ جب ہم اس کام کو انجام دے چکے اور میں اپنی (ایک شائستہ اور عظیم) روح پھونکیں تو سب کچھ سب سے سجدہ کرنا۔

۳۰۔ تمام فرشتوں سے بلا استثناء سجدہ کیا۔

۳۱۔ سوائے ابلیس کے کہ جس نے سجدہ کرنے والوں میں سے ہونے سے انکار کر دیا۔

۳۲۔ (اللہ نے) فرمایا اے ابلیس! تو ساجدین کے ساتھ کیوں شامل نہیں ہوا؟

۳۳۔ اس نے کہا: میں ہرگز ایسے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک شدہ مٹی سے بنایا ہے۔

۳۴۔ فرمایا: ان (فرشتوں) کی صف سے نکل جا کہ تو ہماری درگاہ سے راندہ گیا ہے۔

۳۵۔ اور تجھ پر روز قیامت تک لعنت (اور رحمت حق سے دوری) ہوگی۔

۳۶۔ اس نے کہا: پروردگار! مجھے روز قیامت تک مہلت دے (اور زندہ رکھ)۔

۳۷۔ فرمایا: تو مہلت حاصل کرنے والوں میں سے ہے۔

۳۸۔ (لیکن روز قیامت تک نہیں بلکہ) معین دن اور وقت تک۔

۳۹۔ اس نے کہا: پروردگار! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں مادی نعمتوں کو زمین میں ان کی نگاہ میں مزین کروں گا اور

سب کو گمراہ کروں گا۔

۴۰۔ مگر تیرے مخلص بندے۔

۴۱۔ (اللہ نے) فرمایا: یہ میری مستقیم اور سیدھی راہ ہے (ہمیشہ کی سنت ہے)۔

۴۲۔ (کہ) تو میرے بندوں پر تسلط حاصل نہیں کر سکے گا مگر وہ گمراہ جو تیری پیروی کریں گے۔

۴۳۔ اور جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے۔

۴۴۔ اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک معین گروہ تقسیم شدہ ہے۔

تفسیر

خلقتِ انسان

گذشتہ آیات میں مخلوق خدا کے ایک حصے اور نظامِ ہستی کا بیان تھا۔ اسی مناسبت سے ان آیات میں تخلیق کے عظیم شاہکار یعنی انسان کی خلقت کو بیان کیا گیا ہے۔ متعدد پر معنی آیات کے ذریعے اس خلقت کے بہت سے پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔

ہم پہلے تو آیات کی اجمالی تفسیر بیان کرتے ہیں اس کے بعد اہم نکات پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔ ارشاد ہوتا ہے ہم نے انسان کو صلصال سے (یعنی اس مٹی سے جو خشک شدہ ہو اور کسی چیز سے ٹکراتے وقت آواز دیتی ہو) پیدا کیا ہے کہ جو

حَمًا مَّسْنُونٍ (سخت تاریک، متغیر اور بدبودار کیچڑ) سے لی گئی ہے ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَآ مَسْنُونٍ﴾۔

اور اس سے پہلے ”جنوں“ کو ہم نے گرم اور جلانے والی آگ سے پیدا کیا ہے ﴿وَالْجَنَّاتِ خَلْقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ﴾۔

”سموم“ لغت میں جلانے والی ہوا کے معنی میں ہے گویا یہ ہوا انسانی جسم کے تمام سوراخوں سے نفوذ کرتی ہے کیونکہ عرب انسانی جسم کے بہت ہی چھوٹے سوراخوں کو ”مسام“ کہتے ہیں۔ ”سموم“ بھی اسی مناسبت سے ایسی ہوا کو کہا جاتا ہے مادہ ”سم“ (زہر) بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ بدن میں نفوذ کر کے انسان کو قتل کر دیتی ہے یا بیمار کر دیتی ہے۔ جنوں نے ذکر کے بعد قرآن پھر خلقتِ انسان کے موضوع کی طرف لوٹتا ہے۔ فرشتوں سے اللہ تعالیٰ کی خلقتِ انسان کے بارے میں جو پہلی گفتگو ہوئی اسے یوں بیان کیا گیا ہے: یاد کرو وہ وقت جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا، فرمایا: میں بشر کو تاریک رنگ بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک مٹی سے پیدا کروں گا ﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَآ مَسْنُونٍ﴾۔

جب میں اس کی خلقت کو انجام و کمال تک پہنچاؤں اور اور اپنی (ایک شریف پاک اور با عظمت) روح ان میں پھونک دوں تو سب کے سب اسے سجدہ کرنا ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾۔

خلقت انسان تکمیل کو پہنچ گئی اور انسان کے لئے جو جسم و جان مناسب تھا اسے دے دیا گیا اور سب کچھ انجام پا گیا ”تو اس وقت تمام فرشتوں نے بلا استثناء سجدہ کیا ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ﴾۔

وہ تنہا شخص جس نے اس فرمان کی اطاعت نہ کی وہ ”ابلیس“ تھا لہذا مزید فرمایا: سوائے ابلیس کے کہ جس نے ساجدین کے ساتھ ہونے سے انکار کیا ﴿إِلَّا ابْلِيسَ ابْنِي أَنْ يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ﴾۔

اس موقع پر ابلیس سے باز پرس کی گئی اور خدا نے ”اس سے کہا“ اے ابلیس! تو ساجدین میں کیوں شامل نہیں ہے ﴿قَالَ يَا ابْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ﴾۔

ابلیس کو جو غرور اور خود خواہی میں ایسا غرق تھا کہ اس کی عقل و ہوش غائب ہو چکے تھے، پروردگار کی پرستش کے جواب میں بڑی گستاخی سے بولا ”میں ہر گز ایسے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو بدبودار اور کیچڑ سے لی گئی خشک ٹی سے پیدا کیا ہے“ ﴿قَالَ لَمْ أَكُنْ لِأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾۔

نورانی اور چمکنے والی آگ کہاں اور سیاہ او متعفن مٹی کہاں۔ کیا مجھ جیسا ایک اعلیٰ موجود پست تر موجود کے سامنے خضوع کر سکتا ہے، یہ کونسا قانون ہے؟

وہ چونکہ غرور اور خود خواہی کے باعث خلقت و آفرینش کے اسرا بے خبر تھا اور خاک کی برکات کو فراموش کر چکا تھا کہ جو ہر خیر و برکت کا منبع ہے اور اس سے بڑھ کر وہ شریف اور عظیم الہی روح تھی جو آدم میں موجود تھی اور اس نے اسے لائق اعتناء نہ سمجھا۔ اچانک اپنے بلند مقام سے گر پڑا اب وہ اس لائق نہ رہا تھا کہ صفِ ملائکہ میں کھڑا ہو سکے لہذا خدا تعالیٰ نے اسے فوراً فرمایا: یہاں سے ﴿بِهَشْتٍ سَمَاءٍ آسْمَانُونَ﴾ سے یا ملائکہ کی صفوں سے) باہر نکل جا کہ تو راندہ درگاہ ہے ﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ﴾۔

اور جان لے کہ تیرا غرور تیرے کفر کا سبب بن گیا ہے اور اس کفر نے تجھے ہمیشہ کے لئے دھتکارا ہوا کر دیا ہے تجھ پر روز قیامت تک خدا کی لعنت اور رحمتِ خدا سے دوری ہے ﴿وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ﴾۔

ابلیس نے جب اپنے آپ کو بارگاہِ الہی سے دھتکارا ہوا پایا اور احساس کیا کہ انسان اس بد بختی کا سبب بنا ہے تو کینہ کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی اور اس نے اولادِ آدم سے انتقام لینے کی ٹھان لی حالانکہ اصلی مجرم وہ خود تھا نہ کہ آدم اور نہ فرمانِ خدا لیکن غرور اور خود خواہی نے جس میں اس کی ہٹ دھرمی بھی شامل تھی اس حقیقت کو سمجھنے کی

اجازت نہ دی۔ لہذا اس نے عرض کیا پروردگار! اب جب معاملہ ایسا ہے تو مجھے روز قیامت تک مہلت دے دے۔
 ﴿قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ﴾۔

یہ تقاضا اس لئے نہ تھا کہ وہ توبہ کرے، اپنے کئے پر پشیمان ہو یا تلافی کے درپے ہو بلکہ اس لئے تھا کہ اپنی ہٹ دھرمی، عناد، دشمنی اور خیرہ سری کو جاری رکھ سکے۔ خدا نے اس کی خواہش کو قبول کر لیا اور فرمایا ”یقیناً تو مہلت یافتہ افراد میں سے ہے“ ﴿قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ﴾۔ لیکن روز قیامت مخلوق کے مبعوث ہونے تک کئے لئے نہیں بلکہ جیسا کہ تو نے چاہا ہے بلکہ معین وقت اور زمانے کے لئے ﴿إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ﴾۔

اس بارے میں کہ ”یوم الوقت المعلوم“ سے کونسا دن مراد ہے مفسرین نے کئی ایک احتمالات ذکر کئے ہیں: بعض نے کہا کہ اس سے مراد اس جہاں کا اختتام ہے اور ذمہ داری کے دور کا خاتمہ ہے کیونکہ قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم کے مطابق اس کے بعد تمام مخلوق نابود ہو جائے گی اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی، لہذا ابلیس کی درخواست ایک حد تک قبول کی گئی۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ”وقت معلوم“ سے ایک معین زمانہ مراد ہے جسے خدا جانتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اس سے آگاہ نہیں ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ اسے واضح کر دیتا تو ابلیس کو گناہ و سرکشی کی زیادہ تشویق ہوتی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا کہ اس سے مراد یوم قیامت ہے کیونکہ وہ اس دن تک زندہ رہنا چاہتا تھا تاکہ حیات جاوید پائے اور اس کی بات مان لی گئی خصوصاً جبکہ سورہ واقعہ کی آیہ ۵۰ میں ”یوم الوقت المعلوم“ کی تعبیر روز قیامت کے بارے میں بھی آئی ہے لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خدا نے اس کی درخواست کو مکمل طور پر موافقت کی ہوتی جبکہ مندرجہ بالا آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اس کی درخواست کی پوری موافقت نہیں کی گئی ہے اور صرف ”یوم وقت المعلوم“ تک درخواست مانی گئی ہے۔

بہر حال پہلی تفسیر آیت کی روح اور ظاہری مفہوم کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتی ہے اور امام صادق علیہ السلام سے منقول بعض روایات میں بھی اس معنی کی تصریح کی گئی ہے۔^(۱)

اس مقام پر ابلیس نے اپنی باطنی نیت کو آشکار کر دیا، اگرچہ خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی تاہم وہ کہنے لگا: ”پروردگار! اس بناء پر کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (اور اس انسان نے میری بدبختی کا سامان فراہم کیا ہے) میں زمین کی مادی نعمتوں

کو ان کی نگاہ میں دلفریب بناؤں گا اور انسانوں میں مشغول رکھو گا اور آخر کار سب کو گمراہ کر کے رہوں گا ﴿قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَزِيَنَّ هُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا أَغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾ -

لیکن وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کے وسوسے خدا کے مخلص بندوں کے دل ہرگز اثر انداز نہیں ہوں گے اور اس کے جال انھیں نہیں پھانس سکیں گے۔ خلاصہ یہ کہ خالص و مخلص بندے اس قدر طاقت ور ہیں کہ شیطانی زنجیریں توڑ ڈالیں گے۔

لہذا فوراً اپنی بات میں استثناء کرتے ہوئے اس نے کہا: مگر تیرے وہ بندے جو خالص شدہ ہیں ﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ﴾ -

واضح رہے کہ خدا نے شیطان کو گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ ابلیس کی یہ بات شیطنیت آمیز تھی، اصطلاح کے مطابق اپنے آپ کو بری قرار دینے کے لئے اور گمراہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرنے کے لئے اس نے یہ بات کی تھی اور یہ سب ابلیسوں اور شیطانوں کی رسم ہے اولاً وہ اپنے گناہ دوسروں کے سر ڈال دیتے ہیں اور ثانیاً ہر جگہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے برے اعمال کی غلط توجیہ پیش کریں نہ صرف بندگان خدا کے سامنے بلکہ خود خدا کے سامنے بھی کہ جو ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ ”مخلصین“ ”مخلص“ (لام کی فتح کے ساتھ) جیسا کہ ہم سورہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ ”مخلص“ اس شخص کو کہتے جو ایمان و عمل کے اعلیٰ درجہ پر تعلیم و تربیت اور جہاد نفس کے بعد پہنچا۔ جس پر شیطان اور کسی اور کے بھی وسوسوں کا کوئی اثر نہ ہو۔^(۱)

خدا نے شیطان کی تحقیر اور راہِ حق کے متلاشیوں اور طریقِ توحید کے راہیوں کی تقویت کے لئے فرمایا: یہ میری مستقیم راہ ہے ﴿قَالَ هَذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ﴾ -

تو میرے بندوں پر کوئی تسلط نہیں رکھتا مگر وہ کہ جو ذاتی طور پر تیری پیروی کریں ﴿إِنَّ عِبَادِي لَكُنْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنْ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ﴾ -

یعنی درحقیقت تو لوگوں کو گمراہ نہیں کر سکتا بلکہ یہ تو منحرف انسان ہیں جو اپنے ارادے اور رغبت سے تیری دعوت پر لپیک کہتے ہیں اور تیری نقش قدم ہرچلتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ آیت انسانوں کے ارادے کی آزادی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ ابلیس اور اس کا لشکر کسی کو زبردستی برائی کی طرف کھینچ کر نہیں لے جاتا بلکہ یہ خود انسان ہی ہیں جو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے دل کا دریچہ اس کے لئے کھولتے ہیں اور اسے مداخلت کی اجازت دیتے ہیں خلاصہ یہ کہ شیطانی وسوسے اگرچہ موثر ہیں لیکن آخری فیصلہ شیطان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود انسان کے بس میں ہے کیونکہ انسان اس کے مقابلے کھڑا ہو کر اسے ٹھکرا سکتا ہے۔ درحقیقت خدا تعالیٰ شیطان کے دفاع سے یہ خیال باطل اور تصور خام نکال دینا چاہتا ہے کہ وہ بلا مقابلہ انسان پر حکومت حاصل کر لے گا۔

اس کے بعد شیطان کے پیروں کا روں کو نہایت صریح دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جہنم ان کے سب کی وعدہ گاہ ہے ﴿وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ﴾۔

یہ گمان نہ کریں کہ وہ سزا اور عذاب کے چنگل سے فرار کر سکیں گے یا معاملہ ان کے حساب و کتاب تک نہیں پہنچے گا ان سب کے حساب کتاب کی ایک ہی جگہ اور ایک ہی مقام پر دیکھ بھال کی جائے گی۔

وہی دوزخ کے جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لئے شیطان کے پیروکاروں کا ایک گروہ تقسیم ہوا ہے ﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِّكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ﴾۔

یہ حقیقت گناہوں کے دروازے ہیں جن کے ذریعے مختلف افراد دوزخ میں داخل ہوں گے۔ ہر گروہ ایک گناہ کے ارتکاب کے ذریعے ایک در سے دوزخ میں جائے گا۔ جیسا کہ جنت کے دروازے اطاعتیں، اعمال صالح اور مجاہدات ہیں کہ جن کے ذریعے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے۔

۱۔ نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۳، حدیث ۴۵۔

۲۔ تفسیر نمونہ جلد ۹، ص (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

چند اہم نکات

۱۔ تکبر عظیم بد بختیوں کا سرچشمہ

ابلیس اور خلقت آدم (علیہ السلام) کی داستان قرآن کی مختلف سورتوں میں آئی ہے اس میں اہم ترین نکتہ ابلیس کا تکبر کی وجہ سے انتہائی بلند مقام سے محروم ہو جانا ہے کہ جس پر وہ فائز تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہیں تھا (جیسا کہ سورہ کہف کی آیہ ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے) لیکن اس نے اطاعت الہی کے ذریعے ایسا بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ ملائکہ کی صفوں میں شامل ہو گیا تھا بلکہ یہاں تک کہ بعض کہ بقول فرشتوں کا معلم بن گیا تھا اور جیسا کہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ سے معلوم ہوتا ہے اس نے ہزار سال خدا کی عبادت کی تھی لیکن وہ یہ تمام مقامات گھڑی بھر کے تکبر کے باعث کھو بیٹھا اور خود پرستی اور تعصب میں ایسا گرفتار ہوا کہ عذر خواہی اور توبہ کی طرف نہ لوٹا بلکہ اس نے اپنا کام ایسی طرح جاری رکھا اور ہٹ دھرمی کے راستے پر ایسا جما رہا کہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اولاد آدم میں سے تمام ظالموں اور گنہ گاروں کے جرائم میں وسوسہ ڈال کر شرکت کرے گا اور ان سب کے کیفر کردار

یہ ہے خود خواہی، غرور، تعصب، خود پسندی اور استکبار کا نتیجہ۔

نہ صرف ابلیس بلکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے شیطان صفت انسانوں کو دیکھا ہے یا ان کے حالات تاریخ کے سیاہ صفحات میں دیکھے ہیں کہ جس وقت وہ غرور و تکبر اور خود غرضی کے مرکب پر سوار ہوئے تو انہوں نے ایک دنیا کو خاک و خون میں غلطاں کر دیا گویا آنکھوں میں اترے ہوئے خون اور جہالت کے پردے نے ان کے ظاہری اور باطنی آنکھوں کو بیکار کر دیا اور وہ کسی حقیقت کو نہ دیکھ پائے۔ انہوں نے دیوانہ اور ظلم و جور کی راہ میں قدم اٹھایا اور آخر کار اپنے آپ کو بدترین گرہے میں گرادیا یہ غرور و تکبر جلا ڈالنے والی اور وحشت ناک آگ ہے جیسا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان سا لہا سال محنت و مشقت کرے، گھر بنائے اس کا ساز و سامان جمع کرے اور زندگی گزارنے کا سرمایہ فراہم کرے لیکن اس کی تمام محنتوں کا ما حاصل آگ کا صرف ایک شعلہ چند لمحوں میں خاکستر بنا دے۔ اسی طرح پوری طرح ممکن ہے کہ ہزار ہا سال کی محنتوں کا ما حاصل خدا کے سامنے ایک گھڑی کے غرور کے باعث کھو بیٹھے اس سے بڑھ کر واضح اور ہلادینے والا سبق اور کیا ہوگا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کی توجہ اپنے واضح اور روشن نکتے کی طرف بھی نہ تھی کہ آگ خاک پر برتری نہیں رکھتی کیونکہ تمام برکات کا سرچشمہ خاہے۔ نباتات، حیوانات، معدنیات، سب کا تعلق مٹی سے ہے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقامات اسی کے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہر زندہ موجود کی پیدائش سرچشمہ خاک ہے لیکن آگ کا کام جلانا ہے بہت مواقع پر ویرانی اور تباہی و مبربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اسی خطبہ قاصعہ میں ابلیس کو ”عد و اللہ“ (دشمن خدا) امام المتعصبین (متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کا پیشوا) اور سلف المتکبرین (متکبرین کا بزرگ) کہہ کر پکارتے ہیں اور فرماتے ہیں: اسی لئے خدا نے عزت کا لباس اس کے بدن سے اتار دیا اور ذلت کی چادر اس کے سر پر ڈال دی۔ اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:

الا ترون كيف صغره الله بتكبره ، ووضعه بترفعه ، فجعله في الدنيا مدحوراً واعدله في الآخرة سعيراً
کیا دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح خدا نے اس سے اس کے تکبر کی وجہ سے حقیر اور چھوٹا کر دیا اور برتری کی خواہش کے سبب اسے پست کر دیا وہ دنیا میں راندہ درگاہ ہوا اور دار آخرت میں اس کے لئے دردناک عذاب فراہم کیا۔^(۳)
ضمنی طور پر جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ابلیس مکتب جبر کا بانی و مبانی ہے وہ مکتب جوہر انسان کے وجدان کے خلاف ہے اور اس کے پیدا ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ گنہ گار انسان اپنے اعمال سے اپنے آپ کو بری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ابلیس نے اپنی برات کے لئے اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اولاد آدم (علیہ السلام) کو گمراہ کرنے کی کوشش کا حق رکھتا ہے، اسی عظیم گناہ کا ارتکاب کیا اور کہا: خداوند! تو نے مجھے گمراہ کیا ہے لہذا میں بھی اسی بناء پر مخلصین کے علاوہ تمام اولاد آدم کو گمراہ کروں گا۔

۳۔ جہنم کے دروازے

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں (بعید نہیں کہ سات کا عدد یہاں عدد کثیر ہو یعنی جہنم کے بہت سے دروازے ہیں جیسا کہ سورہ لقمان کی آیہ ۲۷ میں بھی سات کا عدد اسی معنی میں آیا ہے)۔ لیکن واضح ہے کہ دروازوں کی یہ تعداد (جنت کے دروازوں کے طرح) نہ داخل ہونے والوں کی کثرت کی وجہ سے کہ وہ ایک چھوٹے سے دروازے سے نہیں گذر سکتے اور نہ ہی یہ تکلیف کے پہلو سے ہے بلکہ درحقیقت یہ ان مختلف عوامل کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو جہنم کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں گناہوں کی ہر قسم جہنم کا ایک دروازہ ہے۔

نہج البلاغہ کے خطبہ جہاد میں ہے: ان الجنة الله فتحه الله لخاصة اوليائه

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے کھولا ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷)۔

ایک مشہور حدیث ہے۔ ان السیوف مقالید الجنة۔

تلواریں جنت کی چابیاں ہیں۔

ان تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے متعدد دروازوں سے کیا مراد ہے۔

یہ قابل توجہ ہے کہ امام باقر علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔

خصال شیخ صدوق ابواب الثمانیہ۔

جبکہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں کہ جہنم کے سات دروازے ہیں، یہ فرق اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ بد بختی اور عذاب میں داخل ہونے کے بہت سے دروازے ہیں لیکن اس کے باوجود سعادت و خوش بختی تک پہنچنے کے دروازے اس سے زیادہ ہیں (سورہ رعد کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلے میں گفتگو کر چکے ہیں)۔

۴۔ سیاہ کپڑا اور خدا کی روح

یہ بات جاذب نظر ہے کہ ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو مختلف چیزوں سے پیدا ہوا ہے ان میں سے ایک عظمت کی انتہائی بلندیوں پر ہے اور دوسری قدر و قیمت کے لحاظ سے ظاہراً بہت پست ہے۔

انسان کا مادی پہلو بدبودار سیاہ رنگ کیچڑ سے تشکیل پاتا ہے اور اس کا معنی پہلو وہ چیز ہے کہ جسے ”روح خدا“ سے یاد کیا گیا ہے البتہ اللہ تعالیٰ جس رکھتا ہے نہ روح۔ روح کی خدا کی طرف نسبت اصطلاح کے مطابق اضافت و نسبت تشریفی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی قالب میں ایک بہت ہی پر عظمت چیز روح کو ڈالا گیا ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے خانہ کعبہ کو اس کی عظمت کی بناء پر ”بیت اللہ“ اور ماہ مبارک رمضان کو اس کی برکت کی وجہ سے ”شہر اللہ“ (اللہ کا مہینہ کہا جاتا ہے)۔

اسی بناء پر انسان کی قوس صعودی اس قدر بلند ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچتا ہے کہ اسے سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا اور اس کی قوس نزول اس قدر پست ہے کہ چوپایوں سے بھی پست ہے ﴿بل ہم اضل﴾۔

قوس صعودی اور نزولی میں اتنا زیادہ فاصلہ خود اس کی مخلوق کی انتہائی اہمیت کی دلیل ہے اور یہ مخصوص ترکیب اس امر کی بھی دلیل ہے کہ انسانی مقام کی عظمت اس کے مادی پہلو کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اس کے مادی پہلو کی طرف نظر کریں تو وہ سیاہ کیچڑ سے زیادہ کچھ نہیں یہ روح الہی ہے کہ جس میں بہت زیادہ صلاحیتیں پنہاں ہیں اور وہ نوار الہی کا مقام تجلی ہو سکتی ہے اسے یہ سب عظمتیں بخشی گئی ہیں اور اس کے کمال و ارتقاء کا صرف یہی راستہ ہے کہ اسے تقویت دی جائے اور مادی پہلو کو جو اسی مقصد کے لیے ذریعہ ہے، اسے صرف اسی کے پیش رفت کے لئے استعمال کیا جائے (کیونکہ ممکن ہے اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے لئے موثر مدد دے)۔

سورہ بقرہ کی ابتداء میں حضرت آدم (علیہ السلام) کی خلقت کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا آدم کے سامنے سجدہ کرنا ان کے مخصوص الہی علم کی وجہ سے تھا۔

لیکن یہ سوال کہ غیر خدا کو سجدہ کس طرح ممکن ہے اور کیا واقعہ فرشتوں نے اس عجیب و خلقت کی وجہ سے خدا کو سجدہ کیا تھا یا انھوں نے آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کیا تھا۔

اس کا جواب سورہ بقرہ کی انہی آیات میں دیا جا چکا ہے جو خلقتِ آدم سے متعلق ہیں۔

۵۔ جن کیا ہے؟

لفظ ”جن“ دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے جو جس انسانی سے پوشیدہ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں ”جنة اللیل“ یا ”فلما جن علیہ اللیل“ یعنی جس وقت سیاہ رات کے پردے نے اسے چھپا لیا۔ اسی بناء پر ”مجنون“ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل پوشیدہ ہو۔ ”جنین“ اس بچے کو کہتے ہیں کو رحمِ مادر میں مخفی ہو۔ ”جنت“ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے

درختوں نے اس زمین کو چھپا رکھا ہو۔ ”جنان“ اس دل کو کہتے ہیں جو سینہ کے اندر چھپا ہوا اور ”جنۃ“ اس ڈھال کو کہتے ہیں جو انسان کو دشمن کی ضربوں سے چھپائے۔

البتہ آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ”جن“ ایک موجود عاقل ہے کہ جو حسِ انسانی سے پوشیدہ ہے اس کی خلقت دراصل آگ سے یا آگ کے صاف شعلوں سے ہوئی ہے ابلیس بھی اسی گروہ میں سے ہے۔

بعض علماء انھیں ”ارواحِ عاقلہ“ کی ایک نوع سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو مادہ سے مجرد ہیں (البتہ واضح ہے کہ مجرد کامل نہیں رکھتے کیونکہ جو چیز کسی مادہ سے پیدا ہوتی ہے وہ مادی ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ تجرد ہے کیونکہ ہمارے حواس اس کا اداک نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک قسم کا جس لطیف ہے)۔

نیز آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ مطیع بھی ہیں اور سرکش بھی۔ اور وہ بھی مکلف اور مسئول ہیں۔

البتہ ان مسائل کی تشریح اور دو حاضر کے علم سے ان کی ہم آہنگی کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں ہم مناسب حد تک انشاء اللہ سورہ جن کی تفسیر میں بحث کریں گے کہ جو قرآن کے پارہ انتیس میں ہے۔ جس نکتہ کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں لفظ ”جان“ آیا ہے جو اسی مادہ ”جن“ سے ہے۔

کیا یہ دونوں الفاظ (”جن“ اور ”جان“) ایک معنی رکھتے ہیں یا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”جان“ ”جن“ کی ایک خاص قسم ہے۔

قرآن کی وہ آیات جو اس سلسلہ میں آئی ہیں اگر انہیں ایک دوسرے کے سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ کیونکہ قرآن بھی ”جن“ انسان کے ساتھ آیا ہے۔ اور کبھی ”جان“ مثلاً سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۸۸ میں ہے: ﴿قُلْ لِّئِنْ اجْتَمَعَتِ الْاَنْسُ وَالْجِنُّ﴾

سورہ ذاریات کی آیہ ۵۶ میں آیا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتَ الْجِنَّ وَالْاَنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْا﴾

حالانکہ سورہ رحمن کی آیہ ۱۴-۱۵ میں ہے: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِنْ نَّارٍ﴾

اسی سورہ آیہ ۳۹ میں ہے: ﴿فِيَوْمَئِذٍ لَا يُسْئَلُ مِنْ ذَنْبِهِ اَنْسٌ وَلَا جَانٌ﴾

مندرجہ بالا آیات اور قرآن کی دیگر آیات کے مجموعی مطالعے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ”جان“ اور ”جن“ دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ لہذا مندرجہ بالا آیات میں کبھی ”جن“ انسان کے ساتھ آیا ہے اور کبھی ”جان“۔ البتہ قرآن حکیم میں ”جان“ ایک اور معنی میں بھی ہے۔ کہ سانپ کی ایک قسم ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے: کانھا جان (قصص ۳۱) لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔

۶۔ قرآن اور خلقت انسان

جیسا کہ ہم نے زیر بحث آیات میں دیکھا ہے کہ قرآن میں انسان کے بارے میں بڑی چمچی تلی بحث ہے اور اس موضوع سے قرآن تقریباً سر بستہ اور اجمالی طور پر گذر گیا کیونکہ اصلی مقصد تربیتی مسائل تھے۔ قرآن کے چند اور مواقع پر اس بحث کی نظیر موجود ہے مثلاً سورہ سجدہ، مومنون اور جن میں۔ البتہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کوئی علوم طبیعی کتاب نہیں ہے بلکہ انسان سازی کی کتاب ہے لہذا ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اس میں ان علوم کے جزئیات مثلاً تکامل سے مر بوط مسائل، تشریح جنین شناسی، نباتات شناسی وغیرہ بیان ہوں۔ لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں کہ تربیتی مباحث کی مناسبت سے ان علوم کی بعض جزئیات کی طرف قرآن میں مختصر سا اشارہ ہو جائے۔ بہر حال اس مختصر سی تہید کے بعد یہاں دو امور پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ تکامل انواع سائنسی لحاظ سے۔

۲۔ تکامل انواع قرآن کی نظر سے۔

پہلے اس موضوع پر آیات و روایات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف علوم طبیعی کے خصوصی معیاروں کو سامنے رکھ کر بحث کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ علوم طبیعی کے علماء کے درمیان زندہ موجودات چاہے، نباتات ہوں یا حیوانات، ان کے بارے میں دو مفروضے موجود ہیں۔

الف: تکامل انواع کا مفروضہ یا (Transf ormism) اس مفروضے کے مطابق زندہ موجودات کی انواع ابتداء میں موجودہ شکل میں نہ تھیں بلکہ موجودات کا آغاز ایک ایک سلول سے ہوا ہے۔ یہ سلول (Cellule) سمندروں کے پانی اور دریاؤں کی تہ کے چکنے سیاہ کیچڑ کے درمیان حرکت سے پیدا ہوئے یعنی بے جان موجودات تھے کہ جو خاص حالات میں تھے ان سے پہلے پہلی زندہ سلول (Cellule) پیدا ہوئے۔

ان انتہائی زندہ موجودات نے تدریجاً تکامل و ارتقاء شروع کیا اور ایک نوع سے دوسری نوع میں بدلتے ہوئے دریاؤں سے صحراؤں کی طرف اور وہاں سے ہوا اور فضا کی طرف منتقل ہوئے۔ اس طرح انواع و اقسام کے نباتات اور آبی و زمینی جانور اور پرندے وجود میں آئے ان تکامل اور ارتقاء کی کامل ترین صورت یہی آج کا انسان ہے جو بندر سے مشابہ موجود سے اور بھی انسان نما بندر سے ظاہر ہوا۔

ب: ثبوت انواع کا مفروضہ یا (f i x i s m) اس مفروضے کے مطابق جانداروں کی ہر نوع ابتداء ہی سے اسی موجود شکل میں ظاہر ہوئی اور کوئی نوع دوسری نوع میں تبدیل نہیں ہوئی اور فطرتاً انسان بھی مستقل خلقت کا حامل تھا کہ جو ابتداء سے اسی مشکل و صورت میں پیدا ہوا۔

دونوں گروہوں کے سائنسدانوں نے اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لئے بہت سے مطالب لکھے ہیں اور عملی محافل میں اس مسئلے پر بہت سے فزاع اور جھگڑے ہوئے ہیں ان جھگڑوں میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب لامارک (مشہور جانور شناس فرانسیسی سائنسداں جو اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اور اس کے بعد ڈارون (جانور شناس انگریز سائنسداں جو انیسویں صدی میں ہوا) نے تکامل انواع کے سلسلے میں اپنے نظریات نئے دلائل کے ساتھ پیش کئے۔

البتہ آج کی علوم طبیعی کی محافل میں شک نہیں کہ اکثریت تکامل انواع کے مفروضے کے حامی سائنس دانوں کی ہے۔

تکامل انواع کے حامیوں کے دلائل

ان دلائل کو آسانی سے تین حصوں میں خلاصہ کر کے بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) پہلے وہ دلائل ہیں جو قدیم نباتات و حیوانات کے آثار کے علم (P A L E O N T O L O G I E) یعنی گزشتہ موجودات کے پتھر ائے ہوئے ڈھانچوں کے مطالعے کے حوالے سے پیش کئے گئے ہیں ان کا ک نظریہ ہے کہ زمین کے مختلف طبقوں کا مطالعہ نشاندہی کرتا ہے کہ زندہ موجودات نے زیادہ تر شکلوں سے کامل تر اور زیادہ تر پیچیدہ شکلوں میں طرف تغیر کیا ہے۔

ان قدیم حیوانات و نباتات کے آثار میں پیش آنے والے فرق کی تفسیر فقط مفروضہ تکامل کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔
(۲) دوسری دلیل وہ قرائن ہیں جو علم تشریح (C o m p a r a t i v e A n o t o m y) سے اخذ کئے گئے ہیں اس سلسلے میں وہ لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس وقت مختلف جانوروں کی ہڈیوں کو جوڑنے کی تشریح

کر کے ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا گیا تو ان کے درمیان بہت زیادہ مشابہت دکھائی دی۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ان سب کا اصل اور بنیاد ایک ہی ہے۔

(۳) ان کی تیسری دلیل وہ قرائن ہیں کہ جو جنین (F o e u t s) سے ہاتھ لگے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ اگر جانوروں کا حالت جنین میں تقابلی جائزہ کیا جائے جبکہ انہوں نے ابھی ضروری تکامل حاصل نہ کیا ہو تو ہم دیکھیں گے کہ تکامل سے قبل جانور شکم مادر میں یا حالت نطفہ میں ایک دوسرے سے کس قدر مشابہت رکھتے ہیں یہ امر بھی نشاندہی کرتا ہے کہ سب کے سب ابتداء میں ایک ہی اصل سے لئے گئے ہیں۔

ثبوت انواع کے حامیوں کے جوابات

مفروضہ ثبوت انواع (F i x i s m) کے حامی ان تمام دلائل کا ایک کلی جواب دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ان قرائن میں سے کوئی بھی اطمینان بخش نہیں ہے البتہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا ان تین طرح کے قرائن میں سے ہر ایک احتمال تکامل کو ایک ”ظنی احتمال“ کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن یقیناً ہرگز پیدا نہیں کرتا۔

واضح لفظوں میں مفروضہ تکامل کو عقلی دلیل کے ذریعے ایک علمی اور قطعی قانون ثابت کرنا چاہیے یا محسوسات یا تجربہ کے ذریعے اور ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

لیکن ایک طرف تو ہم جانتے ہیں کہ عقلی اور فلسفیانہ دلائل سے ان مسائل کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اور دوسری طرف یہ مسائل کہ جن کی جڑیں لاکھوں برس قبل کے معاملات میں چھپی ہوئی ہیں ان تک تجربے کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ تجربے اور مشاہدہ سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ سطحی تغیرات ہیں جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ نباتات و حیوانات میں کسی اچانک تبدیلی جہش تاسیون کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مثلاً عام بھڑوں میں سے اچانک کوئی ایسی بھڑ پیدا ہوتی ہے جس کی کھال عام بھڑوں کے کھال سے مختلف ہوتی ہے، یعنی بہت خرم اور ملائم ہوتی ہے اور پھر اس کی کھال کی ان خصوصیات کی وجہ سے بھڑوں کی ایک نسل گوسفند مرینوس کے نام سے پیدا ہوتی ہے۔

یا بعض جانوروں میں کسی تغیر کی وجہ سے، آنکھ، ناخن، بدن یا کھال کے رنگ میں یا اس قسم کی کوئی اور تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے لیکن آج تک کوئی ایسی اچانک تبدیلی نہیں دیکھی گئی جو کسی حیوان کے بدن کے اصلی اعضاء میں کوئی اہم تغیر پیدا کر دے یا ایک نوع کو دوسری نوع میں تبدیل کر دے۔

اس بناء پر صرف ایک قیاس اور گمان ہی کیا جاسکتا ہے کہ پے در پے جست و خیز اور یکے بعد دیگرے تبدیلیوں کے ذریعے ہو سکتا ہے کسی روز کسی حیوان کی نوع تبدیل ہو جائے مثلاً پیٹ کے پل زمین پرینگنے والا جانور پرندے میں تبدیل ہو جائے لیکن یہ قیاس و تخمین ہر گز یقینی نہیں ہے بلکہ صرف ایک ظنی مسئلہ ہے کیونکہ ہم نے آج تک ایسے ناگہانی تغیرات کا تجربہ نہیں کیا جو اصلی اعضاء کو تبدیل کر دیں۔

جو کچھ کہا گیا اس سے ہم مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تبدیلی نوع (Transformation) کے حامیوں کی تین دلیلیں اس نظریے کو ایک مفروضے سے اوپر نہیں لے جاسکتیں اسی بناء پر اس نظریہ پر دقت نظر سے بحث کرنے والے لوگ ہمیشہ اس پر تکامل انواع کے مفروضے کے طور پر گفتگو کرتے ہیں نہ کہ ایک قانون کے طور پر۔

مفروضہ تکامل اور مسئلہ خدا شناسی

بہت سے لوگ اس مفروضے اور مسئلہ خدا شناسی کے درمیان ایک قسم کا تضاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید ایک لحاظ سے وہ حق بجانب بھی ہیں کیونکہ ڈارون کے نظریہ نے اربابِ کلیسا اور اس مفروضے کے حامیوں کے درمیان ایک شدید جنگ چھیڑ دی ہے۔

اس مسئلے کی بنیاد اس زمانے میں سیاسی اور اجتماعی وجوہات کی بنیاد پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے بہت پر اپیگنڈا کیا گیا کہ ڈاروینسزم خدا شناسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔

لیکن آج یہ مسئلہ ہمارے لئے واضح ہے کہ یہ دونوں امور آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتے یعنی چاہے مفروضہ تکامل کو قبول کریں چاہے فقدان دلیل کے باعث اسے رد کریں دونوں صورتوں میں ہم خدا شناس ہو سکتے ہیں۔

فرض کریں کہ مفروضہ تکامل ثابت بھی ہو جائے تو وہ ایک ایسے قانون علمی کے شکل اختیار کر لے گا جو طبیعی علت و معلوم سے پردہ اٹھا دے اور جانداروں اور دیگر موجودات کے درمیان اس علت و معلوم کے رابطے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

کیا بارشوں کے نزول، سمندر روں کے مد و جزر اور زلزلوں وغیرہ کے طبیعی علل معلوم ہونے سے خدا شناسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے؟ مسلماً نہیں۔ لہذا انواع موجودات کے درمیان ایک تکاملی و ارتقائی رابطے کا انکشاف خدا شناسی کے راستے میں مانع کیسے ہو سکتا ہے ایسی باتیں تو صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کا خیال ہے کہ علل طبیعی کا انکشاف وجود خدا قبول کرنے کے منافی ہے لیکن ہم آج اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان علل و اسباب کا انکشاف نہ صرف

یہ کہ عقیدہ توحید کو ضرر نہیں پہنچاتا بلکہ وہ تو وجود خدا کے اثبات کے لئے نظام خلقت سے ہمارے لئے مزید دلائل مہیا کرتا ہے۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ خود ڈارون پر جب الحاد اور نے دینی کا الزام لگایا گیا تو اس نے اس کی تردید کی اور اصل انواع کے بارے میں اپنی کتاب میں تصریح کی کہ میں تکامل انواع کو قبول کرنے کے باوجود خدا پرست ہوں، اصولی طور پر خدا کو قبول کئے بغیر تکامل کی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

اس عبارت پر غور کریں۔

وہ جانوروں کی مختلف انواع کے ظہور کے لئے علل طبعی کو قبول کرنے کے باوجود ہمیشہ خدائے بیگانہ پر ایمان رکھتا ہے اور تدریجاً جب اس کا سن آگے بڑھتا ہے تو اس میں مافوق بشر قدرت کو سمجھنے کا ایک خاص اور اندرونی احساس شدید تر ہو جاتا ہے اس حد تک کہ وہ انسان کے لئے معمائے آفرینش کو لائنخل سمجھتا ہے۔ (۵)

اصولی طور پر اس کا عقیدہ تھا کہ تکامل کے اس عجیب و غریب پیچ و خم میں انواع کی ہدایت اور ایک عام زندہ موجود کا ان مختلف انواع اور متنوع جانوروں میں تبدیلی ہونا کسی عقل کل کی طرف سے حساب شدہ اور دقیق منصوبہ بندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور واقعاً ہے بھی ایسا ہی۔ کیا تنہا مادہ جو عام اور پست ہے ایسی تعجب خیز اور عجیب و غریب مشتقات کو ایک بے پایاں علم و قدرت کے سہارے کے بغیر کیسے وجود بخش ہو سکتا ہے جبکہ ان میں سے ہر کو اپنی مفصل تشکیلات ہیں۔

نتیجہ یہ کہ یہ شور و غوغا بالکل بے بنیاد ہے کہ تکامل انواع کا نظریہ خدا شناسی کے نظریہ سے تضاد رکھتا ہے (چاہے ہم مفروضہ تکامل کو قبول کریں یا نہ کریں)۔

یہاں صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قتآن نے پیدائش آدم کی جو مختصر تاریخ بیان کی ہے کیا تکامل انواع کا مفروضہ اس سے تضاد رکھتا ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں ذیل میں بحث کریں گے۔

قرآن اور مسئلہ تکامل انواع

یہ بات جاذب نظر ہے کہ مسلمانوں میں تکامل انواع کے حامیوں اور مخالفوں دونوں نے اپنے مقصد کے اثبات کے لئے آیات قرآن سے تمسک کیا ہے لیکن شاید دونوں نے بعض اوقات اپنے عقیدے اور نظریے کے زیر اثر ہو کر ایسی

آیات سے استدلال کیا ہے کہ جو ان کے مقصود سے بہت کم ربط رکھتی ہیں۔ لہذا وہ دونوں طرف سے زیر بحث آنے والی آیات کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔

اہم ترین آیت کے جس کا تکامل کے طرفداروں نے سہارا لیا ہے سورہ آل عمران کی آیہ ۳۳ ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَ نُوحًا وَ آلَ إِبْرَاهِيمَ وَ آلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾

اس نے آدم (علیہ السلام)، نوح (علیہ السلام)، آل ابراہیم (علیہ السلام) اور آل عمران ایک گروہ کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں سے چنے گئے، آدم کو بھی اسی طرح ہونا چاہیئے یعنی ان کے زمانے میں بھی وہ انسان کے جس پر ”عالمین“ کا اطلاق ہوتا ہے یقیناً موجود تھے اور آدم (علیہ السلام) انہی میں سے چنے گئے تھے یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ آدم (علیہ السلام) روی زمین کے پہلے انسان نہ تھے بلکہ قبل ازیں بھی دوسرے انسان موجود تھے اور آدم (علیہ السلام) کا امتیاز وہی ان کا فکری اور روحانی ارتقاء و تکامل ہے کہ جس کے سبب وہ اپنے جیسے افراد میں سے چنے گئے۔

اس نظریہ کے حامیوں نے کچھ اور آیات بھی ذکر کی ہیں کہ جن میں سے بعض مسئلہ تکامل سے بالکل ربط نہیں رکھتیں اور ان کی تفسیر تکامل کے مفہوم میں کرنا زیادہ تر تفسیر بالرای بن جاتی ہے۔

ان میں سے بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جو تکامل انواع کے مفہوم سے بھی مطابقت رکھتی ہیں، ثبوت انواع سے بھی اور آدم (علیہ السلام) کی مستقل خلقت سے بھی۔ اسی بناء پر ہم نے بہتر سمجھا ہے کہ ان کے ذکر سے صرف نظر کیا جائے۔

باقی رہا وہ اعتراض جو اس استدلال پر کیا جاسکتا ہے یہ ہے کہ ہے ”عالمین“ اگر معاصر لوگوں کے معنی میں ہو اور ”اصطفیٰ“ (چنا) یقیناً ایسے ہی اشخاص میں سے ہو تو پھر یہ استدلال قابل قبول ہو سکے گا لیکن اگر کوئی کہے کہ ”عالمین“ معاصرین اور غیر معاصرین سب کے لئے ہے تو اس صورت میں مندرجہ بالا آیت اس امر پر دلالت نہیں کرے گی جیسا کہ پیغمبر اسلام کی مشہور حدیث میں خاتون اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی فضیلت میں منقول ہے کہ آپ نے

فرمایا: اما ابنتی فاطمہ فہی سیدۃ نساء العالمین من الاولین و الاخرین

باقی رہی میری بیٹی فاطمہ تو وہ اولین و آخرین کے سب جہانوں کے عورتوں کی سردار ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ کوئی کہے کہ کچھ لوگوں کو خدا نے تمام اور ادوار کے انسانوں میں سے چن لیا ہے اور ان میں سے ایک آدم ہیں اس صورت میں ضروری نہیں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے زمانے میں دوسرے انسان بھی موجود

ہوں کہ جن پر ”عالمین“ کا اطلاق ہوا آدم ان میں سے چنے جائیں، خصوصاً جبکہ گفتگو خدا کے چننے کے بارے میں ہے جو آئندہ آنے والی اور بعد کے زمانوں میں آنے والی نسلوں میں سے اچھی طرح آگاہ ہے۔^(۱)

لیکن اہم ترین دلیل جو ثبوت انواع کے حامیوں نے آیات قرآن میں سے منتخب کی ہے وہ زیر بحث اور اس جیسی آیات ہیں کہ جو کہتی ہیں کہ خدا نے انسان کو خشک مٹی سے پیدا کیا کہ جو سیاہ رنگ بدبودار اور کیچڑ سے لی گئی تھی۔ یہ امر لائق توجہ ہے کہ ”انسان“ کی خلقت کے موقع پر بھی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ (حجر: ۲۶)۔

نیز بشر کے بارے میں بھی یہ تعبیر آئی ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ﴾ (حجر: ۲۸)۔

نیز یہ بھی ہے کہ فرشتوں نے خود ذاتِ آدم کو سجدہ کیا اس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ (سورہ حجر کی آیات ۲۹، ۳۰، اور ۳۱ جو سطور بالا میں ہم بیان کر آئے ہیں ان میں غور و فکر کیجئے)۔

پہلی نظر میں ان آیات مفہوم یہی نکلتا ہے کہ آدم (علیہ السلام) پہلے سیاہ رنگ کے کیچڑ سے پیدا ہوئے، اعضاء و جوارح کی تکمیل کے بعد ان میں خدائی روح پھینکی گئی اور اس کے ساتھ ابلیس کے سوا تمام فرشتے ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

ان آیات کا طرز بیان نشاندہی کرتا ہے کہ آدم کی مٹی سے خلقت اور موجودہ شکل و صورت پیدا ہونے کے درمیان دیگر انواع موجود نہ تھیں۔ بعض مندرجہ بالا آیات میں ”ثم“ کی تعبیر آئی ہے یہ لفظ لغت عرب میں فاصلہ ترتیب کے لئے استعمال ہوتا ہے یہ لفظ ہر گز لاکھوں سال گزرنے اور ہزاروں انواع کے موجود ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ کوئی مانع نہیں کہ یہ ایسے فاصلوں کی طرف اشارہ ہو جو آدم کی مٹی سے خلقت اور پھر خشک مٹی اور پھر روح الہی پھونکے جانے کے مراحل میں موجود تھے اسی لئے لفظ ”ثم“ عالم جنین میں انسان کی خلقت اور ان مراحل کے بارے میں آیا ہے کہ جو جنین کے بعد دیگرے طے کرتا ہے، مثلاً

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نَظْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ ثُمَّ

لَنُخْرِجَكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لَتَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ﴾۔

اے لوگو! اگر تمہیں بعث اور قیامت کے بارے میں شک ہے (تو انسان کی خلقت کے بارے میں قدرت خدا پر غور و فکر کرو کہ) ہم نے تمہیں خاک سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر جے ہوئے خون سے پھر مضغہ (گوشت کے جبائے ٹکڑے) سے پھر ہم تمہیں بچہ کی شکل میں باہر نکالتے ہیں پھر تم مرحلہ بلوغ تک پہنچتے ہو (حجر: ۵)

آپ دیکھ رہیں کہ ضروری نہیں ہے کہ ”ثم“ ایک طولانی فاصلہ کے لئے آئے بلکہ جیسے یہ ایک طولانی فاصلوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ویسے ہی مختصر فاصلوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ آیات قرآن نے براہ راست مسئلہ تکامل یا ثبوت انواع بیان نہیں کیا۔ (لیکن بالخصوص انسان کے بارے میں) آیات کا ظاہری مفہوم مستقل خلقت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اگرچہ اس کے بارے میں کامل صراحت نہیں ہے لیکن خلقتِ آدم سے متعلقہ آیات کا ظاہر زیادہ مستقل خلقتِ آدم سے متعلقہ آیات کا ظاہر مستقل خلقت کے مفہوم کے گرد گردش کرتا ہے البتہ دیگر جانوروں کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔

۱۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ایک مختصر مدت میں اولادِ آدم پر مشتمل ایک معاشرہ تشکیل پایا گیا ہو اور ان میں سے آدم برگزیدہ اور چنے ہوئے ہوں۔

آیات ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱

۴۵۔ ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ﴾۔

۴۶۔ ﴿ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ﴾۔

۴۷۔ ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾۔

۴۸۔ ﴿لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ﴾۔

۴۹۔ ﴿نَبِّئْ عِبَادِيَ أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾۔

۵۰۔ ﴿وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ﴾۔

ترجمہ

۴۵۔ پرہیز کار (بہشت کے سرسبز) باغوں اور اس کے سرچشمہ کے کنارے ہوں گے۔

۴۶۔ (خدا کے فرشتے ان سے کہیں گے) امن و سلامتی کے ساتھ ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔

۴۷۔ ہم ان کے سینوں سے پر قسم کا غل (حسد، کینہ، عداوت اور خیانت) اتار لیں گے (اور ان کی روح پاک کریں

گے) اس حالت میں کہ سب بھائی بھائی بن کر تختوں میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

۴۸۔ انھیں ہرگز کوئی خستگی اور تکان نہ ہوگی اور انھیں اس سے کبھی بھی نکالا نہیں جائے گا۔

۴۹۔ میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں غفور رحیم ہوں۔

۵۰۔ نیز (انھیں بتا دو کہ) میرا عذاب اور سزا دردناک ہے۔

تفسیر

بہشت کی آٹھ نعمتیں

گذشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا نے کس طرح تفصیل سے شیطان اور اس کے ساتھیوں، ہمجولیوں اور پیرو کاروں کا نتیجہ کار بیان کیا ہے اور ان کے سامنے جہنم کے سات دروازے کھولے ہیں۔

قرآن کی روش ہے کہ وہ موازنہ پیش کر کے تعلیم و تربیت کے لئے استفادہ کرتا ہے اسی روش کے مطابق ان آیات میں بہشت، اہل بہشت، مادی اور معنوی نعمات اور جسمانی و روحانی عنایات کے بارے میں گفتگو ہے۔ درحقیقت ان آیات میں آٹھ عظیم مادی اور معنوی نعمات کا تذکرہ بہشت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق آیا ہے۔

۱۔ پہلے ایک عظیم مادی نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پرہیزگار بہشت کے سرسبز باغوں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں کے کنارے ہوں گے ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ﴾۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ یہاں تمام صفات میں سے صرف ”تقویٰ“ کا ذکر کیا گیا ہے، وہی تقویٰ، پرہیزگاری تہد اور مسئولیت کہ جس میں تمام عمدہ انسانی صفات جمع ہیں۔

”جنت و عیون“ کا صیغہ جمع کے ساتھ ذکر ہوا ہے یہ طرح طرح کے باغات، فراوان چشموں اور گوناگوں بہشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے ہر ایک کا ایک نیا لطف اور خاص خصوصیت ہے۔

۲۔ ۳۔ اس کے بعد دو اہم معنوی نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہیں ”سلامتی“ اور ”امن“۔ ہر قسم کے رنج و ناراحتی اور تکلیف سے سلامتی اور ہر قسم کے خطرے سے امن و امان۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کے فرشتے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان باغوں میں کامل سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ ﴿ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ﴾۔ بعد والی آیت میں تین اور معنوی نعمات کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ ہم ان کے سینوں سے ہر قسم کا حسد کینہ، عداوت اور خیانت دھودیں گے اور ایسی آلائشیں ان سے دور کر دیں گے ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ﴾^(۱)

۵۔ اور وہ یوں ہوں گے جیسے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور ان کے درمیان محبت کا قریبی تعلق کار فرما ہے ﴿إِخْوَانًا﴾۔

۶۔ اس حالت میں کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے ﴿عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾^(۲)۔ ان کی اجتماعی نشستیں اس کے دنیا کے تکلیف و تکلفات کی طرح نہیں ہیں۔ ان مجلس میں کوئی اوپر اور کوئی نیچے ہے۔ اس دنیا کے المناک طبقاتی زندگی کا کوئی اصول وہاں نہیں ہے وہاں سب آپس میں بھائی ہیں سب ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور ایک ہی صف میں ہیں ایسا نہیں کہ کوئی تو مجلس میں بالائیں ہے اور دوسرا جوتے اتارنے کی جگہ پر بیٹھا ہے۔

البتہ یہ امر معنوی درجات مختلف ہونے کے منافی نہیں ہے یہ تو ان کی اجتماعی نشستوں سے مربوط ہے ورنہ ہر ایک کا اپنے تقویٰ و ایمان کے لحاظ سے اپنا مقام ہے۔

اس کے بعد ساتویں مادی اور معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے انھیں ہر گز کوئی خستگی اور تکان لاحق نہ ہوگی ﴿لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ﴾۔

جب کہ اس دنیا میں آرام کے ایک دن سے پہلے اور بعد کتنی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے کہ جن کا تصور انسان کے راحت و آرام کو درہم برہم کر دیتا ہے ایسا وہاں نہیں ہے۔

۸۔ اسی طرح انھیں فنا اور نعمتوں کے ختم ہونے کا خیال بھی نہیں ستاتا کیونکہ ”وہ ہر گز ان پر مسرت نعمتوں بھرے ہوئے باغوں سے باہر نہیں نکلیں گے“ ﴿وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرِجِينَ﴾۔

اب جبکہ بہشت کی فراوان اور دل انگیز نعمتوں کا مؤثر طریقے سے بیان ہو چکا اور یہ بتایا جا چکا کہ وہ کاملاً متقین کے سپرد ہوں گیں تو اس بات کے پیش نظر کہ کہیں گنہ گار افراد ان غم و انداہ میں ڈوب کر نہ رہ جائیں کہ اے کاش! ہم بھی ان نعمتوں کا تک پہنچ سکتے اس مقام پر رحمن و رحیم خدا بھی ان کے لئے بھی جنت کے دروازے کھولتا ہے مگر مشروط طور پر۔

بہت محبت بھرے لہجے میں اور نوازشات کے نہایت اعلیٰ انداز میں اپنے پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے: اے نبی! میرے بندوں کو آگاہ کر دے کہ میں غفور و رحیم ہوں۔ گناہ بخشنے والا اور محبت سے معمور ہوں ﴿بَنَىٰ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾۔

”عبادی“ (میرے بندے) یہ ایک لطیف تعبیر ہے کہ جو ہر انسان کو اشتیاق دلاتی ہے اور اس کے بعد خدا کی یہ توصیف کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس اشتیاق کو اوجِ کمال تک پہنچا دیتی ہے۔

لیکن قرآن چونکہ ہمیشہ رحمت الہی کے مظاہرے سے سوء استفادہ کو روکتا ہے لہذا اس کے ہلادینے والے جملوں کے ذریعے اس کے خشم و غضب کا ذکر ہے یہ اس لئے ہے کہ تاکہ خوف و رجا کے درمیان اعتدال برقرار رہے کیونکہ یہ تکامل و ارتقاء اور تربیت کا راز ہے۔ لہذا بغیر کسی فاصلے کے فرمایا گیا ہے: میرے بندوں سے یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب دردناک ہے ﴿وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ﴾۔

۱۔ ”غل“ دراصل کسی چیز کے مخفیانہ نفوذ کے معنی میں ہے اسی لئے حسد، کینہ اور دشمنی کو جو چپکے سے انسانی روح میں نفوذ کرتے ہیں انہیں ”غل“ کہا جاتا ہے۔ لہذا ”غل“ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں بہت سی بری اور خلافِ اخلاق صفات شامل ہیں (مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ جلد سوم صفحہ ۱۱۸، اردو ترجمہ کے حاشیے کی طرف رجوع کریں)۔

۲۔ ”سرر“ ”سرر“ کی جمع ہے جو دراصل تخت، کرسی یا اس قسم کی کسی چیز کے معنی میں ہے کہ جس پر بیٹھتے ہیں اور خوشی کی محفلیں برپا کرتے ہیں (توجہ رہے کہ ”سرر“ او ”سرور“ ایک ہی مادہ سے ہیں)۔

چند اہم نکات

۱۔ بہشت کے باغ اور چشمے

ہمارے لئے کہ جو اس محدود دنیا میں ہیں نعمات بہشت کو سمجھنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اس جہاں کی نعمتیں ان نعمتوں کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے تقریباً صفر کے مقابلے میں ایک بہت بڑا عدد۔ لیکن یہ امر اس میں رکاوٹ نہیں کہ اپنی فکر اور روح کے ذریعے انہیں محسوس کریں یہ بات مسلم ہے کہ بہشت کی نعمتیں بہت ہی متنوع ہیں ، لفظ ”جنات“ (باغات) جو مندر بالا اور دیگر بہت سے آیات میں آیا ہے۔ اسی طرح لفظ ”عیون“ (چشمے) اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

البتہ قرآن میں (سورہ دہر، الرحمن، دخان اور محمد وغیرہ میں) ان چشموں کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہوا ہے اور مختلف اشارات کے ذریعے ان کی تنوع کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جو شاید اس جہاں کے طرح طرح کی نیک کاموں کے مجسم ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ انشاء اللہ ان سورتوں کی تفسیر میں ہم ان کا تفصیلی ذکر کریں گے۔

۲۔ مادی اور روحانی نعمتیں

برخلاف اس کے کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں قرآن نے ہر جگہ لوگوں کو مادی نعمتوں کی طرف بشارت نہیں دی بلکہ بار گفتگو میں روحانی نعمتوں کا ذکر بھی آیا ہے مندرجہ بالا آیات اس کا واضح نمونہ ہیں اس طرح سے فرشتے اہل بہشت کو اس عظیم مرکز نعمت میں خوش آمدید کہتے ہوئے جو پہلی بشارت دیں گے وہ سلامتی اور امن کی بشارت ہے۔

کینوں کا سینوں سے دھل جانا اور بری صفات مثلاً حسد، خیانت وغیرہ کہ جو روح اخوت کو ختم کر دیتی ہیں کا خاتمہ اور اسی طرح غلط قسم کی تکلفاتی امتیازات کہ جو فکر و روح کا سکون برباد کر دیتے ہیں کا خذف ہو جانا یہ سب ان کی معنوی و روحانی نعمتوں میں سے ہے کہ جن کی طرف مندرجہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ امن و سلامتی کہ جس کا ذکر نعمات بہشت کے آغاز میں ہوا ہے ہر دوسری نعمت کی بنیاد ہے کیونکہ ان دو کے بغیر کوئی نعمت قابل استفادہ نہیں ہے یہاں تک کہ اس دنیا میں بھی تمام نعمتوں کا نقطہ آغاز امن و سلامتی کی نعمت ہے۔

۳۔ کینہ اور حسد اخوت کے دشمن ہیں

۳۔ کینہ اور حسد اخوت کے دشمن ہیں: یہ امر لائق توجہ ہے کہ امن و سلامتی کے ذکر کے بعد زیر نظر آیات میں نعمت اخوت کے ذکر سے پہلے تمام مزاحم صفات مثلاً کینہ، حسد، غرور اور خیانت کی ریشہ کسی کا ذکر ہوا ہے لفظ ”غل“ جو وسیع مفہوم رکھتا ہے اس کے ذریعے ان سب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

در حقیقت اگر انسان کا دل اس ”غل“ سے پاک نہ ہو امن و سلامتی کی نعمت بھی حاصل نہ ہوگی اور نہ ہی اخوت برادرری کی نعمت بلکہ ہمیشہ جنگ و جدال اور کشمکش جاری رہے گی اور رشتہ اخوت منقطع ہوگا اور امن و سلامتی چھن جائے گی۔

۴۔ جزائے کامل

بعض مفسرین کے بقول جزائب مکمل ہوتی ہے جب اس میں یہ چار شرطیں موجود ہوں:

۱۔ فائدہ دیکھائی دینے والا ہو۔ ۲۔ احترام کے ساتھ ہو۔ ۳۔ ہر قسم کی پریشانی سے خالی ہو۔ ۴۔ دائمی ہو۔

مندرجہ بالا آیات میں نعمات بہشت کے لئے ان چار پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

﴿ان المتقين في جنات و عيون﴾ ”پہلی قسم کے لئے ہے۔“

﴿ادخلوها بسلام امنين﴾ ”احترام و تعظیم کی دلیل ہے۔“

﴿و نزعنا ما في صدورهم من غل اخوانا على سرر متقابلين﴾ ”

ہر قسم کی پریشانی، ناراضی اور روحانی تکلیف کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔“

﴿لا يمسه فيها نصب﴾ ”جسمانی نقصان اور ضرر کی نفی کے متعلق ہے۔“

”وما هم منها بمخرجين“ آخرین شرط پوری کرتا ہے یعنی ان نعمتوں کے لئے مدام ہے لہذا یہ جزا ہر لحاظ سے مکمل ہو

گی۔ (۱)

۵۔ آئیے اس دنیا میں تعمیر جنت کریں

مندرجہ بالا آیات میں جنت کی جن مادی اور معنوی صفات کی تصویر کشی کی گئی ہے اس جہان کی نعمتوں کے اہم اصول بھی یہی ہیں گویا قرآن ہمیں یہ نکتہ سمجھانا چاہتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں یہ نعمتیں فراہم کر کے تم بھی اس عظیم جنت کی ایک چھوٹی سی نظیر قائم کر سکتے ہو۔

۔ اگر سینوں کو کینوں اور عداوتوں سے پاک کر لو۔

۔ اگر اخوت برادری کے اصول کو تقویت دو۔

۔ اگر غیر ضروری تکلفات و تشرفات کو اپنی زندگی سے خصوصاً اجتماعی زندگی سے دور کر لو۔

۔ اگر امن و سلامتی اپنے معاشرے کو لوٹا دو۔

۔ اگر تمام لوگوں کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ کوئی شخص ان کی عزت و آبرو، مقام و حیثیت اور جائز مفادات سے مزاحم نہیں ہوگا اور انھیں اپنی نعمات کے بقاء کا اطمینان ہو تو یہ دن ایسا دن ہوگا جب جنت کی نظیر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔

آیات ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰

۵۱۔ ﴿وَنَبِّئُهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ﴾۔

۵۲۔ ﴿ذِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ﴾۔

۵۳۔ ﴿قَالُوا لَا تَتَّوَجَّلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ﴾۔

۵۴۔ ﴿قَالَ أَبَشِّرْنُنِي عَلَى أَنْ مَسْنِي الْكَبِيرُ فِيمَ تُبَشِّرُونَ﴾۔

۵۵۔ ﴿قَالُوا بَشِّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ﴾۔

۵۶۔ ﴿قَالَ وَمَنْ يَغْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ﴾۔

۵۷۔ ﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ﴾۔

۵۸۔ ﴿قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمٍ مُجْرِمِينَ﴾۔

۵۹۔ ﴿إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾۔

۶۰۔ ﴿إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ﴾۔

ترجمہ

۵۱۔ اور انھیں (میرے بندوں کو) ابراہیم کے مہمانوں کی خبر دے۔

۵۲۔ جس وقت وہ اس کے پاس پہنچے اور سلام کیا (تو ابراہیم نے) کہا: ہم تم سے خوفزدہ ہیں۔

۵۳۔ انھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم تجھے ایک دانا اور عالم بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔

۵۴۔ انھوں نے کہا: کیا مجھے بشارت دیتے حالانکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں (تو پھر) تو پھر کس چیز کی بشارت دیتے ہو۔

۵۵۔ انھوں نے کہا: ہم سچی بشارت دیتے ہیں، مایوس لوگوں میں سے نہ ہو۔

۵۶۔ اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہوں کے علاوہ کون مایوس ہوتا ہے۔

۵۷۔ (پھر اس نے) کہا: اے فرستادگان الہی! تم کس کام کے لئے مامور کیے گئے ہو۔

۵۸۔ وہ کہنے: ہماری ذمہ داری گنہ گار قوم سے ہے کہ انھیں ہلاک کریں۔

۵۹۔ سوائے خاندان لوط کے کہ ان سب کو بچا لیں گے۔

۶۰۔ البتہ اس کی بیوی کو ہم نے طے کیا ہے کہ وہ (شہر میں) پیچھے رہ جانے والوں (اور ہلاک ہونے والوں) میں سے

ہو۔

تفسیر

انجانے مہمان

ان آیات میں اور ان سے پہلی والی کچھ آیات میں عظیم انبیاء اور ان کے سرکش امتوں کی تاریخ کا ایک تربیتی حصہ ہے اس میں خدا کے مخلص بندوں اور شیطان کے پیروکاروں کی زندگی کے واضح نمونے ہیں۔ یہ امر جاذب نظر ہے کہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کے واقعہ سے شروع کی گئی ہے (وہی فرشتے کہ جو آپ کے پاس انسانی لباس میں آئے تھے پہلے انھوں نے آپ کو ایک ذی وقار بیٹے کی بشارت دی اور پھر قوم لوط کے دردناک انجام کی خبر دی)۔

قبل کی دو آیتوں میں پیغمبر اسلام کو حکم دیا کہ بندوں کو مقام رحمت خدا کے بارے میں بھی بتائیں اور اس کے دردناک عذاب کے بھی۔ اب حضرت ابراہیم کے مہمانوں کے واقعے میں ان مذکورہ دو صفحات کے دو زندہ نمونے دکھائی دیتے ہیں اس طرح گزشتہ آیات اور ان آیات کے درمیان ربط واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے: میرے بندوں کو ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں خبر دو ﴿وَبَيِّنْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ﴾۔ اگرچہ ”ضیف“ یہاں مفرد کی صورت میں آیا ہے لیکن جیسا کہ بعض عظیم مفسرین نے کہا ہے ”ضیف“ مفرد اور جمع دونوں کے معنی رکھتا ہے (ایک مہمان اور کئی مہمان)۔

یہ بن بلائے مہمان وہی فرشتے تھے جنہوں نے ”ابراہیم کے پاس پہنچ کر پہلے انجانے طور پر اسے سلام کیا“ ﴿إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا﴾۔

جیسا کہ ایک بزرگ میزبان کا فریضہ ہے، ابراہیم نے ان کی پذیرائی کا اہتمام کیا فوراً ان کے لئے مناسب غذا فراہم کی لیکن جب دسترخوان بچھایا گیا تو انجانے مہمانوں نے غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اس پر وحشت ہوئی۔

انھوں نے اپنی پریشانی چھپائی نہیں۔ صراحت سے ان سے کہا: ہم تم سے خوف زدہ ہیں ﴿قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ

وَجُلُونَ﴾۔^(۱)

یہ خوف اس رواج کی بناء پر تھا کہ اس زمانے میں اور بعد میں بھی بلکہ ہمارے زمانے تک بعض قوموں کا معمول ہے کہ جب کوئی شخص کسی نان و نمک کھا لیتا ہے تو اسے ضرر نہیں پہنچتا اور اپنے آپ کو اس ممنون احسان سمجھتا ہے لہذا کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے کو برا سمجھتا ہے اور اسے کینہ و عدات کی دلیل شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پریشانی سے نکال دیا اور ”اس سے کہا: ڈرو نہیں ہم تجھے ایک عالم و دانا بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔“ ﴿قَالُوا لَا تَتَوَجَّلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ﴾۔

یہ کہ غلام علیم (صاحب علم لڑکے) سے کون مراد ہے، قرآن کی دیگر آیات کو سامنے رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد اسحاق ہیں کیونکہ فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو یہ بشارت دی تو ان کی بیوی سارہ جو ظاہراً ایک بانجھ عورت تھی انھوں نے اسے بھی یہ بشارت دی جیسا کہ سورہ ہود کی آیہ ۷۱ میں ہے۔

وامرأتہ قائمۃ فضحکت فبشرناھا باسحاق

اس کی بیوی کھڑی تھی، وہ ہنسی اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سارہ حضرت اسحاق کی والدہ تھیں۔ قبل ایں حضرت ابراہیم حضرت ہاجرہ سے صاحب اولاد تھے۔ حضرت اسماعیل ان کے فرزند تھے (حضرت ہاجرہ وہ کنیز تھیں جنھیں حضرت ابراہیم نے زوجیت کے لئے انتخاب کیا تھا) لیکن حضرت اسماعیل اچھی طرح جانتے تھے کہ طبعی اصولوں کے لحاظ سے ان سے ایسے بیٹے کی پیدائش بہت بعید ہے اگرچہ خدا کی قدرت کاملہ کے لئے کوئی چیز محال نہیں ہے مگر انھوں نے معمول کے طبعی قوانین کی طرف توجہ نے ان کے تعجب کو ابھارا لہذا انھوں نے کہا مجھے ایسی بشارت دیتے ہو حالانکہ میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہوں۔ ﴿قَالَ أَبَشِّرْتُمُونِي عَلَى أَنَّ مَسْنَى الْكَبَرِ﴾۔ واقعاً کس چیز کی بشارت دیتے رہے ہو ﴿فَبِمَ تُبَشِّرُونَ﴾۔

کیا تمہاری یہ بشارت حکم الہی سے ہے یا خود تمہاری طرف سے ہے صراحت سے کہو تاکہ مجھے زیادہ اطمینان ہو۔ ”مسنى الکبر“ (مجھے بڑھاپے نے مس کیا ہے) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بڑھاپے کے آثار میرے سفید بالوں اور چہرے کی جھریوں سے نمایاں ہیں اور اس کے آثار میں اپنے سارے وجود میں محسوس کرتا ہوں۔

ممکن ہے کہ کہا جائے کہ اس لحاظ سے ابراہیم ایک اچھے تجربے سے گزرے تھے کہ بڑھاپے میں ہی ان کے بیٹے اسماعیل پیدا ہوئے تھے لہذا نئے بیٹے یعنی حضرت اسحاق کی پیدائش کی بارے میں انھیں تعجب نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن

معلوم ہونا چاہیئے، کہ بعض مفسرین کے بقول حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کی پیدائش میں دس سال سے زیادہ فاصلہ تھا لہذا بڑھاپے میں دس سال گزر جائیں تو بچے کی پیداکا احتمال بہت کم ہوتا ہے۔

ثانیاً اگر کوئی واقعہ خلاف معمول ہو اگرچہ استثنائی طور پر ہو۔ اس سے مشابہ مواقع پر تعجب کرنے سے مانع نہیں ہے کیونکہ ایسے سن و سال میں بچے کی پیدائش بہر حال ایک امر عجیب ہے۔ ۲

بہر حال فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو مردِ دیا زیادہ تعجب کا موقع نہ دیا۔ اور ان سے صراحت و قاطعیت سے کہا ہم تجھے حق کے ساتھ بشارت دے رہے ہیں ﴿قَالُوا بَشِّرْنَا كَ بِالْحَقِّ﴾۔ وہ بشارت کہ جو خدا کی طرف سے ہے اور اس کے حکم سے ہے۔ اسی بناء پر یہ حق ہے اور مسلم ہے۔

اس کے بعد اس لئے کہ مبادا ابراہیم مایوس و ناامید ہوں تاکید کے طور پر کہنے لگے: اب جبکہ ایسا ہے تو مایوس ہونے والوں میں سے نہ ہو ﴿فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ﴾۔

لیکن ابراہیم (علیہ السلام) نے فوراً ان کے اس خیال کو دور کر دیا کہ ان پر مایوسی اور رحمتِ خدا سے ناامیدی کا غلبہ نہیں ہے اور واضح کیا کہ یہ تو صرف طبعی معمولات کے حوالے سے تعجب ہے، لہذا صراحت سے کہا: گمراہوں کے سوا اپنے پروردگار کی رحمت سے کون مایوس ہوگا ﴿قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ﴾۔

وہی گمراہ کہ جنہوں نے خدا کو اچھی طرح نہیں پہچانا اور اس کی بے پایاں قدرت پر ان کی نگاہ نہیں کی۔ وہ خدا کہ جو مشت خاک سے ایسا عجیب و غریب انسان پیدا کرتا ہے اور ناچیز نطفہ سے ایک بچہ وجود میں لاتا ہے خرما کا خشک درخت جس کے حکم سے پھل سے لد جاتا ہے اور جلانے والی آگ جس کے حکم سے گلزار ہو جاتی ہے کون شخص ایسے پروردگار کی قدرت میں شک کرے یا اس کی رحمت سے مایوس ہو۔

بہر حال یہ بشارت سننے کے ابراہیم (علیہ السلام) اس خیال میں پڑ گئے کہ ان خاص حالات میں یہ فرشتے انہیں صرف بیٹے کی بشارت دینے نہیں آئے، یقیناً یہ کسی نہایت اہم کام پر مامور ہیں اور یہ بشارت تو ان کی ماموریت کا ایک پہلو ہے لہذا ان سے پوچھنے لگے: اے فرستادگانِ الہی! بتاؤ کہ تم کس اہم ذمہ داری کے لئے بھیجے گئے ہو؟ ﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ﴾۔

انہوں نے کہا: ہم ایک گنہگار قوم کے لئے بھیجے گئے ہیں ﴿قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ﴾۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جستجو اور تحقیق کے بارے میں اپنی خوکی وجہ سے وہ بھی خصوصاً ایسے مسائل میں اتنے جواب پر بس نہیں کریں گے۔ لہذا انھوں نے فوراً مزید فرمایا: یہ مجرم قوم لوط کے سوا کوئی اور نہیں ہے ہم مامور ہیں کہ اس بے شرم آلودہ قوم کو نیست و نابود کردیں، سوائے خاندان لوط کے کہ جسے ہلاکت سے بچا لیں گے ﴿إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ﴾۔

لیکن ”اجمعین“ کی تاکید کے ساتھ ”آل لوط“ کی تعبیر تمام گھر والوں کے بارے میں تھی یہاں تک کہ ان کی بیوی کہ جو مشرکین کی ہم کار تھی اور شاید ابراہیم (علیہ السلام) بھی اس ماجرے سے آگاہ تھے لہذا انھوں نے بلافاصلہ استثناء کرتے ہوئے کہا: سوائے اسکی بیوی کے کہ ہم نے طے کیا ہے کہ وہ شہر میں رہ جانے والوں کے ساتھ فنا سے دوچار ہو گی اور نجات حاصل نہ کر سکے گی۔

﴿إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَرْنَا إِنَّمَا لِمَنِ الْغَابِرِينَ﴾۔

”قدرنا“ اور ہم نے مقدر کیا، یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں خدا کی طرف سے ماموریت رکھتے ہیں

فرشتوں کا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ملاقات کرنا انھیں ولادت اسحاق کی خوشخبری دینا اور اس طرح اس قوم لوط کے بارے میں گفتگو کرنا ان سب امور پر ہم سورہ ہود کی آیات ۶۹ تا ۷۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں

(۲)

۱۔ اگرچہ مندر بالا آیات میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے پذیرائی کی اور مہمانوں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن جیسا کہ سورہ ہود کی آیہ ۶۹ اور ۷۰ میں ہم پڑھ چکے ہیں یہی تھا (تفسیر نمونہ جلد ۹ میں مذکورہ آیات کی تفسیر ملاحظہ کیجئے)

۲۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلے بیٹے اسماعیل کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۹۹ سال تھی اور اسحاق کی ولادت کے وقت ۱۱۲ سال تھے۔ س

۳۔ تفسیر نمونہ جلد نہم میں ملاحظہ فرمائیے۔

آیات ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷

- ۶۱۔ ﴿فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ﴾۔
- ۶۲۔ ﴿قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ﴾۔
- ۶۳۔ ﴿قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ﴾۔
- ۶۴۔ ﴿وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾۔
- ۶۵۔ ﴿فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَاتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ﴾۔
- ۶۶۔ ﴿وَقَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمَرَ أَنَّ دَابِرَ هَؤُلَاءِ مَقْطُوعٌ مُصْبِحِينَ﴾۔
- ۶۷۔ ﴿وَجَاءَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ﴾۔
- ۶۸۔ ﴿قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ ضَيْفِي فَلَا تَفْضَحُونِي﴾۔
- ۶۹۔ ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِي﴾۔
- ۷۰۔ ﴿قَالُوا أَوَلَمْ نُنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾۔
- ۷۱۔ ﴿قَالَ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ﴾۔
- ۷۲۔ ﴿لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾۔
- ۷۳۔ ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ﴾۔
- ۷۴۔ ﴿فَجَعَلْنَا عَلَيْهِمْ سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ﴾۔
- ۷۵۔ ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ﴾۔
- ۷۶۔ ﴿وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ﴾۔
- ۷۷۔ ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾۔

ترجمہ

۶۱۔ جس وقت (خدا کے) بھیجے ہوئے خاندان لوط کے پاس آئے۔

۶۲۔ (لوط نے) کہا تم انجانے افراد ہو۔

۶۳۔ انھوں نے کہا: ہم تیرے پاس وہی چیز لائے جس کے بارے میں وہ (کافر) شک و تردد کرتے تھے (ہم عذاب پر مامور ہیں)۔

۶۴۔ ہم تیرے پاس حقیقت مسلّمہ لائے ہیں اور ہم سچ کہتے ہیں۔

۶۵۔ لہذا رات کے آخر پہر اپنے گھر والوں کو ساتھ لے اور یہاں سے نکل پڑ۔ تو ان کے پیچھے پیچھے چل تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور جہاں کے لئے تمہیں کہا گیا ہے وہ وہاں چلے جاؤ۔

۶۶۔ اور ہم نے لوط کو وحی کی کہ صبح کے وقت ان سب کی جڑ اکھاڑ پھینکی جائے گی۔

۶۷۔ (دوسری طرف) اہل شہر کو ان کے آنے کا پتہ چل گیا اور وہ لوط کے گھر کی طرف آئے جبکہ وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دے رہے تھے۔

۶۸۔ (لوط نے کہا یہ میرے مہمان ہیں میری آبرو نہ گنواؤ۔

۶۹۔ خدا سے ڈو اور مجھے شرمندہ نہ کرو۔

۷۰۔ وہ کہنے لگے: کیا ہم نے تجھے دنیا والوں (کے ادھر آنے) سے روکا نہ تھا۔

۷۱۔ اس نے کہا: اگر تم صحیح انجام دینا چاہتے ہو تو میری بیٹیاں حاضر ہیں ان سے شادی کر لو اور گناہ کی قباحت سے بچو)۔

۷۲۔ تیری جان کی قسم! وہ اپنی مستی میں سرگرداں ہیں اور اپنی عقل و شعور گنوا بیٹھے ہیں۔

۷۳۔ آخر کار طلوع آفتاب کے وقت (صاعقہ یازمین کے زلزلے کی صورت میں ایک ہولناک چنگھاڑنے انہیں گھیر لیا

۷۴۔ اس کے بعد (ان کے شہر اور آبادی کو ہم نے زیر و زمر کر دیا) وہ تہہ و بالا ہو گئے اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش فرمائی۔

۷۵۔ اس (عبرت انگیز سرگزشت) میں سمجھداروں کے لئے نشانیاں ہیں۔

۷۶۔ اور (قافلوں کے) راستوں میں ان کے ویرانے ہمیشہ کے لئے برقرار ہیں۔

۷۷۔ ان میں ایمانداروں کے واسطے نشانیاں ہیں۔

تفسیر

قوم لوط کے گنہ گاروں کا انجام

گذشتہ آیات میں ہم نے ان فرشتوں کی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے ملاقات کا حال پڑھا جو قوم لوط پر عذاب کے لئے مامور تھے زیر نظر آیات میں ہم ان کے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس سے چلے آنے اور حضرت لوط کے پاس آنے کا حال پوچھیں گے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس وقت فرستادگان الہی خاندان لوط کے پاس آئے ﴿فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطِ الْمُرْسَلُونَ﴾۔

تو لوط نے ان سے فرمایا ”تم اجنبی لوگ ہو“۔ ﴿قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُونَ﴾۔

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام نے ان سے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ بہت خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں ان کے پاس آئے تھے اور ہو سکتا کہ ان کا آنا آپ کے لئے ایک مشکل کا باعث بن جاتا۔ ایک طرف وہ مہمان تھے محترم تھے اور ان کا آنا مبارک تھا اور دوسری ماحول انتہائی شرمناک اور مشکلات سے پر تھا اور اسی لئے سورہ ہود کی آیات میں یہی واقعہ جو کسی اور مناسبت سے آیا ہے وہاں ”سےء بھم“ کے الفاظ آئے ہیں یعنی یہ امر خدا کی طرف سے اس پیغمبر کے لئے سخت ناگوار تھا اور وہ ان کے آنے سے پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بہت ہی سخت ہے۔

لیکن فرشتوں نے انہیں زیادہ دیر انتظار میں نہ رکھا اور صراحت کے ساتھ کہا کہ ہم تیرے پاس ایسی چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ شک رکھتے تھے۔ ﴿قَالُوا بَلْ جِئْنَاكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ﴾۔ یعنی ہم اس دردناک عذاب کے لئے مامور ہیں جس کے بارے میں تو انہیں تنبیہ کر چکا ہے لیکن انہوں نے اسے کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔

اس کے بعد انہوں نے بطور تاکید کہا: ہم تیرے لئے مسلم اور ناقابل تردید حقیقت لائے ہیں ”یعنی ہم اس بے ایمان اور منحرف قوم کے لئے حتمی عذاب اور قطعی سزا لے کر آئے ہیں“ ﴿وَأَتَيْنَاكَ بِالْحَقِّ﴾۔

پھر انہوں نے مزید تاکید کے لئے کہا: ہم یقیناً سچ کہہ رہے ہیں ﴿وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾۔

یعنی یہ قوم اپنے لوٹنے کے تمام راستے تباہ کر چکی ہے اور ان کی شفاعت کا موقع اب باقی نہیں رہا یہ اس لئے کہ کہیں لوط ان کی سفارش کے لئے نہ سوچنے لگے کہ یہ لوگ اب ہرگز شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتے۔

نیز ضروری تھا کہ مومنین کا چھوٹا سا گروہ (کہ جو ان کی بیوی کے سوا اہل خاندان پر مشتمل تھا) اس ہلاکت انگیزی سے بچ جائے لہذا انہوں نے حضرت لوط کو ضروری احکامات دیئے، کہنے لگے: رات کے وقت جب یہ گنہ گار لوگ سو جائیں

یا شراب و شہوت میں مست ہو جائیں تم اپنے خاندان کو لے کر شہر کے باہر نکل جاؤ ﴿فَاسْرِبْ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ﴾
 - ”لیکن تم ان کے پیچھے پیچھے رہنا“ تاکہ ان کی نگرانی کر سکو ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے ﴿وَاتَّبِعْ أَذْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ﴾ - ”اور اسی مقام (شام یا کوئی دوسرا علاقہ جہاں کے لوگ اس آلودگی سے پاک ہیں) کی طرف چلے جاؤ“ ﴿وَامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ﴾ -

اس کے بعد گفتگو کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے ”ہم نے لوط کو اس امر کی وحی کی کہ دم صبح سب کی ریشہ کنی ہو جائے گی“ - یہاں تک کہ ان میں سے ایک فرد بھی نہیں بچے گا - ﴿وَفَضَيْنَا إِلَيْهِ ذَلِكَ الْأَمْرَ أَنَّ دَابِرَ هَؤُلَاءِ مَقْطُوعٌ مُصْبِحِينَ﴾ -
 غور کیجئے گا -

قرآن اس واقعے کو یہیں چھوڑ کر ابتداء کی طرف لوٹتا ہے اور واقعے کا وہ حصہ جو ایک مناسبت کی وجہ سے وہاں رہ گیا تھا کہ جس کا ہم بعد میں ذکر کریں گے، اسے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: شہر والوں کو جب لوط کے پاس آنے والے نئے مہمانوں کا پتہ چلا تو وہ ان کے گھر کی طرف چل پڑے، راستے میں وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے تھے ﴿وَجَاءَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ - گر اہی کی شرمناک وادی میں بھٹکنے والے ان افراد کا خیال تھا کہ گویا نرمال ان کے ہاتھ آگیا ہے خوبصورت اور خوش رنگ نوجوان اور وہ بھی لوط کے گھر میں -

”اہل مدینہ“ کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ کم از کم شہر کے بہت سے لوگ ٹولیوں میں حضرت لوط (علیہ السلام) کے گھر کی طرف چل پڑے - اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک بے شرم، ذلیل اور جسور تھے - خصوصاً لفظ ”یستبشرون“ (ایک دوسرے کو بشارت دیتے تھے) ان کی آلوگیوں کے گہرائی کی حکایت کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا شرمناک عمل ہے کہ شاید کسی نے ان کی نظیر جانوروں میں بھی بہت کم دیکھی ہوگی اور یہ عمل اگر کوئی انجام دیتا بھی ہے تو کم از چھپ چھپا کر اور احساس شرمندگی کے ساتھ ایسا کرتا ہے، لیکن یہ بدکار کمینہ صفت قوم کھلم کھلا ایک دوسرے کو مبارک باد دیتی تھی -

حضرت لوط علیہ السلام نے جب ان کا شور غل سنا تو بہت گھبرائے اور مضطرب ہوئے انہیں اپنے مہمانوں کے بارے میں بہت خوف ہوا کیونکہ ابھی تک وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مہمان مامورین عذاب ہیں قادر و قاہر خدا کے فرشتے ہیں لہذا وہ ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: یہ میرے مہمان ہیں، میری آبرو نہ گنواؤ“ قَالَ إِنَّ هَؤُلَاءِ ضِئْفِی

فَلَا تَفْضَحُونِ)۔ یعنی اگر تم خدا، پیغمبر اور جزاء اور سزا کے مسئلہ سے صرف نظر کر لو تو بھی کم از کم یہ انسانی مسئلہ ہے اور یہ بات تو سب انسانوں میں چاہے مومن ہوں یا کافر، موجود ہے کہ وہ مہمانوں کا احترام کرتے ہیں تم کیسے انسان ہو کہ اتنی سی بات بھی نہیں مانتے ہو۔ اگر تمہارا کوئی دین نہیں تو کم از کم آزاد انسان تو بنو۔

اس کے بعد آپ نے مزید کہا: آؤ خدا سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمسار نہ کرو ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ﴾

۔ (۱)

لیکن ”فضی“ دراصل دور کرنے کے معنی میں ہے بعد ازاں شرمندگی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ گویا لوط چاہتے تھے کہ ان مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کرو اور انھیں مجھ سے دور نہ کرو۔

لیکن وہ، وہ بہت جسور اور منہ پھٹ تھے بجائے اس کے وہ شرمندہ ہوتے کہ انھوں نے اللہ کے پیغمبر لوط (علیہ السلام) سے کیسا مطالبہ کیا ہے الٹا اس طرح سے پیش آئے جیسا لوط سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے انھوں نے زبان اعتراض دراز کی اور کہنے لگے: کیا ہم نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ دنیا والوں کو اپنے ہاں مہمان نہ ٹھہرانا اور کسی کو اپنے ہاں نہ آنے دینا ﴿قَالُوا أَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾۔

تم نے اس کی خلاف ورزی کیوں کی اور ہمارے کہنے پر عمل کیوں نہ کیا۔

یہ اس بناء پر تھا کہ یہ قوم انتہائی کم ظرف اور کنجوس تھی یہ لوگ ہر گز کسی کو اپنے ہاں مہمان نہیں ٹھہراتے تھے اور اتفاق سے ان کے شہر قافلوں کے راستے میں پڑ جاتے تھے کہتے تھے کہ انھوں نے یہ کام بعض آنے والوں کے ساتھ اس لئے کیا کہ کوئی ان کے ہاں ٹھہرے نہ۔ آہستہ آہستہ ان کی عادت بن گیا لہذا جب حضرت لوط کو شہر میں کسی مسافر کے آنے کی خبر ہوتی تو اسے اپنے گھر میں دعوت دیتے تاکہ وہ کہیں ان کے چنگل میں نہ پھنس جائے ان لوگوں کو جب اس کا پتا چلتا تو بہت سیخ پا ہوئے اور حضرت لوط (علیہ السلام) سے کھل کر کہنے لگے تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اب تم کسی مہمان کو اپنے گھر لے جاؤ۔

لہذا یوں لگتا کہ زیر نظر آیت میں لفظ ”عالمین“ مسافروں اور ایسے افراد کی طرف اشارہ ہے جو اس شہر اور علاقے کے رہنے والے نہ تھے اور ان کا صرف وہاں سے گذر ہوتا تھا۔

بہر حال حضرت لوط (علیہ السلام) نے ان کی یہ جسارت اور کمینگی دیکھی تو انھوں نے ایک طریقہ اختیار کیا تاکہ انھیں خواب غفلت اور انحراف و بے حیائی کی مستی سے بیدار کر سکیں۔ آپ نے کہا: تم کیوں انحراف کے راستے پر چلتے ہو

اگر تمہارا مقصد جنسی تقاضوں کو پورا کرنا ہے تو جائز اور صحیح طریقے سے شادی کر کے انہیں پورا کیوں نہیں کرتے، یہ میری بیٹیاں ہیں (میں تیار ہوں کہ انہیں تمہاری زوجیت میں دے دوں) اگر تم صحیح کام انجام دینا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے ﴿قَالَ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ﴾۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کی تو چند بیٹیاں تھیں اور ان افراد کی تعداد زیادہ تھی لیکن مقصد یہ تھا کہ ان پر اتمام حجت کیا جائے اور کہا جائے کہ میں اپنے مہمانوں کے احترام اور حفاظت اور تمہیں برائی کی دلدل سے نکالنے کے لئے اس حد تک ایثار کے لئے تیار ہوں۔

بعض نے یہ بھی کہا کہ ’ہو ۛ لاء بناتی‘ سے مراد شہر کی بیٹیاں ہیں اور روحانی باپ کے اعتبار سے انہوں نے سب کو اپنی بیٹیاں کہاں ہے لیکن پہلی تفسیر ایت کے معنی کے زیادہ نزدیک ہے۔

بغیر کہے واضح ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی بیٹیاں گمراہ مشرکین کی زوجیت میں دے دیں بلکہ ان کا مقصد تھا کہ آؤ! ایمان لے آؤ اور اس کے بعد میں اپنی بیٹیاں تمہارے عقد میں دے دوں گا۔

لیکن فسوس شہوت، انحراف اور ہٹ دھرمی کے اس عالم میں ان میں ذرہ بھر بھی انسانی اخلاق اور جذبہ باقی ہوتا تو کم از کم اس امر کے لئے کافی تھا کہ وہ شرمندہ ہوتے اور پلٹ جاتے مگر نہ صرف یہ کہ وہ شرمندہ نہ ہوئے بلکہ اپنے جسارت میں اور بڑھ گئے اور چاہا کہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے مہمانوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ روئے سخن رسول اسلام کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: تیری جان اور زندگی کی قسم! وہ اپنی مستی میں سخت سرگرداں تھے ﴿لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾۔

سورہ ہود میں اسی قسم کی بحث کے بعد ہے کہ فرشتوں نے اپنی مامویت سے پردہ اٹھایا اور حضرت لوط (علیہ السلام) سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ڈریئے نہیں یہ لوگ آپ کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔

سورہ قمر آیہ ۳۷ میں ہے کہ جب ان کی جسارت اور بڑھ گئی اور انہوں نے مہمانوں پر تجاوز کا مصمم ارادہ کر لیا تو ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ قرآن کے الفاظ میں۔ ﴿وَلَقَدْ رَاوْهُ عَنِ ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ﴾

(انہوں نے ان کے مہمانوں کے بارے میں ناجائز خواہش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں)

بعض روایت میں آیا ہے کہ ایک فرشتے نے مٹھی بھر مٹی ان کے چہرے پر پھینک دی تو وہ سب اندھے ہو گئے (اور چیختے چلاتے پلٹ گئے)۔

اس مقام پر اس قوم کے بارے میں اللہ کی گفتگو انتہاء کو پہنچ جاتی ہے وہ دو چچی تلی اور مختصر آیات میں ان کا منحوس انجام پڑے قاطع تباہ کن اور عبرت انگیز صورت میں بیان کرتا ہے اور کہتا ہے: آخر کار طلوع آفتاب کے وقت وحشت ناک چنگھاڑنے ان سب کو گھیر لیا ﴿فَأَخَذَتْهُمْ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ﴾۔

یہ ”صیحہ“ ہو سکتا ہے کہ ایک عظیم صاعقہ یا وحشت ناک زلزلہ کی آواز ہو۔ بہر حال ایک بہت بڑی چنگھاڑ تھی۔ اس کی وحشت سے سب کے سب بے ہوش ہو گئے یا مر گئے۔ ہم جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں جب ایک معین حد سے بڑھ جائیں تو تکلیف دہ اور وحشت ناک ہوتی ہیں اور اس سے بھی بڑھ جائیں تو انسان کو بیہوش کر دیتی ہیں یا پھر موت کا سبب بن جاتی ہیں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عمارتوں کو تباہ کر دیں۔

لیکن ہم نے اسی پر اکتفاء نہیں کی بلکہ ان کے شہر کو ہم نے بالکل زیر و زبر کر دیا اور عمارتوں کے اوپر والے حصے نیچے اور نیچے والے اوپر کر دیے ﴿فَجَعَلْنَا عَلَيْهِمَا سَافِلَهًا﴾۔

ان کے لئے یہ عذاب بھی کافی نہ تھا۔ اس پر ہم نے ان پر پتھریلے کنکروں کی بارش برسانی ﴿وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّی﴾۔

پتھروں کی یہ بارش ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لئے ہو جو اس وقت وحشت ناک چنگھاڑ سے نابود نہیں ہوئے تھے یا جو اسی گرمی و عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے تھے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ناپاک اجساد اور ناپاک آثار کو محو کرنے کے لئے ہو شہر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پتھروں کی بارش کے بعد کوئی شخص اس علاقے سے گذرتا تو آسانی سے باور نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی اس علاقے میں ایک شہر آباد تھا۔

یہ تین عذاب (وحشت ناک چنگھاڑ، شہر کا تہہ و بالا ہونا اور پتھروں کی بارش) کیوں تھے جبکہ ان میں سے ہر ایک اس قوم کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھا۔

ایسا یا تو ان کے گناہ کی شدت اور بے حیائی میں ان کے جسور ہونے کی بناء تھا یا دوسروں کے لئے عبرت کی خاطر اللہ نے ان پر عذاب کو کئی گنا کر دیا۔؟

یہ وہ مقام ہے جہاں قرآن تربیتی اور اخلاقی نتیجہ حاصل کرتے ہوئے کہتا ہے: اس واقعہ میں باہوش لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ﴾۔

جو اپنی خاص فراست و دانائی کی وجہ سے ہو، علامت سے واقعہ ہر اشارے سے حقیقت اور ہر نکتے سے اہم تربیتی مطلب اخذ کر لیتے ہیں۔^(۱)

لیکن یہ تصور نہ کریں کہ ان کے آثار بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ نہیں ”قافلوں اور راہ گروں کے لئے ہمیشہ برقرار ہیں“ ﴿وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ﴾۔

اگر تم باور نہیں کرتے تو اٹھ کھڑے ہو اور ان تباہ حال شہروں کے ویرانوں کو جا کر دیکھو کہ جو شاہ کے ایک راستے میں جانے والوں مسافروں کے لئے موجود ہیں، دیکھو اور ان میں غور کرو، عبرت حاصل کرو، خدا کی طرف پلٹ آؤ راہ توبہ اختیار کرو اور اپنے قلب و روح کو غلاظتوں سے پاک کر لو۔

تاکید مزید کے لئے اور اہل ایمان کو اس عبرت انگیز داستان میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: اس واقعہ میں اہل ایمان کی نشانیاں ہیں ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾۔

کیسے ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان یہ ہلا دینے والا واقعہ پڑھے اور اس سے عبرت حاصل نہ کرے۔ ”سجیل“ سے کیا مراد ہے، اس گناہ گار قوم پر پتھروں کی بارش کیوں برسی؟ ان کے شہر تہ و بالا کیوں ہوئے، غزول عذاب صبح کے وقت کیوں ہوا؟ خاندان لوط سے کیوں کہا گیا کہ پلٹ کر نہ دیکھیں اور قوم لوط کا اخلاق ان سب امور کے لئے سورہ ہود کی تفسیر میں ہم کافی بحث کر چکے ہیں۔ (تفسیر نمونہ جلد ۹ ص ۹ تا ص ۱۰ اردو ترجمہ ملاحظہ کیجئے)

چند اہم نکات

۱۔ ”قطع من اللیل“ سے کیا مراد ہے؟

”قطع“ رات کی تاریکی کے معنی میں ہے۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں:

گویا ”قطع“ ”قطعة“ کی جمع ہے لہذا مذکورہ بالا آیت میں اس سے مراد رات کا زیادہ حصہ ہے۔

لیکن مفردات میں راغب کے بقول معلوم ہوتا ہے کہ ”قطع“ ”قطعة“ معنی میں ہے اور مفرد ہے۔

البتہ بہت سے مفسرین کے بقول یہ لفظ رات کے آخری حصہ اور وقت سحر کے معنی میں ہے، شاید یہ تفسیر قرآن کی

بعض دوسری آیات کی بناء پر ہے کہ جو صراحت سے آلِ لوط کے بارے میں کہتی ہیں۔ ﴿نَجِّنَا هُمْ بِسَحَرٍ﴾

ہم نے انھیں وقت سحر نجات دی (قرۃ ۳۴)

یعنی اس وقت کہ جب شہوت پرست آلودہ دامن لوگ خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے تھے، شراب، غرور اور شہتی کی مستی ان کے وجود میں چھائی ہوئی تھی اور آل لوط کے شہر سے نکلنے کے لئے فضا بالکل سازگار تھی پس وہ نکل کھڑے ہوئے۔

تعب کی بات یہ ہے کہ انھی تباہ کرنے والی سزا اور عذاب کی ابتداء بھی دم صبح طلوع آفتاب کے وقت ہوئی شاید یہ وقت اس لئے منتخب کیا گیا کہ جب حضرت لوط (علیہ السلام) کے گھر پر یورش کرنے والے سب اندھے ہو گئے اور گھروں کے لوٹ گئے تو ممکن تھا وہ کچھ نہ کچھ سوچ میں پڑ جائیں، لہذا رات انھیں مہلت کے طور پر دی گئی کہ شاید وہ توبہ کر لیں اور تلافی کا راستہ اختیار کریں۔

بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جب گھروں کو لوٹ گئے تو ان میں سے بعض نے قسم کھائی کہ ہم صبح خاندان لوط (علیہ السلام) کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کرتے، عذاب الہی نے انھیں کاٹ کر دکھ دیا۔ (نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۳۸۵)

۲۔ ”وامضوا حیث تؤمرون“ کی تفسیر

ہم بتا چکے ہیں کہ فرشتوں نے خاندان لوط کو نصیحت کی کہ آخر شب اس علاقے کی طرف چلے جائیں جہاں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

اس جگہ کے بارے میں آیات قرآن اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں مفسرین نے بہت سی مختلف باتیں کی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ سر زمین شام کی طرف چلے جائیں کہ جہاں کا ماحول نسبتاً پاک تھا۔

بعض نے کہا کہ فرشتوں نے ایک خاص بستی کا ذکر اور انھیں نصیحت کی کہ وہاں چلے جائیں۔

تفسیر المیزان میں اس جملے سے یہ استفادہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے راستے کے لئے ایک طرح کی الہی ہدایت اور حقیقی راہنمائی رکھتے تھے اور وہ اس کے مطابق چلے۔

۳۔ ”متوسم“ اور ”مومن“ کے درمیان واسطہ

مندرجہ بالا آیات میں ہم دیکھا ہے کہ کبھی فرمایا گیا ہے کہ قوم لوط کے عبرت انگیز انجام میں ”متوسمین“ کے لئے نشانیاں ہیں اور کبھی ارشاد ہوتا ہے ”مؤمنین“ کے لئے۔ ان دونوں تعبیروں کے درمیان ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ حقیقی ”مؤمنین“ ”متوسم“ یعنی صاحب فراست، فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جانے والے اور بہت سمجھدار ہوتے ہیں۔

ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ (علیہ السلام) سے ”ان فی لک لایۃ للمتوسمین“ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

اس سے مراد امت اسلامی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا: قال رسول اللہ : اتقوا فراسة المؤمن ، فانه ينظر بنور الله عز وجل

رسول اللہ نے فرمایا: مومن کی فرست سے ڈرو کیونکہ وہ نور الہی سے دیکھتا ہے۔^(۱)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: متوسمین آئمہ ہیں۔ (نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۲۳۔)

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے منقول ہے:

رسول اکرم متوسم تھے، ان کے بعد میں ہوں اور میرے بعد میری اولاد اور ذریت سے امام ہیں۔ (نور الثقلین جلد ۳

صفحہ ۲۳)۔

۴۔ شہوت و غرور کی مستی

اگرچہ شراب کی مستی مشہور ہے لیکن شراب سے بالاتر مستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان میں سے مقام و منصب، شہرت اور خواہش نفسانی کی مستی ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی جان کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مستی میں سرگرداں اور انتہائی واضح راہ نجات بھی انھیں سمجھائی نہیں دیتی۔ معاملہ یہاں تک جا پہنچا ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) جیسے اپنی بیٹیاں ان کے نکاح میں دینے کو تیار ہو جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی نفسانی خواہشات حلال و مشروع طریقے سے پورا کر سکیں اور آلودگی گناہ اور شرمناک زندگی سے نجات پاسکیں لیکن وہ پھر بھی ان کی بات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ پیغمبر بزرگوار ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ مفسد کو روکنے کے لئے صرف نفی پر بس نہ کی جائے بلکہ اثبات کا بھی سہارا لیا جائے یعنی انسان کے فطری تقاضے صحیح طور پر پورے ہونے چاہئیں تاکہ وہ خرابی کی طرف مائل نہ ہوں اگر قوم لوط کے فاسد افراد ایسے تھے جن پر یہ مثبت طریقہ اثر انداز نہ ہوا لیکن عام طور پر یہ طریقہ بہت موثر ہوتا ہے۔ جب ہم غلط اور غیر صحیح سرگرمیوں کو روکنا چاہیں تو پہلے ہمیں لوگوں کے لئے صحیح اور درست سرگرمیاں فراہم کرنا چاہئیں۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت لوط (علیہ السلام) جیسے باستقامت پیغمبر تقریباً تیس سال اس پست اور کمینہ خصلت قوم میں پیدا کرتے رہے لیکن ان کے گھر والوں کے کوئی ان پر ایمان نہ لایا (اور اس میں بھی ان کی بیوی مستثنیٰ ہے) ^(۱)

یہ تمام استقامت کس قدر پر شکوہ ہے وہ بھی ایسے کمینہ خصلت لوگوں میں جن میں انسان ایک گھنٹہ بھی زندگی گزارے تو عاجز آجائے اور کس قدر تکلیف دہ ہے وہ ایسی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنا۔

سورہ ذاریات کی آیہ ۳۵، ۳۶ میں ہے: ﴿فَاخْرِجْنَا مِنْ هٰذَا﴾ **فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ**

ہم مظلوم بلا سے پہلے اس زمین سے ان تمام افراد کو نکال لے گئے جو ایمان لائے تھے لیکن وہاں ایک اہل ایمان خاندان کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔ یہاں بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خدائی عذاب کبھی بھی خشک اور مردونوں کو نہیں جلاتا یہاں تک کہ اگر ایک سچا مومن اور احساس ذمہ داری رکھنا والا مومن ہو تو اسے بھی نجات بخشتا ہے۔

آیات ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳

- ۷۸۔ ﴿وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ﴾ -
 ۷۹۔ ﴿فَأَنْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ﴾ -
 ۸۰۔ ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسِلِينَ﴾ -
 ۸۱۔ ﴿وَأَتَيْنَاهُمُ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ﴾ -
 ۸۲۔ ﴿وَكَانُوا يَنْجِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ﴾ -
 ۸۳۔ ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ﴾ -

ترجمہ

- ۷۸۔ اصحاب ایکہ (سرسبزین والے شعیب کی قوم) یقیناً ستمگر قوم تھی۔
 ۷۹۔ ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان دونوں قوم (ثمود اور اصحاب ایکہ) کے تباہ شدہ شہر سر راہ آشکار ہیں۔
 ۸۰۔ اصحاب الحجر (قوم ثمود) نے مرسلین کی تکذیب کی۔
 ۸۱۔ ہم نے ان کے لئے اپنی آیات بھیجیں لیکن انھوں نے اس سے روگردانی کی۔
 ۸۲۔ وہ پہاڑوں کے اندر اپنے امن و امان والے گھر تراشتے تھے۔
 ۸۳۔ لیکن آخر کا (ہلاکت آفرین) چنگھاڑنے صبح کے وقت انھیں آگھیرا۔
 ۸۴۔ اور جو کچھ وہ حاصل کر چکے تھے عذاب الہی سے نجات کے لئے ان کے کام نہ آیا۔

تفسیر

دو ظالم قوموں کا انجام

ان آیات میں قرآن دو گزشتہ اقوام کی سرگزشت کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک کو ”اصحاب الایکہ“ کہ آیا ہے اور دوسری ”اصحاب الحجر“ ان میں گزشتہ آیات قوم لوط کے بارے میں جو عبرت انگیز مباحث آئی ہیں انکی تکمیل کی گئی ہے پہلے ارشاد ہوتا ہے: یقیناً اصحاب ایکہ ظالم اور ستمگر لوگ تھے ﴿وَإِنْ كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ﴾۔^(۱)

اور ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کی ستم گریوں اور سرکشیوں پر انہیں عذاب دیا ﴿فَأَنتَقِمْنَا مِنْهُمْ﴾ -
ان لوگوں کا علاقہ اور قوم لوط کہ جس کی داستان گزر چکی ہے، کی سرزمین تمہارے راستے میں واضح طور پر موجود ہے
﴿وَإِنَّمَا لِبِأَمَامٍ مُّبِينٍ﴾ -

پس آنکھیں کھولو ان کا انجام دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو۔

۱۔ لفظ ”ان“ اس آیت میں شرطیہ نہیں ہے بلکہ ”مثقلہ“ سے ”مخففہ“ ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (انہ کان اصحاب الایکۃ الظالمین)

اصحاب ایکہ کون ہیں؟

بہت سے مفسرین اور ارباب لغت کہتے ہیں کہ ”ایکہ“ کا معنی ہے باہم جڑے ہوئے درخت یا جنگل اور ”اصحاب الایکہ“ وہی قوم شعیب ہے جو حجاز و شام کے درمیان سرسبز و شاداب زمین پر آباد تھی۔

ان کی زندگی بہت خوشحال تھی ان کے پاس فراوان دولت تھی اسی لئے انھیں غفلت و غرور نے گھیر لیا، خاص طور پر وہ کم فروشی اور فتنہ و فساد میں مبتلا ہو گئے، حضرت شعیب علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر نے انھیں متنبہ کیا اور توحید و راہ حق کی دعوت دی لیکن جیسا کہ ہم نے سورہ ہود کی آیات میں دیکھا ہے انھوں نے حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور آخر کار دردناک عذاب کے ذریعہ نیست و نابود ہو گئے کئی روز تک وہ نہایت سخت گرمی کا شکار رہے، آخری روز بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ آسمان پر چھا گئے اور انھوں نے بادل کے سائے میں پناہ لی لیکن ایک زبردست بجلی زمین پر ٹوٹ پڑی اور ظالموں کو نیست و نابود کر گئی۔

شاید قرآن نے ”اصحاب الایکہ“ (درختوں سے بھری ہوئی زمین والے) اس لئے کہا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ یہ سب نعمتیں ہم نے انھیں بخشی تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے شکرانہ نعمت کے بجائے کفران نعمت کیا اور ظلم و ستم کی بنیاد رکھی اور صاعقہ نے انھیں اور ان کے درختوں کو ختم کر دیا۔

ان کے حالات کی مزید تفصیل سورہ شعراء کی آیہ ۱۷۶ تا ۱۹۰ کے ذیل میں حضرت شعیب (علیہ السلام) کے حوالے سے آئے گی۔

ضمناً توجہ رہے کہ ہو سکتا ہے ”فانتقمنا منهم“ (ہم نے انھیں سزا دی) قوم لوط اور ”اصحاب الایکہ“ دونوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس جملے کے بعد فوراً یہ عبارت آئی ہے۔ ”و انھما لبامام مبین“ ان دونوں کا علاوہ تمہارے سامنے آشکار ہے۔

”و انھما لبامام مبین“ کی یہی تفسیر مشہور ہے کہ یہ شہر لوط اور اصحاب الایکہ کے شہر کی طرف اشارہ ہے ”امام“ ”راستہ“ اور ”جادہ“ کے معنی میں ہے۔ (کیونکہ یہ مادہ ”ام“ سے لیا گیا ہے جو قصد کرنے کے معنی میں ہے اور کیونکہ انسان مقصد تک پہنچنے کے لئے راستوں سے گذرتا ہے)۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ”امام مبین“ سے مراد لوح محفوظ ہے اس کے لئے انھوں نے سورہ یس کی آیہ ۱۲ کو قرینہ کے طور پر پیش کیا ہے لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید ہے کیونکہ قرآن چاہتا ہے کہ لوگوں کو درس عبرت دے اور یہ دونوں نام لوح محفوظ میں ہوں تو لوگ ان سے اثر لے سکتے ہیں۔

جبکہ یہ شہر قافلوں اور پاس سے گزرنے والے مسافروں کے راستے میں ہوں تو ان پر گہرا اثر مرتب کر سکتے ہیں وہ ایک لمحہ کے لئے وہاں رک جائیں، غور و فکر کریں ان کا عبرت میں دل اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس آفت زدہ زمین کو آئینہ عبرت سمجھے کبھی قوم لوط کی سرین کے پاس اور کبھی اصحاب ایکہ کے علاقے کے نزدیک اور آخر ان کے انجام پر آنکھیں سے سیلاب اشک بہائیں۔

رہے ”اصحاب الحجر“ تو یہ وہی سرکش قوم ہے کہ جو حجر نامی علاقے میں رہتی تھی، بہت خوش حال تھی۔ ان کے عظیم پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام ان کے ہدیت کے لئے مبعوث ہوئے۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

اصحاب حجر نے خدا کے بھیجے ہوؤں کی تکذیب کی ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ﴾۔

اس کے بارے میں یہ شہر کہاں واقع ہے، بعض مفسرین اور مورخین نے لکھا ہے کہ یہ شہر مدینہ اور شام کے درمیان قافلوں کی راہ میں ”وادی القریٰ“ میں ”تیمہ“ کے جنوب میں پڑتا تھا، اور تقریباً اس کا کوئی اثر نشان باقی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ شہر گزشتہ زمانے میں عربوں کے تجارتی شہروں میں سے تھا یہ شہر اتنا اہم تھا کہ بطلمیوس نے تجارتی شہروں میں لکھا ہے اور روم کے معروف جغرافیہ دان پلین نے اس کا نام ”حجرى“ لکھا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہجرت کے نویں سال جب رسول ﷺ نے لشکر روم کے مقابلے کے لئے تبوک کی طرف لشکر کشی کی تو مجاہد اسلام اس مقام پر ٹھہرنا چاہتے تھے، پیغمبر اکرم ﷺ نے منع کیا اور فرمایا:

یہ وہی قوم ثمود کا علاقہ ہے جس پر عذاب الہی نازل ہوا تھا۔^(۱)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن اصحاب الحجر کے بارے میں (اور اسی طرح قوم نوح، قوم شعیب اور قوم لوط کے بارے میں شورہ شعراء کی آیات ۱۰۵، ۱۲۳، اور ۱۶۰ میں بالترتیب اور دیگر گزشتہ قوموں کے بارے میں) کہتا ہے کہ انھوں نے ”پیغمبروں کی تکذیب کی“ حالانکہ ظاہراً ان کے پاس ایک سے زیادہ پیغمبر نہیں آئے اور انھوں نے صرف اسی کی تکذیب کی تھی۔

یہ تعبیر شاید اس بناء پر ہو کہ انبیاء کا پرگرام اور ہدف اس طرح سے ایک دوسرے سے پیوستہ تھا کہ ان میں سے ایک کی تکذیب ان سب کی تکذیب تھی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان قوموں کے کئی پیغمبر تھے جن میں سے ایک زیادہ معروف تھا لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال قرآن اصحاب الحجر کے بارے میں اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے ان کے لئے اپنی آیات بھیجیں لیکن انھوں نے روگردانی کی ﴿وَأَتَيْنَاهُمُ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ﴾۔

لفظ ”اعراض“ (منہ پھیرنا) نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ان آیات کو سننے یا ان پر نگاہ ڈالنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ جبکہ اس کے برعکس اپنی دنیاوی زندگی کے کاموں میں اس قدر سخت گوش تھے ”اپنے لئے پہاڑوں میں امن کے گھر تراشتے تھے“ ﴿وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ﴾۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ ان کا علاقہ کوہستانی تھا نیز یہ کہ ان کا مادی تمدن ترقی یافتہ تھا جیسا کہ وہ پہاڑوں میں اپنے لئے امن کے گھر تراشتے تھے کہ جو طوفانوں، سیلابوں بلکہ زلزلوں تک کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ انسان دنیا کی چند روزہ زندگی کے لئے اتنے محکم کام کرتا ہے لیکن اپنی ابدی زندگی کے بارے میں اس قدر تساہل سے کام لیتا ہے کہ خدا کی بات سننے اور اس کی آیات پر نظر ڈالنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔

تو اب ایسی قوم کے بارے میں کیا توقع کی جا سکتی ہے سوائے اس کے کہ ان کے لئے ”انتخاب“ اصلح الہی کا قانون حرکت میں آئے اور ایسی قوموں کو جو پوری طرح فاسد و مفسد ہو چکی ہیں انھیں جینے کا حق نہ دیا جائے اور تباہ کن عذاب کے ذریعے انھیں نابود کر دیا جائے۔

اسی لئے قرآن کہتا ہے: آخر کار آسمانی چیخ نے دم صبح انھیں آلیا ﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ﴾۔

یہ چیخ بجلی کی ہولناک آواز تھی جو ان کے گھروں میں آگرمی یہ اس قدر تباہ کن اور وحشت ناک تھی کہ اس نے ان کے بے جان جسموں کو زمین پر پھینک دیا اس بات کی شاہد سورہ حم سجدہ کی آیہ ۱۳ ہے۔

فاعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل عاد و ثمود

یہ کفار منہ پھیریں تو کہہ دو کہ میں تمہیں ایسی بجلی گرنے سے ڈرتا ہوں بجلی قوم عاد و ثمود پر گری۔

ان کے فلک بوس پہاڑ، امن و امان کے گھر، اس سرکش قوم کے طاقتور جسم اور ان کی بہت زیادہ دولت و ثروت کوئی چیز بھی عذاب الہی کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ لہذا ان کی داستان کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جو کچھ ان کے ہاتھ میں تھا وہ انھیں عذاب الہی سے بچا نہ سکا ﴿فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾۔

سورہ شعراء میں آیہ ۱۴۱ تا ۱۵۸ میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جو انشاء اللہ ان آیات کی تفسیر میں آئیں گے۔

آیات ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱

۸۵۔ ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ فَاصْصَفْ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾۔

۸۶۔ ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ﴾۔

۸۷۔ ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمُنَاقِبِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾۔

۸۸۔ ﴿لَا تُمَدِّنْ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَخَفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾۔

۸۹۔ ﴿وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ﴾۔

۹۰۔ ﴿كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ﴾۔

۹۱۔ ﴿الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ﴾۔

ترجمہ

۸۵۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے ہم نے بغیر حق کے پیدا نہیں کیا اور وعدہ کی گھڑی (قیامت) یقیناً آکے رہے گی ان دشمنوں سے اچھی طرح صرف نظر کر (اور انھیں ان کی نادانیوں پر ملامت نہ کر)

۸۶۔ تیرا پروردگار پیدا کرنے والا آگاہ ہے۔

۸۷۔ ہم نے تجھے سورہ حمد اور قرآن عظیم دیا ہے۔

۸۸۔ (لہذا) ان (کفار) میں سے کچھ گروہوں کو جو (مادی) نعمتیں دی ہیں ان پر ہرگز نگاہ نہ ڈال اور جو کچھ ان کے پاس

ہے اس پر غمگین نہ ہو اور اپنے پروبال مومنین کے لئے جھادے۔

۸۹۔ اور کہہ دوے کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں۔

۹۰۔ (ہم ان پر عذاب نازل کریں گے) جیسے ہم نے (آیات الہی کو) تقسیم کرنے والوں پر نازل کیا ہے۔

۹۱۔ وہی لوگ جنہوں نے قرآن کو تقسیم کر دیا ہے (جو کچھ ان کے مفاد میں تھا قبول کر لیا ہے اور جو کچھ ان کی ہوا

ہوس کے خلاف تھا اسے ترک کر دیا ہے)۔

تفسیر

تقسیم اور نکتہ چینی کرنے والے:

انسان ہمیشہ سے ایک صحیح آئیڈیالوجی اور عقیدہ نہ ہونے کی مصیبت میں گرفتار رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ مبداء و معاد کے نظریے کا پابند نہیں رہا، قوم لوط، قوم شعیب اور قوم صالح جیسی قومیں کہ جو اس ابتلاء میں گرفتار تھیں کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اب قرآن مسئلہ توحید اور معاد کی طرف لوٹتا ہے اور ایک ہی آیت میں ان دونوں امور کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے ہم نے بغیر حق کے پیدا نہیں کیا ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ﴾۔ ان پر جو نظام حاکم ہے وہ بھی حق ہے اور ان کا مقصد تخلیق بھی حق ہے لہذا یہ عجیب و غریب نظم و نسق اور دقیق و منظم آفرینش دانا و توانا خالق پر واضح دلیل ہے کہ وہ بھی حق ہے بلکہ حقیقت حق وہی ہے اور ہر حق اسی وقت تک حق ہے جب تک اس کے وجود بے پایاں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور جو کچھ اس کے سوا ہے اور اسے تعلق نہیں رکھتا وہ باطل و فضول ہے۔

یہ توحید کے بارے میں تھا۔ اس کے بعد معاد اور قیامت کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ وعدہ کی گھڑی (قیامت) آخر کار آکے رہے گی ﴿وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ﴾۔ اگرچہ دیر سے آئے، آخر کار ضرور آئے گی۔

بعید نہیں کے پہلا جملہ دوسرے جملے کی دلیل کے طور پر ہو کیونکہ یہ وسیع و عریض جہان تبھی حق ہو گا جب صرف یہ چند روزہ دکھ درد سے بھری ہوئی زندگی کے لئے نہ پیدا کیا گیا ہو بلکہ اس کے لئے کوئی ایسا نہایت اعلیٰ ہدف پیش نظر ہو جو اس عظیم آفرینش کی توجیہ کر سکے۔ لہذا آسمان و زمین اور عالم ہستی کا حق ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آگے قیامت اور معاد موجود ہے ورنہ آفرینش و خلقت فضول تھی (غور کیجئے گا)۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ ان کی ہٹ دھرمیوں نادانیوں، تعصب، کار شکنیوں اور سخت سے سخت مخالفوں کے باوجود ملائمت اور محبت کا مظاہرہ کرو ”اور ان کے گناہوں سے صرف نظر کرو اور انہیں بخش دو، خوبصورتی کے ساتھ جس بخشش میں ملامت تک نہ ہو ﴿فَاصْفَحْ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ﴾۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں مبداء اور معاد کا عقیدہ راسخ کرنے کی دعوت کے لئے تمہارے پاس واضح دلیل موجود ہے لہذا تمہیں سختی اور خشونت کی کوئی ضرورت نہیں۔ منطق و عقل تمہارے پاس ہے علاوہ ازیں جاہلوں کے ساتھ سختی سے تعصب ہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

”صفحہ“ ہر چیز کے چہرے کو کہتے ہیں مثلاً صفحہ صورت^(۱)

اسی لئے ”فاسخ“ منہ پھیرنے اور صرف نظر کرنے کے معنی میں آیا ہے اور کسی سے منہ پھیرنا چونکہ بعض اوقات بے اعتنائی، اظہار ناراضگی وغیرہ کے لئے ہوتا ہے اور بعض اوقات بزرگانہ عفو و درگزر کے لئے اس لئے زیر بحث آیت میں فوراً اسے لفظ ”جمیل“ کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے تاکہ دوسرا معنی دے سکے

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا:
العفو من غیر عتاب

اس سے مراد مواخذہ اور سرزنش کے بغیر عفو و درگزر ہے۔^(۲)

ایسی ہی ایک حدیث امام زین العابدین علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔^(۳)

اگلی آیت، جیسا کہ آپ مفسرین نے لکھا ہے درحقیقت درگزر اور ”فاسخ“۔ ”جمیل“ کے لئے ضروری ہونے کی دلیل کے طور پر ہے ارشاد ہوتا ہے: تیرا پروردگار پیدا کرنے والا اور آگاہ ہے۔ ﴿إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ﴾۔

وہ جانتا ہے کہ تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہیں وہ ان کے اندرونی اسرار، میلانات، سطح فکر اور مختلف قسم کے احساسات و جذبات سے باخبر ہے ان سب سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ ایک جیسے ہوں بلکہ ان سے عفو و درگزر سے جذبے سے پیش آؤ تاکہ تدریجاً ان کی تربیت ہو اور وہ راہ حق کی طرف آئیں۔

البتہ اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ اپنے طرز عمل اور اعمال میں مجبور ہیں بلکہ یہ صرف ایک تربیتی قانون کی طرف اشارہ ہے اور یہ فکر و نظر اور صلاحیتوں میں اختلاف کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض کا یہ خیال ہے کہ حکم رسول اللہ کی ملکی زندگی سے مخصوص ہے اور آپ کی مدینہ ہجرت کے بعد جب مسلمان کچھ طاقتور ہو گئے تو اس کی جگہ جہاد کے حکم نے لے لی لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ حکم مدنی سورتوں میں بھی آیا ہے (مثلاً سورہ بقرہ، سورہ نور، سورہ تغابن اور سورہ مائدہ کہ جن میں سے بعض میں رسول اللہ کو صفح و عفو کا حکم دیا گیا ہے اور بعض میں مومنین کو) واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک عمومی اور ابدی حکم ہے اور اتفاقاً یہ حکم جہاد کے حکم کے منافی نہیں کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہے ایک مقام پر عفو و درگزر کے ذریعے آگے بڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں عفو و درگزر سے دوسرے کی جرات و جسارت اور بڑھ جائے اور وہ اس سے سوء استفادہ کرے تو وہاں شدت عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ کی دلجوئی کی گئی ہے اور انھیں تسلی دی گئی ہے کہ دشمنوں کی سختی، کثرت اور فراوان مادی وسائل سے ہرگز پریشان نہ ہوں، کیونکہ خدا نے خود پیغمبر پر وہ انعامات کئے ہیں جن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتی، فرمایا گیا ہے : ہم نے تجھے سورہ حمد اور عظیم قرآن دیا ہے ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾۔

ہم جانتے ہیں کہ ”سبع“ کا معنی لغت میں ”سات“ ہے اور ”متعدد“ ”دو دو“ کو کہتے ہیں بہت سے مفسرین نے اور روایات میں ”سبع من المثنائی“ کو سورہ حمد کے لئے کنایہ مراد لیا ہے کیونکہ مشہور قوم کے مطابق سورہ حمد سات آیات پر مشتمل ہے اور اس لئے کہ اس کی اہمیت اور اس کے مضامین کو عظمت بہت زیادہ ہے یہ دو مرتبہ رسول اللہ پر نازل ہوئی یا یہ کہ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے آدھا خدا کی حمد و ثنا اور آدھا حصہ بندوں کی طرف سے تقاضا و التجاء ہے یا یہ کہ یہ ہر نماز میں دو مرتبہ پڑھی جاتی ہے ان پہلوؤں کے پیش نظر اس پر لفظ ”مثنائی“ یعنی کئی دو دو کا اطلاق ہوا ہے (۴)

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ”سبع“ قرآن کی ابتدائی بڑی سات سورتوں کی طرف اشارہ ہے اور مثنائی خود قرآن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قرآن رسول اللہ پر دو مرتبہ نازل ہوا ایک مرتبہ سارے کا سارا اکٹھا اور ایک مرتبہ تدریجاً ضرورت کے ماتحت مختلف اوقات میں، اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا: پورے قرآن کی سات اہم سورتیں ہیں۔ ان مفسرین نے سورہ زمر کی آیہ ۲۳ کو بھی اس مفہوم کے لئے شاہد قرار دیا ہے ارشاد خداوندی ہے:-

﴿اللَّهُ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانً﴾

خدا وہی ہے جس نے بہترین حدیث کو نازل فرمایا کہ جس کے مضامین و مفہیم ہم آہنگ اور ایک دوسرے سے مشابہ ہیں وہ کتاب کہ جو دو مرتبہ نازل ہوئی۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے خصوصاً ان بہت سے روایات کی بنا پر جو اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں جن میں اس کا مطلب سورہ حمد بتایا گیا ہے۔

مفردات میں راغب میں لفظ ”مثنائی“ قرآن کا پہلا اطلاق اس لحاظ سے صحیح جاننا کہ اس کی آیات بار بار پڑھی جاتی ہیں اور یہی تجوید و تکرار قرآن کو حوادث سے محفوظ رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر زمانے میں حقیقت قرآن کا نیا تکرار اور نئی تجلی سامنے آتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے مثنائی کہا جائے۔

بہر حال سورہ حمد کے بعد قرآن عظیم کا ذکر جب کہ سورہ حمد بھی اس کا جزو ہے اس سورہ کی اہمیت و عظمت کی دلیل ہے کیونکہ اکثر ہوتا ہے کہ کسی چیز کے ایک حصے کا ذکر اس کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کی وجہ سے کیا جاتا ہے ایسا عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے یہ حقیقت بیان کرتا ہے تو ایسے عظیم سرمایہ کا حامل ہے قرآن جیسا سرمایہ جو تمام عالم ہستی کی عظمت رکھتا ہے وہ سرمایہ جو سراسر نور، برکت، درس اور لائحہ عمل ہے راہیں کھولنے والا ہے۔ خصوصاً سورہ حمد کہ جس کا مفہوم اور مضمون اس قدر بلند ہے کہ لحظہ بھر میں انسان کا رشتہ خدا سے جوڑ دیتا ہے اور اس کی روح کو خدا کے آستانہ پر تعظیم و تسلیم اور راز و نیاز کے لئے ایستادہ کر دیتا ہے۔

اس عظیم نعمت کا تذکرہ کرنے کے بعد پیغمبر اکرم کو چار حکم دئے گئے ہیں۔ پہلے فرمایا گیا ہے: یہ مادی نعمتیں جو ہم نے کافروں دی ہیں ان پر ہرگز نگاہ نہ ڈالنا ﴿لَا تَمْدَنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ﴾^(۵)

یہ مادی نعمتیں پایہ دار نہیں ہوتی ہیں اور پھر درد سر بھی ہیں یہاں تک کہ اچھے حالات میں بھی انسان کے لئے ان کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے لہذا یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو تیری آنکھوں کو متوجہ کرے۔ ان کے مقابلے میں عظیم روحانی نعمت قرآن جو خدا نے تجھے دی ہے وہ بہت اہم ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ مال و ثروت اور مادی نعمتیں ان کے ہاتھ میں ہیں اس پر ہرگز غمگین نہ ہو ﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾۔

در حقیقت پہلا حکم مادی نعمتوں کی طرف آنکھ نہ اٹھانے کے لئے ہے اور دوسرا ان سے محرومی پر غم نہ کھانے کے لئے ہے۔

”﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ﴾“ کی تفسیر کے بارے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے:

اگر وہ تجھ پر ایمان نہیں لاتے تو غم نہ کھاؤں کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

لیکن اگر پہلی تفسیر قبل کے جملوں کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

بہر حال سوہ طہ آیہ ۱۳۱ میں اس کی واضح نظر موجود ہے۔

﴿لَا تَمْدَنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَ رِزْقَ فِيهِ وَ رِزْقَ بَكَ خَيْرٌ وَ ابْقَىٰ﴾

ان میں سے بعض کو نعمتیں دی ہیں ان پر نظر نہ ڈال یہ دنیاوی زندگی کے پھول ہیں (ناپائیدار پھول، جو بہت جلد مر جھا کر بکھر جائیں گے) لہذا ہم چاہتے ہیں کہ انھیں اس کے ذریعہ آزمائیں۔ خدا نے جو تجھے روزی دی ہے وہ تیرے لئے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

تیسرا حکم تواضع، فروتنی اور مومنین سے نرمی کرنے کے بارے میں ہے فرمایا گیا ہے: اپنے بال و پر مومنین کے لئے پھیلا دے اور نیچے جھکا لے ﴿وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾۔

یہ تعبیر تواضع اور محبت کے لئے خوبصورت ہے جیسے پرندے اپنے بچوں سے اظہار محبت کرتے ہیں انھیں اپنے پروبال کے نیچے چھپا لیتے ہیں یہ انتہائی محبت کا منظر ہوتا ہے اس طرح وہ دشمنوں سے انھیں بچا لیتے ہیں اور بکھر جانے سے روکتے ہیں دراصل کنایہ کی صورت میں یہ چچی تلی مختصر تعبیر بہت سے مطالب کی حامل ہے۔

ضمناً مذکورہ احکام کے بعد یہ جملہ ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ مبادا مادی نعمتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے کافروں سے انکساری کرو یہ انکساری اور محبت مومنین کے لئے ہونا چاہئیے اگرچہ مال دنیا دے ان کا ہاتھ خالی ہو۔

آخر میں پیغمبر اکرم کو چوتھا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان بے ایمان دولت مندوں کے مقابلے میں مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ اور انھیں کھلے بندوں کہہ دو کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں ﴿وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ﴾۔

کہہ دو کہ میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں تم پر عذاب نازل کروں گا جیسے کہ میں نے تقسیم کرنے والے نازل کیا ہے ﴿كَمَا أُنزَلْنَا عَلَى الْمُفْتَسِمِينَ﴾۔ وہی تقسیم کرنے والے جنہوں نے آیات الہی کو بانٹ دیا ﴿الَّذِينَ

جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ﴾ (۴)

جو کچھ ان کے مفاد میں تھا وہ لے لیا اور جو کچھ ان کے نقصان میں تھا اسے ایک طرف رکھ دیا۔ درحقیقت ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ کتاب خدا اور اس کے احکام ان کے رہبر و راہنما ہوتے اسے انھوں نے اپنے برے مقاصد کے لئے وسیلہ بنا لیا۔ ایک لفظ ان کے مفاد میں ہوتا ہے اس سے چمٹ جاتے اور ہزار الفاظ ان کے ضرر میں ہوتے تو انھیں ایک طرف رکھ دیتے۔

۱۔ قاموس میں فیروز آبادی نے لکھا ہے نہاڑ کا دامن، تلوار پہنائی اور چوڑائی اور صورت کو بھی ”صفحہ“ کہتے ہیں۔ نیز کسی چیز کے کنارے اور چہرے کو بھی ”صفحہ“ کہتے ہیں۔

۲۔ نور الثقلین، ج ۳، ص ۲۷۔

۳۔ نور الثقلین، ج ۳، ص ۲۷۔

۴س۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی ایک حدیث میں ہے:

خدا فرماتا ہے: میں نے نماز (سورہ حمد) اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصہ مجھ سے مربوط ہے ہے دوسرا بندوں سے۔ (مجمع البیان، جلد ۱، صفحہ ۱۷۔)

۵۔ ’ازواجاً‘ متعناً‘ کا مفعول ہے اور ’منہم‘ ایک عمومی مقدر فعل کے متعلق جار مجرور ہے اور اس سارے کا معنی ہوگا۔ ’کفار کے مختلف گروہ

۶۔ ’عضین‘ ’عضۃ‘ کی جمع ہے جس کا معنی ہے ’متفرق‘ کسی چیز کے حصہ کو بھی ’عضۃ‘ کہتے ہیں لہذا ’عضین‘ کا معنی ہوا ’حصے‘ یا ’ٹکڑے‘۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآن کریم خدا کی عظیم نعمت ہے

زیر نظر آیت میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو خطرے سے خبردار کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب اور بہت بڑا سرمایہ ہے یہ ایک بے نظیر نعمت ہے جو مسلمانوں کو دی گئی یہ ایک ایسا جاودانی پروگرام ہے جس پر عمل کیا جائے تو دنیا آباد و آزاد ہو جائے۔ اور امن و امان اور معنویت سے معمور ہو جائے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے دوسرے لوگ بھی معترف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان اس کے معارف زندہ کرتے اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تو اتنا طاقتور اور ترقی یافتہ ہوتے کہ کوئی ان پر اپنا تسلط نہ جما سکتا۔

یہ سورہ حمد سبعا من المثانی کہ جو فاتحہ الکتاب، آغاز قرآن کرنے والی ہے اور فہرست قرآن کہلاتی ہے، ایک مکمل درس حیات ہے۔

اس عظیم مبداء کی طرف توجہ کہ جو عام عالمین کی راہ تکامل میں پرورش کرتا ہے جس کی خاص اور عام رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے۔

اس عدالت کی طرف توجہ کہ جس پر ایمان انسان کے اعمال کو پوری طرح سے کنٹرول کر لیتا ہے۔
غیر اللہ پر بھروسہ نہ کرنا اور اس کے غیر کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا۔

مختصر یہ کہ صراط مستقیم پر قدم رکھنا جس میں انحراف نہیں، وہ راستہ جو مشرق کی طرف خم کھاتا ہے نہ مغرب کی طرف، جس میں افراط و تفریط ہے نہ گمراہی اور نہ ہی غضب الہی۔

یہ سب جب انسان کی روح میں رچ بس جائیں تو ایک اعلیٰ اور باکمال شخصیت بنانے کے لئے کافی ہے۔
لیکن افسوس یہ عظیم سرمایہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جا پڑا ہے کہ جنہیں اس کی گہرائی پتہ چلا ہے نہ اس کی علیٰ و قدرو قیمت کا۔

یہاں تک کہ بعض ایسے ناگاہ لوگ بھی ہیں کہ اس کی آیات کو چھوڑ کر ایسے انسانوں کے گھڑے ہوئے قوانین اور پروگرام کی طرف دستِ نیاز پھیلاتے ہیں جو خود اسیر شہوت ہیں کم از یہ کہ جن کی فکر ناپختہ اور نارسا ہے یا وہ کہ جو اپنا

علم نجس دولت اور حقیر قیمت پر فروخت کرتے ہیں یا دوسروں مادی تمدن کی تھوڑی سی ترقی ان کی توجہ کو اس طرح سے کھینچتی ہے کہ جو خود ان کے پاس ہے اس سے غافل ہو جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم مادی ترقی کو بالکل اہمیت نہ دیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ سبھی کچھ اسے نہ سمجھیں اور قرآن نہ صرف روحانی لحاظ سے ایک پر بار اور عظیم سرچشمہ ہے بلکہ مادی ترقی اور خوشحالی کا بھی موثر پرگرام ہے اس سلسلہ میں ہم پہلے بھی متعلقہ آیات میں توضیح کر چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کریں گے۔

۲۔ دوسروں کے وسائل پر نگاہ رکھنا انخطاط کا باعث ہے

بہت سے تنگ نظر افراد ایسے ہیں جو ہمیشہ اسی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اس کے پاس کیا ہے؟ یہ لوگ مسلسل مادی حالت کا دوسروں سے تقابلی کرتے رہتے ہیں اور جب اپنے آپ کو کم پاتے ہیں تو رنج و غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں چاہے دوسروں نے یہ وسائل اپنی انسانی قدر و قیمت اور اپنا استقلال گنوا کر حاصل کئے ہوں۔

یہ طرز فکر رشد کی کمی، احساس کمتری اور کم ہمتی کی نشانی ہے۔ یہ زندگی میں پسماندگی اور تنزل کا سبب ہے یہاں تک کہ مادی زندگی کو بھی اس کا بہت منفی اثر ہوتا ہے بجائے اس کے انسان ایسے گھٹیا اور نقصان دہ تقابل میں پڑے اپنی فکری اور جسمانی صلاحیتوں کو اپنی رشد و ترقی کے لئے استعمال کرے اور اپنے آپ کہے کہ میں دوسروں سے کم تر نہیں ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ میں ان سے زیادہ ترقی نہ کر سکوں میں کیوں ان کے مال و مقام پر آنکھ رکھوں میں ان سے بہتر حاصل کر سکتا ہوں۔

مادی زندگی کا زندگی کا ہدف ہر گز نہیں، ایک صحیح انسان مادی وسائل یا تو اس قدر چاہتا ہے جو اس کی روحانیت کے لئے مددگار ہوں یا جس قدر اس کی آزادی اور استقلال کی حفاظت کر سکیں نہ کہ وہ حریصانہ ان کے پیچھے بھاگتا ہے اور نہ ہی ان کے بدلے سب کچھ قربان کر دیتا ہے کیونکہ ایسا سودا اصرار اور بندگان خدا نہیں کرتے وہ ایسا کام بھی نہیں کرتے جس میں دوسروں کے محتاج ہوں۔ پیغمبر اکرم سے مروی ایک حدیث میں ہے:-

من رمی ببصرہ مافی ید غیرہ کثر ہمہ ولم یشف غیضہ

جو شخص اس پر نظر جائے رکھے جو دوسروں کے پاس ہے وہ ہمیشہ غمگین رہے گا اور اس کے دل کی آتش غضب کبھی نہیں بجھے گی۔^(۱)

۳۔ رہبر کی انکساری

آیات قرآن میں بارہا پیغمبر اکرم کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ مومنین سے تواضع، مہربانی، نرمی اور ملائمت سے پیش آئیں یہ امر پیغمبر اسلام کے لئے منحصر نہیں ہے۔ بلکہ جو شخص بھی وسیع یا محدود لوگوں میں رہبری کا فریضہ اپنے ذمہ لے اسے چاہیے کہ اس پر کاربند رہے کیونکہ یہ حقیقی قیادت اور تنظیمی اصولوں میں سے ہے اس لئے ایک رہبر کا بہت بڑا سرمایہ اس کے پیروکاروں کا اس سے محبت کرنا اور اس سے روحانی رشتہ ہے اور یہ تواضع، لئساری اور خیر خواہی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ رہبروں کی سختی اور فسادات ہمیشہ لوگوں کے ان کے گرد و پیش سے متفرق اور منتشر ہونے کا ایک ہی اہم عامل ہوتے ہیں۔

امیر المومنین (علیہ السلام)، محمد بن ابی بکر کو اپنے ایک خط میں اس طرح فرماتے ہیں:

فاخفض لهم جناحك و الن لهم جانبك و ابسط لهم وجهك و آس بينهم في اللحظة و النظرة

اپنے پروبال اس کے لئے جھکا دے، ان سے نرمی سے پیش آ، کشادہ رو رہ اور ان کے درمیان نظر کرنے میں بھی

مساوات اور برابری کو ملحوظ رکھ۔^(۱)

۴۔ ”مقسطین“ کون ہیں؟

بلاشبہ خدائی احکام اور پروگرام سب لوگوں کے مفاد میں ہوتے ہیں لیکن ظاہراً اور ابتدائی نظر میں عام طور ان میں سے بعض ہماری رغبت اور خواہش کے مطابق ہیں اور بعض برخلاف ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں سچے مومن تو ان سب کو کاملاً قبول کر لیتے ہیں یہاں تک کہ جو احکام ظاہراً ان کے فائدے میں انہیں بھی قبول کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کل من عند ربنا

سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔

یہ احکام الہی میں کسی قسم کی تقسیم اور تبعیض کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ لوگ کہ جن کے دل بیمار ہیں اور وہ یہ تک چاہتے ہیں کہ دین حکم خدا کو بھی اپنے مفادات کے لئے استعمال کریں وہ صرف وہی حصہ قبول کرتے ہیں جو ان کے فائدے میں اور باقی پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ آیات قرآن کو بلکہ بعض اوقات ایک ہی آیت کو تقسیم کر دیتے ہیں اور ایک حصہ جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا ہے اسے قبول کر لیتے ہیں اور دوسرے حصے کو ایک طرف پھینک دیتے ہیں۔ یہ بات باعث فخر نہیں کہ ہم بعض گزشتہ قوموں کی طرح یہ راگ لائیں :-

نؤمن ببعض و نکفر ببعض

ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض پر نہیں۔

کیونکہ تمام دنیا پرست یہی کچھ کرتے ہیں۔ پیروان حق اور پیروان باطل میں یہی فرق ہے کہ پیروان باطل میں یہی میں فرق ہے کہ پیروان باطل احکام کے اسی حصے کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں جو ان کی خواہشات، ہوا و ہوس اور ظاہری مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ مقام ہے جہاں کھرا اور کھوٹا اور مومن اور منافق پہچانا جاتا ہے۔

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اس کے علاوہ بھی ”مقسطین“ کی کچھ تفاسیر علماء نے ذکر کی ہے ہیں یہاں تک کہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس لفظ کی سات تفسیر بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ تر غیر مناسب نظر آتی ہیں لیکن بعض جو غیر مناسب نہیں ہیں ان میں سے ایک ہم یہاں ذکر کرتے ہیں مشرکین کے کچھ سردار ایام حج میں مکہ کی سڑکوں اور کوچوں کے کنارے کھڑے ہو جاتے تھے ان میں سے ہر ایک گزرنے والوں سے رسول اللہ اور قرآن کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات کرتا تاکہ انہیں متنفرد کریں۔

بعض کہتے : وہ دیوانہ ہے جو کچھ کہتا ہے غیر موزوں ہوتا ہے۔

بعض کہتے: وہ جادو گر ہے اور اس کا قرآن بھی اس کے جادو کا ایک حصہ ہے۔
بعض آپ کو شاعر کہتے: آیات آسمانی کے جاں نواز آہنگ اور لہجے کو کذب اور جھوٹی شاعری قرار دیتے۔
بعض آپ کو کاہن کا نام دیتے اور قرآن کی غیب کی خبروں کو ایک طرح کی کہانت قرار دیتے۔
انہیں ”مقتسمین“ کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے مکہ کی سڑکوں اور گلیوں کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تقسیم کر رکھا تھا۔

کوئی مانع نہیں کہ یہ تفسیر اور جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے دونوں آیت کے مفہوم میں شامل ہوں۔

آیات ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹

۹۲۔ ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾

۹۳۔ ﴿عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

۹۴۔ ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾۔

۹۵۔ ﴿إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ﴾۔

۹۶۔ ﴿الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾۔

۹۷۔ ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ﴾۔

۹۸۔ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ﴾۔

۹۹۔ ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾۔

ترجمہ

۹۲۔ تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب سے سوال کریں گے۔

۹۳۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

۹۴۔ جس چیز کے لئے مامور ہو اسے واضح طور پر بیان کرو اور مشرکین سے رخ پھیر لو (اور ان کی پروا نہ کرو)۔

۹۵۔ ہم تمہیں اڑانے والوں کے شر سے دور رکھیں گے۔

۹۶۔ وہ کہ جنہوں نے خدا کے ساتھ اور خدا بنا رکھے ہیں لیکن وہ جلدی ہی جان جائیں گے۔

۹۷۔ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ کہتے ہیں اس پر تیرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے (اور تجھے سخت پریشان کرتے ہیں)۔

۹۸۔ (اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے) اپنے پروردگار کی تسبیح کر، حمد و ثنا کر اور سجدہ گزاروں میں سے ہو جا۔

۹۹۔ اپنے پروردگار کی عبادت کر یہاں تک کہ یقین (موت) آجائے۔

تفسیر

اپنے مکتب واضح طور پر بیان کرو

یہ سورہ کی آخری آیات میں ہیں کہ ان سے سے پہلے ”مقسمین“ کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ جزا کے بارے میں گزشتہ آیات میں گفتگو ہوئی تھی۔ فرمایا گیا ہے: تیرے پروردگار کی قسم! ہم یقینی طور پر ان سب سے سوال کریں گے ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ﴾۔

ان تمام کاموں کے بارے میں جو ہم انجام دیتے تھے۔ ﴿عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾۔

واضح ہے کہ خدا کا سوال اس لئے نہیں کہ وہ پوشیدہ بات ظاہر ہو جائے کیونکہ وہ اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور زمین و آسمان کا کوئی ذرہ اس کے علم کے بے پایاں سے مخفی نہیں ہے۔ لہذا سوال خدا مخاطب کو سمجھانے کے لئے ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کی قباحت کو سمجھ لے یا یہ ایک قسم کی نفسیاتی سزا ہے کیونکہ غلط کاموں کے بارے میں باز پرس اور وہ بھی سرزنش اور ملامت کے ساتھ اور وہ بھی ایسے جہان میں انسان حقائق سے زیادہ قریب اور آگاہ ہے بہت تکلیف دہ ہے۔ لہذا یہ سوالات درحقیقت ان کی سزا کا ایک حصہ ہیں۔

ضمنی طور پر ”﴿عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾“ کی عمومیت نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کے تمام اعمال کے بارے میں بلا استثناء سوال ہوگا اور خود تمام انسانوں کے لئے ایک درس ہے کہ وہ لحظہ بھر بھی اپنے اعمال اعمال سے غافل نہ رہیں۔۔۔ یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ سوال توحید اور انبیاء پر ایمان لانے یا مشرکین کے معبودوں سے مربوط ہے ایک ایسی بات ہے جو بغیر دلیل کے ہے، آیت کا مفہوم پورے طور پر عمومیت کا حامل ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ سوال کرنے کے بارے میں تاکید کر رہا ہے جبکہ سورہ رحمن کی آیہ ۳۹ میں ہے: ﴿فِيَوْمَئِذٍ لَا يَسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌ﴾

اس روز انسان اور جنوں میں سے کسی سے بھی کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔

اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت میں کئی مراحل ہیں بعض مراحل میں لوگوں میں سے سوال ہوگا اور بعض میں نہیں ہوگا جہاں مسائل خود بخود واضح ہوں گے یا یہ کہ زبانی سوال نہیں ہوگا کیونکہ سورہ یس کی آیت ۶۵ کے مطابق لبوں پر مہر لگی ہوگی اور سوال صرف جسم کے اعضاء سے کیا جائے گا یہاں تک کہ بدن کی کھال سے بھی پوچھا جائے گا۔^(۱)

اس کے بعد رسول اللہ کو ایک قطعی فرمان دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: مشرکین کے شور و غل کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ ضعف و خوف اور سستی کو نہ آنے دو اور خاموش ہو کر نہ بیٹھ جاؤ بلکہ ”جس کام کے لئے مامور کئے گئے ہو اسے واضح طور پر بیان کرو“۔ اور حقائق دین صراحت سے کہہ دو ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾۔

اور مشرکین سے رخ موڑ لو اور ان سے بے اعتنائی کرو ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾۔

”فاصدع“ ”صدع“ کے مادہ سے ہے اس کا لغوی معنی ہے شگاف کرنا یا مضبوط چیزوں میں شگاف کرنا اور چونکہ کسی چیز میں شگاف کرنے سے اسکا اندرونی حصہ آشکار ہو جاتا ہے اس لئے یہ لفظ اظہار، افشاء، آشکار اور واضح کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ شدید درد سر کو بھی ”صداع“ کہتے ہیں کیونکہ ایسا لگتا ہے جیسے وہ پھٹ رہا ہو اور شگافتہ ہو رہا ہو۔

بہر حال مشرکین سے اعراض کرنا یہاں یا تو بے اعتنائی کے معنی میں آیا ہے یا پھر ان سے جنگ ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے کیونکہ اس زمانے میں ابھی مسلمان اس مرحلے تک نہیں پہنچے تھے کہ دشمن کی سختی کے جواب میں مسلح مقابلہ کر سکیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ قلب پیغمبر کی تقویت کے لئے انھیں اطمینان دلاتا ہے کہ تمسخر اڑانے والوں کے مقابلے میں وہ اپنے نبی کی حمایت کرے گا، ارشاد ہوتا ہے: ہم تمسخر اڑانے والوں کے شر کو تجھ سے دور کیا ﴿إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ﴾۔

یہ جملہ فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے حالانکہ اس کا تعلق آئندہ سے ہے ظاہراً اس حمایت کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی ہم ان کے شر کو یقینی طور پر تجھ سے دور کریں گے اور یہ بات حتمی اور طے شدہ ہے۔

بعض مفسرین نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ چھ طرح کے گروہ تھے جس میں ہر ایک رسول اللہ ایک خاص قسم کا تمسخر کیا کرتا تھا اور جب آنحضرت دعوت کے لئے کھڑے ہوتے تو وہ کوشش کرتے کہ اپنی باتوں سے لوگوں کو آپ کے پاس سے دور کریں لیکن خدا تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا اس طرح انھیں اپنی اپنی پڑ گئی اور رسول اللہ کو بھی بھول گئے (بعض تفاسیر میں ان کی ابتلاء کی تفصیل آئی ہے)۔

اس کے بعد ”مستہزئین“ کی توصیف، قرآن یوں کرتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے خدا کے ساتھ معبود بن رکھے ہیں لیکن بہت جلد وہ اپنے اس کام کے منحوس نتیجہ سے آگاہ ہو جائیں گے ﴿الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾۔

ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے افکار و اعمال خود مضحکہ خیز ہیں کیونکہ یہ اس قدر ناداں ہیں جہاں ہستی کے خالق خدا کے مقابلے میں انہوں نے پتھر اور لکڑی کے معبود تراش رکھے ہیں اس کے باوجود وہ تیرے ساتھ تمسخر کرنا چاہتے ہیں۔

دوبارہ روح پیغمبر کی دلجوئی اور تقویت کے لئے فرمایا گیا ہے: ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تیرے سینے کو تنگ کر دیتی ہیں اور تیری پریشانی کا باعث بنتی ہیں ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرَكَ بِمَا يَقُولُونَ﴾۔ تیری لطیف روح اور حساس دل یہ سب بدگوئی اور کفر و شرک آمیز باتیں برداشت نہیں کر سکتا اور اسی بناء پر تو پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن تو پریشان نہ ہو اور ان کی گھٹیا اور ناہنجار باتوں کے اثرات کم کرنے کے لئے ”اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کر اور اس کی ذات پاک کے سامنے سجدہ ریز ہو جا“ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ﴾۔ کیونکہ اللہ کی تسبیح ان کی گفتگو کے برے اثرات کو مشتاقان خدا کے دلوں سے دور کر دیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تجھے توانائی بخشتی ہے اور نور و صفا عطا کرتی ہے، دل کو جلا دیتی ہے، خدا سے تیرے رشتے کو محکم کر دیتی ہے، تیرے ارادے کو قوی کر دیتی ہے، زیادہ قوت برداشت عطا کرتی ہے، جہاد پر زیادہ آمادہ کرتی ہے اور زیادہ راسخ قدم بنا دیتی ہے، روایات میں ابن عباس سے مروی ہے: رسول اللہ غمگین ہو جاتے تو نماز کے لئے گھڑے ہو جاتے اور نماز کے ذریعے ان آثارِ حزن و ملال کو دل سے دور کرتے۔

اس سلسلے میں آخری حکم یہ دیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی عبادت سے زندگی بھر دستبردار نہ ہونا ”ہمیشہ ان کی بندگی کرتا رہ یہاں تک کہ یقین (موت) آجائے“ ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾۔

مفسرین میں مشہور ہے کہ ”یقین“ مراد یہاں موت ہے اور موت کو اس لئے یقین کہا گیا ہے کہ یہ ایک امر مسلم ہے۔ انسان ہر چیز میں شک کر سکتا ہے لیکن موت میں شک نہیں کر سکتا، یا اس لئے اسے یقین کہا گیا ہے کہ موت کے وقت پردے ہٹ جاتے ہیں اور حقائق انسان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہو جاتے ہیں اور اس کے بارے میں یقین کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

سورہ مدثر کی آیت ۴۶-۴۷۔ میں دوزخیوں کا یہ قول بیان کیا گیا ہے: ﴿وَكُنَّا نَكْذِبُ يَوْمَ الدِّينِ حَتَّىٰ آتَانَا الْيَقِينُ﴾

ہم ہمیشہ روز جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ یقین (موت) نے ہمیں آیا۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو صوفیاء نے زیر بحث آیت کو ترک عبادت کے لئے دستاویز بنا لیا ہے اور کہا ہے کہ آیت کہتی ہے کہ عبادت کرو یہاں تک کہ تمہیں یقین آجائے لہذا حصول یقین کے بعد عبادت کی ضرورت نہیں، یہ ایک بے بنیاد گفتگو ہے۔ کیونکہ :-

اولاً: بعض قرآنی آیات گواہی دیتی ہیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یقین موت کے معنی میں ہے کہ جو مومنین کو بھی آنے کی اور دوزخیوں کو بھی۔

ثانیاً: اس گفتگو کے مخاطب پیغمبر اکرم ہیں اور یقین پیغمبر کا مقام سب پر روشن ہے تو کیا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ آپ ایمان کے لحاظ سے اس مقام یقین کے حامل نہ تھے۔

ثالثاً: تواریخ متواتر گواہی دیتی ہیں کہ رسول اللہ نے اپنی عمر کی آخری گھڑیوں تک عبادت ترک نہیں کی اور حضرت علی (علیہ السلام) محراب عبادت میں شہید ہوئے اور اسی طرح باقی آئمہ۔

چند اہم نکات

۱۔ اعلانیہ دعوت اسلام کا آغاز:

جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات: فاصدع بما تؤمر واعرض المشرکین انا کفیناک المستہزئین مکہ میں نازل ہوئیں جبکہ پیغمبر اسلام تین برس تک مخفی طور پر دعوت دے چکے تھے اور آپ کے قریبوں میں سے چند افراد آپ پر ایمان لا چکے تھے جن میں عورتوں میں سے سب سے پہلے جناب خدیجہ سلامہ علیہا تھیں اور مردوں میں حضرت علی علیہ السلام تھے۔

واضح ہے کہ اس زمانے میں اور اس ماحول میں توحید خالص کی دعوت اور نظام شرک و بت پرستی کو درہم برہم کرنا عجیب و غریب اور نہایت کٹھن کام تھا لہذا یہ بات تو شروع ہی سے نمایاں تھی کہ کچھ لوگ تمسخر اڑائیں گے لہذا خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر (ص) کے دل کو تقویت دیتا ہے، استہزاء کرنے والوں اور دشمنوں کی کثرت سے نہ ڈریں اور اپنی دعوت کھلے بندوں شروع کر دیں اور اس راہ میں ایک پیہم مسلسل اور منطقی جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔^(۱)

۲۔ خدا کی طرف توجہ کا روحانی اثر

انسانی زندگی میں ہمیشہ مشکلات آتی رہتی ہیں یہ دنیاوی زندگی کا مزاج ہے انسان جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے مشکلات بھی بڑی ہوتی جاتی ہیں اس سے عظیم مشکلات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جن کا سامنا رسول اللہ کو اپنی عظیم دعوت کے لئے کرنا پڑا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ زیادہ قوت کے حصول کے لئے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ وسعت قلب کے لئے تسبیح الہی، دعا اور اس کے آستانے پر سجدہ ریزی کریں۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ انسانی روح میں ایمان اور ارادے کی تقویت کے لئے عبادت گہرا اثر رکھتی ہے۔

مختلف روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بزرگ پیشواؤں کو عظیم مشکلات اور بحرانوں کا سامنا ہوتا ہے تو وہ خانہ خدا کا رخ کرتے اس کی عبادت کے زیر سایہ راحت و آرام اور طاقت و قوت حاصل کرتے۔

۳۔ عبادت اور تکامل اور ارتقاء

ہم جانتے ہیں کہ انسان ایسا موجود ہے جو تکامل و ارتقاء کی اعلیٰ ترین استعداد رکھتا ہے اس کے سفر کا آغاز نقطہ عدم سے ہوا ہے اور وہ لامتناہی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور اگر وہ راہ تکامل پر چلتا رہے تو کہیں بھی ٹھہراؤ نہیں آئے گا۔

ایک طرف ہم جانتے ہیں کہ عبادت تربیت انسان کا اعلیٰ ترین مکتب اور عبادت انسانی سوچ کو بیدار کرتی ہے اور اس کی فکر کو لامتناہی منزل کی طرف متوجہ کرتی ہے اس کے قلب و روح سے گناہ اور غفلت کا گرد و غبار دور کرتی ہے اس کے وجود میں اعلیٰ انسانی صفات کی پرورش کا باعث بنتی ہے۔ روح ایمان کو تقویت دیتی ہے اور انسان کو آگاہ اور مسئولیت عطا کرتی ہے لہذا ممکن ہے کہ انسان لمحہ بھر کے لئے بھی اس عظیم تربیتی مکتب سے بے نیاز ہو اور وہ لوگ یہ جو سوچتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ انسان ایک ایسا مقام پر پہنچ جائے کہ جہاں عبادت کرنے کی ضرورت نہ ہو انھوں نے انسان کے تکامل و ارتقاء کو محدود خیال کیا ہے یا وہ مفہوم عبادت نہیں سمجھ سکے۔

علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں اس سلسل میں ایک بحث کی ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کرتے ہیں :-

اس عالم کے تمام موجودات کمال کی طرف محو سفر ہیں اور انسانی تکامل معاشرے کے اندر ہوتا ہے لہذا انسان ذاتی طور پر سماجی فطرت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے ایک طرف انسانی معاشرے اس صورت میں انسان کی تربیت اور تکامل کا

ضامن بن سکتا ہے کہ وہ منظم قوانین کے احترام کے زیر سایہ اپنے امور بجالائیں، ٹکرائی سے بچیں اور ذمہ داریوں کی حدود واضح کریں۔

دوسرے لفظوں میں اگر انسانی معاشرہ صلح ہو جائے تو لوگ اس میں رہ کر اپنے اصلی ہدف تک پہنچ سکتے ہیں اور اگر معاشرہ خراب ہو تو پھر لوگ اس تکامل و ارتقاء سے رک جاتے ہیں یہ احکام و قوانین و ارتقاء سے رک جاتے ہیں یہ احکام و قوانین اجتماعی ہوں یا عبادتی اس صورت میں موثر ہوں گے جب نبوت اور آسمانی وحی سے لئے گئے ہوں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عبادتی احکام انفرادی ہوں یا اجتماعی تکامل کے ایک حصے پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک انسانی معاشرہ موجود ہے اور اس دنیا میں اس کی زندگی جاری و ساری ہے الہی ذمہ داریاں اور احکام بھی جاری ہیں اور انسان کی ذمہ داریوں اور قوانین کے خاتمے کا مطلب احکام و قوانین کی فراموشی ہے اور اس کا نتیجہ انسانی معاشرے کی خرابی اور فساد ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ نیک اعمال اور عبادات انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے حصول کا سرچشمہ ہیں اور جب یہ اعمال کافی حد تک انجام پائیں اور انسان کے اندر یہ اعلیٰ صلاحیتیں اور ملکات بیدار ہو جائیں تو یہ ملکات بھی اپنی باری پر زیادہ نیک اعمال اور خدا کی زیادہ عطا و بندگی کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جن کا گمان ہے کہ حکم کا مقصد انسانی تکمیل ہے لہذا جب انسان اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پھر بقاء کا کوئی معنی نہیں ان کا خیال مغالطے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اگر انسان ذمہ داریوں اور احکام کی انجام دہی سے دستبردار ہو جائے تو معاشرہ فوراً اتری کا رخ کرے گا لہذا ایسے معاشرے میں ایک فرد کامل کیسے زندگی بسر کر سکتا ہے اور اگر ملکات اپنے حقیقی اثرات سے روگردان ہو گئے ہیں (غور کیجئے گا)

سورہ نخل

آیات ۱، ۲

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

۱۔ ﴿أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾۔

۲۔ ﴿يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ﴾۔

ترجمہ

بخشنے والے مہربان خدا کے نام سے۔

۱۔ (مشرکوں اور مجرموں کے سزا کے بارے میں) حکم خدا پہنچ گیا ہے اس کے لئے جلدی نہ کرو۔ خدا اس سے منزہ و برتر ہے کہ اس کے لئے شریک قرار دئے جائیں۔

۲۔ روح الہی کے ساتھ ملائکہ کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نازل کرتا ہے اور انھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ اور (ان سے کہو کہ) میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے لہذا (میرے حکم کی) مخالفت سے پرہیز کرو۔

تفسیر

حکم عذاب قریب ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا چکا ہے کہ سورہ کی ابتدائی آیات کا اہم حصہ مکہ میں نازل ہوا ہے یہ وہ دن تھے جب پیغمبر اسلام مشرکوں اور بت پرستوں کی طرف سے شدید الجھاؤ اور سختی کا سامنا تھا۔ ہر روز وہ آپ کی حیات آفریں اور آزادی بخش دعوت کے خلاف کوئی نیا بہانہ تراشتے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ جس وقت رسول اکرم انھیں عذاب الہی کی تہدید کرتے تو بعض ہٹ دھرم کہتے کہ اگر یہ عذاب اور سزا جس کی دھمکی دیتے ہو سچ ہے تو پھر وہ ہم پر نازل کیوں نہیں ہوتا اور شاید کبھی مزید کہتے کہ اگر فرض کیا عذاب آیا بھی تو ہم بتوں کا دامن تھام لیں گے۔ تاکہ وہ بارگاہ الہی میں سفارش کریں کہ وہ ہم سے عذاب اٹھالے کیا وہ اس کی بارگاہ کے شفیع نہیں ہیں۔

اس سورہ کی پہلی آیت ان اوہام پر خط بطلان کھینچتے ہوئے کہتی ہے: جلدی نہ کرو۔ مشرکوں اور مجرموں کی سزا کے بارے میں حکم الہی یقیناً پہنچ چکا ہے ﴿أَتَىٰ أَمْرُ اللَّهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوهُ﴾۔ اور اگر تمہارا خیال ہے کہ بت اس کی بارگاہ کے

سفارشی ہیں تو تم سخت غلطی اور اشتباہ میں۔ خدا اس سے منزہ اور برتر ہے کہ جسے تم اس کا شریک بناتے ہو ﴿سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾۔

لہذا اس آیت میں ”امر اسہ“ مشرکین کے لئے عذاب کے بارے میں حکم خدا کی طرف اشارہ ہے اور لفظ ”اتی“ اگرچہ فعل ماضی ہے اور گزشتہ زمانے میں اس حکم کے تحقق کی نشاندہی کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم مضارع ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم یقیناً اور قطعاً تحقق پذیر ہوگا۔ ایسا قرآن میں کثرت سے ہے کہ قطعی الوقوع صیغہ مضارع ماضی کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ”امر اسہ“ خود عذاب کی طرف اشارہ ہے نہ کہ حکم عذب کی طرف۔ بعض نے اس سے ”روز قیامت“ مراد لیا ہے۔

لیکن جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

نیز اسہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب اور سزا کافی دوائی بیان اور عادلانہ اتمام حجت کے بغیر نہیں ہے لہذا بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: خدا ملائکہ کو خدائی روح کے ساتھ حکم الہی کے ہمراہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے ﴿يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾

(”من امر“ من“ بے کے معنی میں ہے اور یہاں سببیت کے معنی دیتا ہے)۔

اور انھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ، شرک و بت پرستی پر متنبہ کرو اور کہو کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے ﴿أَنۡ أَنْذَرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا﴾۔ لہذا صرف میری نافرمانی سے ڈرو اور میرے سامنے احساس ذمہ داری کرو ﴿فَاتَّقُون﴾۔

اس آیت میں روح سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وحی، قرآن اور نبوت ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کا باعث ہے اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں وحی کو قرآن سے اور دونوں کو نبوت سے جدا کیا ہے، اور انھیں تین تفاسیر کی شکل میں بیان کیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہر حال ”روح“ یہاں معنوی اور روحانی پہلو سے ہے اور ہر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو دلوں کی زندگی کا سبب ہیں اور نفوس کی تربیت اور عقلوں کی ہدایت کا باعث ہے جیسا کہ سورہ انفال کی آیہ ۲۴ میں ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ﴾

اے ایمان والو! خدا اور اس کے رسول کی دعوت قبول کرو۔ جبکہ وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف پکارتے ہیں جو تمہاری زندگی جا باعث ہے۔

سورہ مومن کی آیت ۱۵ میں ہے: ﴿يَلْقَى الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مِنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح القاء کرتا ہے۔

نیز سورہ شوریٰ کی آیہ ۵۲ میں ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِ نَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ﴾

اس طرح ہم نے اپنے حکم سے تجھ پر روح کو وحی کیا اس سے پہلے کتاب و ایمان سے آگاہ نہ تھا۔

واضح ہے کہ ان آیات میں ”روح“ قرآن، مضامین وحی اور فرمان نبوت کے معنی میں ہے اگرچہ روح قرآن کی دیگر آیات میں اور معانی بھی آیات ہے لیکن ان مذکورہ قرائن کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیر بحث آیت میں روح کا مفہوم قرآن اور مضمون وحی ہے۔

اس نکتہ کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ ”علیٰ من یشاء من عبادنا“ (اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے) کا ہرگز یہ مبہل نہیں کہ وحی و نبی کی نبوت بغیر کسی حساب کتاب کے ہے کیونکہ مشیت الہی کبھی اس کی حکمت سے جدا نہیں ہوتی اور حکیم ہونے کے تقاضا سے وہ یہ انعام اسے عطا کرتا ہے جو اس کا اہل ہو۔۔

ارشاد الہی ہے۔ ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَاتِهِ﴾

خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے (انعام ۱۲۴)

یہ نکتہ بھی نظر سے اوجھل نہ رہے کہ اگر انبیاء کے لئے پہلا فرمان الہی (ان انذروا) (ڈاراق) ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک گمراہ اور آلوشرک و فساد قوم کو بیدار کرنے کے لئے انذار سے بڑھ کر مؤثر کوئی چیز نہیں انذار بیدار کرنے والا۔ آگاہ اور اور حرکت آفرین۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان نفع کا طالب اور نقصان پسند نہیں کرتا لیکن تجربہ نشاندہی کرتا ہے کہ تشویق کا اثر آمادہ افراد پر زیادہ ہوتا ہے جب کہ آلودہ افراد پر یہ تہمت کا اثر بہت ہوتا ہے اور ابتدائے نبوت میں انذار اور ڈرانے والے امور ہونا چاہئیں۔

آیات ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸

- ۳۔ ﴿خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ تَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾۔
- ۴۔ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ﴾۔
- ۵۔ ﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنْفَعٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ﴾۔
- ۶۔ ﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ﴾۔
- ۷۔ ﴿وَتَحْمِلُ أُنْفُسَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِالْعِيقِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرِئُوفٌ رَحِيمٌ﴾۔
- ۸۔ ﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾۔

ترجمہ

- ۳۔ اس نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لئے شریک بناتے ہیں۔
- ۴۔ اس نے انسان کو ایک بے حیثیت نطفے سے پیدا کیا اور آخر کار وہ ایک موجود فصیح اور اپنا واضح مدافع قرار پایا۔
- ۵۔ اور اس نے چوپایوں کو پیدا کیا جبکہ ان سے تمہیں لباس اور دیگر منافع حاصل ہوتے ہیں اور تم ان کے گوشت میں سے کھاتے ہو۔
- ۶۔ اور تمہارے لئے ان میں زینت اور شکوہ ہے جس وقت انہیں ان کی آرام گاہ کی طرف لوٹاتے ہو اور جب (صبح کے وقت) انہیں صحرا کی جانب بھیجتے ہو۔
- ۷۔ وہ تمہارے بھاری بوجھ ایسے مقام تک اٹھالے جاتے ہیں جہاں تک تم بغیر مشقت کے ساتھ نہیں پہنچ سکتے کیونکہ تمہارا پرورگار رؤف و رحیم ہے۔
- ۸۔ اور (اسی طرح) اس نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو پیدا کیا ہے کہ تم ان پر سوار ہو سکو اور وہ تمہاری زینت کا سبب بھی ہوں اور وہ (نقل و حمل کے) دیگر ذرائع پیدا کرے گا کہ جنہیں تم نہیں جانتے۔

تفسیر

جانوروں کے گونگوں فائدے

گذشتہ آیات میں شرک کی نفی کئے بائے میں بات کی گئی ہے۔ زیر بحث آیات میں شرک کی بیخ کنی کے لئے اور خدائے یکتا کی توجہ کے لئے دو حوالے سے بات کی گئی ہے۔ پہلے عقلی دلائل کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور عجیب و غریب

نظام خلقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور انسان کے لئے خدا کی طرح طرح کی نعمتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس میں شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہو اور آخر کار اسے خدا کے قریب کر دے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے ﴿خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ﴾۔ آسمان و زمین کی حقانیت اس کے عجیب نظام سے بھی واضح ہے اور منظم و حساب شدہ آفرینش سے بھی، اس کے ہدف سے بھی اور اس میں موجود فائدہ سے بھی۔

اس کے بعد مزید فرمایا: خدا اس سے برتر و بلند ہے کہ وہ اس کے لئے شریک بناتے ہیں ﴿تَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾۔ بت کہ جنہیں وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں ایسے تخلیق کی صلاحیت ہر گز نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ تو معمولی سا مچھریا غبار کا ذرہ بھی پیدا نہیں کر سکتے اس کے باوجود تم انہیں کس طرح خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ مشرکین خود اس عجب نظام اور بدیع خلقت کہ جو خالق کے علم و قدرت کی مظہر ہے کو صرف اللہ کی طرف سے جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عبادت کے وقت بتوں کے سامنے خاک پر گر پڑتے ہیں۔

آسمان و زمین اور ان میں بے پایاں اسرار کی جانب اشارہ کرنے کے بعد خود انسان کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے وہ انسان کہ جوہ کسی سے بڑھ کر اپنے آپ سے قریب ہے۔ فرمایا گیا ہے: انسان بے وقعت اور بے قیمت نطفے سے پیدا کیا گیا لیکن اس طرح پیدا ہو کر وہ فصیح و بلیغ متفکر، اپنا دفاع کرنے والا اور واضح کلام کرنے والا بن گیا۔ ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ﴾۔

”نطفہ“ کا اصلی معنی ہے تھوڑا یا صاف پانی۔ بعد میں ان قطرات کو نطفہ کہا جانے لگا جو تلقیح کے لئے ذریعہ انسانی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

اس تعبیر سے درحقیقت قرآن حق تعالیٰ کی عظیم قدرت کو مجسم صورت میں بیان کرنا چاہتا ہے کہ اس نے پانی کے حیثیت قطرے سے کیسی عجیب مخلوق پیدا کی ہے کہ جس کی قوسِ مَزُول اور قوسِ مَعْرُوض صعود کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

یہ مفہوم اس صورت میں ہے جب ”خصیم“ کو مدافع اور اپنی باطنی حالت بیان کرنے والے کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ سورہ نساء کی آیہ ۱۰۵ میں ہے: ﴿وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا﴾

اے رسول! خیانت کرنے والوں کے حامی اور مدافع نہ بنو۔

یہ تفسیر کے ایک گروہ کے نزدیک قابل قبول ہے لیکن بعض مفسرین نے ایک اور تفسیر بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ: خدا نے انسان کو اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے بے وقت نطفے سے پیدا کیا لیکن یہ ناشکر انسان خدا کے مقابلے میں کھلم کھلا مجادلہ اور مخاصمہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ مفسرین سورہ یس کی آیہ ۷۷ کو اس تفسیر پر شاید کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیر نظر آیات عظمتِ خلقتِ الہی کے بارے میں اور عظمت اس وقت آشکار ہوگی جب ظاہراً معمولی موجود سے وہ ایک قیمتی چیز پیدا کر دے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی ہے کہ: خلقه من ماء قطرة ماء منتن فيكون خصيماً متكلماً بليغاً خدا نے انسان کو پانی کے بدبودار قطرے سے پیدا کیا ہے اور پھر وہ فصیح و بلیغ کلام کرنے والا ہو گیا۔^(۱) دوسرا نکتہ یہ کہ انھیں ”منافع“ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ لباس ضرر کو روکنے کے لئے ہے اور ضرر کو روکنا حصولِ منافع پر مقدم ہے۔

ہو سکتا ہے وہ لوگ جو گوشت کھانے کے مخالف ہیں اس آیت سے بھی مطلب نکالیں کہ خدا نے جانوروں کا گوشت کھانے کا مسئلہ ان کے ”منافع“ میں شمار نہیں کیا۔ لہذا ”منافع“ کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: **و منها تأكلون** (اور تم ان حیوانات کا گوشت کھاتے ہو) اس تعبیر سے کم از کم یہ استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ لبنیات کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن نے ان مفید جانوروں کے عام معمول فوائد بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان سے حاصل ہونے والے نفسیاتی فوائد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ جانور تمہارے لئے زینت کا باعث ہوتے ہیں جبکہ انھیں آرام کی جگہ واپس لے جاتے ہو اور جب صبح کے وقت انھیں صحرا کی طرف بھیجتے ہو (ولکم فیہا جما حین تریحون و حین تسرحون)۔

”تریحون“ اراحہ کے مادہ سے غروب کے وقت جانوروں کو ان کے باڑوں اور آرام کی جگہوں کی طرف واپس لانے کے معنی میں ہے اسی لئے ان کے آرام کی جگہ کو ”مراح“ کہتے ہیں۔

”تسرحون“ ”سرح“ کے مادہ سے چوپایوں کو صبح کے وقت چراگاہ کی طرف باہر لو جانے کے معنی میں ہے۔ بھیڑ بکریوں اور دوسرے چوپایوں کے بیابان اور چراگاہ کی طرف اکٹھے جانے اور پھر شام ڈھلے باڑوں اور آرام کی جگہ لوٹ آنے کے جاذب نظر نظر کو قرآن ”جمال“ سے تعبیر کرتا ہے یہ صرف ایک ظاہری، تکلفاتی اور رسمی مسئلہ نہیں ہے

بلکہ اس میں ایک حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جس کا تعلق معاشرے کی گہرائیوں سے ہے یہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ خود کفیل ہوتا ہے فقیر و پس ماندہ نہیں ہے اور اس سے یا اس سے وابستہ نہیں ہوتا وہ خود وسائل مہیا کرتا ہے اور جو کچھ خود اس کے پاس ہوتا ہے اسے صرف کرتا ہے یہ دراصل معاشرے کا جمال استغناء اور خود کفالت ہے یہ درحقیقت جمالِ تولید اور ایک ملت کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ واضح تر الفاظ میں استقلالِ آزادی کے جمال اور ہر قسم کی وابستگی سے نجات ہے۔

اس حقیقت کو دیہات میں رہنے والے اور دیہات میں پیدا ہونے والے شہروں میں رہنے والوں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں، کہ جب یہ مفید چوپائے آتے جاتے ہیں تو انھیں دیکھ کر انھیں کیسا روحانی اور دلی سکون ہوتا ہے ایسا سکون جو بے نیازی کے احساس سے اٹھتا ہے ایسا سکون جو ایک مؤثر اجتماعی ذمہ داری کی انجام دہی پر ہوتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر نظر آیت میں پہلے ان کے صحرا سے لوٹنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ جب یہ دھور ڈنگر صحرا سے لوٹتے ہیں تو ان کے پستان دودھ سے بھرے ہوتے ہیں، شکم سیر ہوتے ہیں اور ان کے چہرے سے خوشی اور طمانیت جھلک رہی ہوتی ہے۔ لہذا اس وقت ان میں وہ حرص اور جلد بازی نظر نہیں آتی جو صبح دم صحرا کی طرف جاتے ہوئے ہوتی ہے۔ اطمینان سے کشاں کشاں قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے آرام کی جگہ پر جا پہنچتے ہیں۔ ان کے دودھ بھرے پستانوں کو دیکھنے والا ہر کوئی ایک بے نیازی کا احساس کرتا ہے۔

اگلی آیت میں ان جانوروں کے ایک اور اہم فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے وہ تمہارے بھاری بوجھ اپنے پشت پر اٹھا کر لے جاتے ہیں اور ایسے دیا ر کی طرف لے جاتے ہیں جہاں تک تم شدید مشقت کے بغیر نہیں پہنچ پاتے ﴿وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بِالْغَيْهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ﴾۔ یہ خدا کی رحمت و کرم کی نشانی ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو اتنی طاقت بخشی اور انھیں تمہارے قابو میں کر دیا کیونکہ ”تمہارا پروردگار رؤف و رحیم ہے ﴿إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَّؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾۔

”شق“ ”مشقت“ کے مادہ سے ہے لیکن بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ شگاف کرنے اور آدھا آدھا کرنے کے معنی میں ہے یعنی تم خود اس وزن کو اپنے کندھے پر لاد کر جاؤ تو تمہاری آدھی قوت ختم ہو جائے۔ اصطلاح کے مطابق نیم جاں ہو جاؤ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اس طرح جو چوپائے پہلے تو انسان کے لئے لباس اور گرمی سردی سے بچنے کا ذریعہ مہیا کرتے ہیں دوسرے درجہ پر ان کے لبنیات سے تیار شدہ چیزوں سے استفادہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کا گوشت استعمال کیا جاتا ہے اس کے بعد ان کے وہ نفسانی آثار ہیں جو احساسات پر مرتب ہوتے ہیں اور آخر میں ان کی باربرداری کا ذکر ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس دور میں جو کہ مشین کا زمانہ ہے اس میں بھی بہت سے مواقع پر صرف چوپایوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور جہاں کوئی اور طریقہ کار آمد بھی نہیں ہے۔

اس کے بعد ایسے جانور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انسان کی سوای کے کام آتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: خدا نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان پر سواری کر سکو اور وہ تمہاری زینت کا سبب بھی بنیں ﴿وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً﴾۔

واضح ہے کہ یہاں لفظ ”زینت“ کوئی تکلفاتی اور رسمی طور پر نہیں آیات جو شخص تعلیمات قرآن سے آشنا ہے اس کے لئے اس کا مفہوم واضح ہے۔ وہ وہ زینت ہے جس کا اثر اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتا ہے اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لئے آپ اس شخص کی حالت کا تصور کریں کہ جس نے ایک طویل بیابانی راستے کو پیادہ طے کیا ہو اور تھکا ماندہ اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ ایک عرصہ تک کام کرنے کے قابل نہ رہا ہو اس کا موازنہ ایسے شخص سے کریں کہ سواری جس کے پاس ہو اور وہ بہت جلد اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو۔ اس کی قوت و توانائی اسی طرح باقی ہو، خوش و خرم ہو اور اپنے آئندہ امور انجام دہی کے لئے تیار ہو تو کیا یہ زینت نہیں ہے؟

آیت کے آخر میں ایک نہایت اہم مسئلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور انسانی افکار کو آئندہ زمانے میں نقل و حمل کے نئے پیدا ہونے والے ذرائع کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یعنی آئندہ زمانے میں انسان کے پاس ان جانوروں کی نسبت نقل و حمل کے بہتر اور خوب تر ذرائع ہوں گے۔ ارشاد ہوتا ہے خدا تعالیٰ (نقل و حمل کے لئے) کئی ایک چیز پیدا کرے گا کہ جنہیں تم نہیں جانتے ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾۔

بعض گزشتہ مفسرین نے اگرچہ اس جملے کو ایسے جانوروں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو آئندہ پیدا ہوں گے اور نوع بشر کے مطیع ہوں گے لیکن جیسا کہ تفسیر مراغی اور تفسیر ظلال میں ہے ہمارے لئے جملے کا مفہوم سمجھنا آسان ہے کیونکہ ہم مشینی اور تیز رفتار سواہیوں کے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ جو لفظ ”یخلق“ (پیدا کرے گا) استعمال کیا گیا ہے اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ انسان در حقیقت چیزوں کو جوڑ کر اور ملا کر ایجادات کرتا ہے اور کچھ نہیں جبکہ ان چیزوں کا اصلی مواد صرف خدا کی تخلیق ہے علاوہ ازیں انسانی ایجادات میں موجود استعداد خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔

نکتہ

جانور پالنے اور کھیتی باڑی کی اہمیت

آج کے زمانے میں پیداواری اور کارخانے اور مشینیں اتنی زیادہ ہیں کہ تمام دوسری چیزیں ماند پڑ گئی ہیں لیکن آج بھی انسانی زندگی کی پیداوار کا ایک اہم حصہ جانور پالنے اور کھیتی باڑی سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ غذائی مواد کی حقیقی بنیاد یہی دو امور ہیں اسی بناء پر جانوروں اور کھیتی باڑی کی ضروریات میں خود کفالت نہ صرف اقتصادی استقلال کی ضامن ہے بلکہ سیاسی استقلال بھی بہت حد تک اس سے مربوط ہے لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ساری دنیا کی قویں جانوروں کی نشوونما کو وسعت دینے اور اس کی وسعت کے لئے مارڈن ذرائع استعمال کرنے میں کوشاں ہیں۔

یہ دونوں چیزیں اتنی اہم اور بنیادی ہیں کہ بعض اوقات ان ممالک میں سے جنہیں سوپر پاور کہا جاتا ہے مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنے سیاسی مقام کو نظر انداز کر کے ان ممالک کے سامنے ہاتھ پھیلائیں جو عین ان کے مخالف ہیں اس کے لئے روس کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

اسی بناء پر اسلام اور اس کی حیات آفریں تعلیمات میں جانوروں کی پرورش اور زراعت کے مسئلے کو انتہائی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ان امور کے لئے مسلمانوں کو ترغیب دینے کے لئے ہر موقع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن جانوروں کے مسئلہ پر کس تشویق آمیز لہجے میں بات کرتا ہے ان سے حاصل ہونے والے منافع کا ذکر کرتا ہے چاہے وہ غذائی اعتبار سے ہوں یا لباس کے لحاظ سے۔ یہاں تک کہ صحرا میں ان کے آنے جانے کا ذکر بڑے حسین پیرائے میں کرتا ہے۔

زراعت، کھیتی باڑی اور مختلف قسم پھلوں کی اہمیت کے بارے میں اسی طرح آئندہ آیات میں عمومی اعتبار سے گفتگو ہوگی۔

اسلامی روایات میں جانور پالنے کے بارے میں نہایتجاذب توجہ تعبیرات نظر آتی ہیں اسی طرح کھیتی باڑی کے بارے میں بہت سی روایات ہیں ہم نمونے کے طور پر اسلامی مصادر سے چند ایک روایات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک ایک عزیز سے فرمایا:
تم اپنے گھر ”برکت“ کیوں نہیں لاتے ہو؟

اس نے عرض کیا: ”برکت“ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا: ”شاة تحلب“ (دودھ دینے والی بکری)

مزید فرمایا: انہ کانت فی دارہ شاة تحلب اوانعجة او بقرہ وفبرکاة کلھن

جس گھر میں دودھ دینے والی بکری، بھیریا گائے ہو تو یہ سب برکتیں ہیں۔^(۲)

۲۔ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منقول ہے کہ آپ نے بکری کی اہمیت کے بارے میں فرمایا:-

نعم المال الشاة

بکری بہت اچھا سرمایہ ہے۔^(۳)

۳۔ تفسیر نور الثقلین میں زیر بحث آیات کے ذیل میں امام امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے:

افضل ما يتخذہ الرجل فی منزله لعیالہ الشاة فمن كان فی منزله شاة قدست علیہ الملائكة مرتین فی کل یوم

اہل خانہ کے لئے انسان گھر میں جو چیز مہیا کرتا ہے وہ بکری ہے جس شخص کے گھر میں بکری ہو خدا کے فرشتے ہر روز

دو مرتبہ اس کی تقدیس کرتے ہیں۔

یہاں غلط فہمی نہیں ہونا چاہئیے، ممکن ہے بہت لوگوں کے گھر میں بکری پالنے کے لئے حالات سازگار نہ ہوں لیکن اصلی مقصد یہ ہے کہ جتنے گھر ہوں اتنی بھیریا بکریاں ہمیشہ پالتے رہنا چاہئیے (غور کیجئے گا)۔

۴۔ زراعت کی اہمیت کے لئے اتنا کافی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: (من وجد ماءً و تراباً ثم افتقر

فابعد اللہ) جس کے پاس پانی اور مٹی ہو اس کے باوجود وہ فقیر ہو، خدا اسے اپنی رحمت سے دور رکھے۔^(۴)

۵۔ پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

علیکم بالغنم و الحرث فاحما یروحان بخیر ویغدوان بخیر

تمہاری ذمہ داری ہے کہ بھیریا بکریاں پالو اور کھیتی باڑی کرو اور ان کا لین دین خیر و برکت کا باعث ہے۔^(۵)

۶۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

ما فی الاعمال شیء احب الی اللہ من الزراعة

خدا کے ہاں زراعت سے زیادہ کوئی عمل محبوب نہیں۔^(۶)

۷۔ امام صادق علیہ السلام ہی سے ایک اور حدیث منقول ہے، فرماتے ہیں:

الزارعون كنوز الانام تزرعون طيباً اخرجه الله عزوجل وهم يوم القيامة احسن الناس مقاماً و اقربهم منزلة يد عون
المباركين -

كسان لوگوں کے خزانے ہیں وہ خدا کا عطا کردہ پاکیزہ اناج بوتے ہیں قیامت کے دن وہ بلند ترین مقام کے حامل ہوں
گے وہ خدا کے زیادہ قریب ہیں اس روز انھیں ”مبارکین“ کے نام سے پکارا جائے گا۔^(۷)

۱۔ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۳۹۔

۲۔ بحار الانوار ج ۱۴ ص ۶۸۶ طبع قدیم۔ مذکورہ حدیث میں بکری اور گائے کے علاوہ ”نبتہ“ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ لغت میں اس لفظ کے بہت سے معانی ہیں مثلاً وحشی
گائے، پہاڑی بکری یا بھیڑ۔

۳۔ بحار الانوار ج ۱۴، ص ۶۸۶ طبع قدیم۔

۴۔ بحار الانوار جلد ۲۳ صفحہ ۱۹۔

۵۔ بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۳۰۴۔

۶۔ بحار الانوار جلد ۲۳، صفحہ ۲۰۔

۷۔ وسائل الشیعة جلد ۱۳، صفحہ ۱۹۴۔

آیات ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳

- ۹۔ ﴿وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَائِزٌ وَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ﴾۔
 ۱۰۔ ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ﴾۔
 ۱۱۔ ﴿يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔
 ۱۲۔ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالْجُودُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾۔
 ۱۳۔ ﴿وَمَا ذَرَأًا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ﴾۔

ترجمہ

- ۹۔ خدا کے ذمہ ہے کہ وہ بندوں کو راہ راست کی نشاندہی کرے البتہ بعض راستے گمراہی کے ہیں اور اگر خدا چاہے تو تم سب کو (جبری طور) ہدایت کرے (لیکن مجبور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں)۔
 ۱۰۔ وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی بھیجا کہ جسے تم پیتے ہو نیز یہ پودے اور درخت بھی اسے سے اگتے ہیں کہ جنہیں چرنے کے لئے تم اپنے جانور لے کر جاتے ہو۔
 ۱۱۔ اس (بارش کے پانی ہی) سے خدا تمہاری کھیتیاں اگاتا ہے اسی سے وہ تمہارے لئے زیتون، کھجور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ یقیناً گور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں واضح نشانی موجود ہے۔
 ۱۲۔ اس نے رات و دن اور سورج و چاند کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے نیز ستار بھی اس کے حکم سے تمہارے لئے مسخر ہیں اس میں ان لوگوں کے لئے (عظمتِ خدا کی) نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔
 ۱۳۔ (ان کے علاوہ) جو رنگا رنگ مخلوق اس زمین میں پیدا کی گئی ہے اسے بھی (تمہارے حکم کے سامنے) مسخر کر دیا گیا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے واضح نشانی ہے جو متذکر ہوتے ہیں۔

تفسیر

سب چیزیں انسان کے دستِ تسخیر میں ہیں:

- گذشتہ آیات میں خدا کی مختلف نعمتوں کا ذکر تھا زیرِ نظر آیات میں بھی خدا بعض نہایت اہم نعمتوں کا ذکر ہے۔
 ایک بہت اہم معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا کے ذمہ ہے کہ لوگوں کو اس صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے جس میں کوئی انحراف اور کجی نہیں ہے۔ ﴿وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ﴾۔

”قصد“ راستہ صاف ہونے کے معنی میں ہے لہذا ”قصد السبیل“ کا معنی ”سیدھا راستہ“ ہو گا یعنی وہ راستہ جس میں انحراف اور گمراہی نہ ہو۔^(۱)

اس بارے میں کہ یہ ”سیدھا راستہ“ تکوینی پہلو سے ہے یا تشریعی پہلو سے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن کوئی مانع نہیں کہ اس میں دونوں پہلو شامل ہوں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا نے انسان کو مختلف توانائیاں عطا کی ہیں اور اسے طرح طرح کی استعدادیں دی ہیں تاکہ تکامل و ارتقاء میں راہ میں اس کی مدد کی جائے کیونکہ تکامل و ارتقاء اس کا مقصد خلقت ہے اسی طرح نباتات اور دیگر مختلف جانوروں کو بھی اس ہدف تک پہنچنے کے لئے ضروری توانائیاں عطا کی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، جب کہ نباتات اور جانور بے اختیار اپنے ہدف کی طرف جاتے ہیں۔ نیز تکامل انسان کی قویں صعودی کا بھی دیگر جانداروں سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔

اس طرح خدا تعالیٰ نے خلقت اور تکوین کے اعتبار سے عقل و استعداد اور دیگر لازمی توانائیاں عطا کر کے اس صراط مستقیم پر چلنے کے لئے تیار کیا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو وحی آسمانی، درکار تعلیمات اور انسانی ضرورت کے قوانین کے ساتھ بھیجا تاکہ تشریحی لحاظ سے صحیح اور غلط راستہ کو جدا جدا کر کے دکھادیں اور اس راستے چلنے کے لئے انسان کے شوق کو ابھاریں اور اسے انحرافی راستوں سے باز رکھیں یہ بات جاذب نظر کہ مندرجہ بالا آیت میں خدا تعالیٰ نے اس امر کو اپنا ایک فریضہ شمار کیا ہے۔

اور ”علی اللہ“ (خدا پر لازم ہے) الفاظ استعمال کئے ہیں کہ قرآن کی آیات میں ہیں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ﴿علینا للہدی﴾

ہم پر لازم ہے کہ ہم انسان کی ہدایت کریں، (لیل - ۱۲)

اگر ہم ”علی اللہ قصد السبیل“ کے مفہوم کی وسعت پر غور کریں اور تمام مادی اور روحانی توانائیاں جو خلقت انسان اور اس کی تعلیم و پرورش میں استعمال ہوئی ہیں کے بارے میں سوچیں تو ہمیں ”قصد السبیل“ کی عظمت کا اندازہ ہو گا کہ جو تمام نعمتوں سے برتر ہے۔

انحرافی راستے چونکہ بہت زیادہ ہیں اس لئے قرآن اگلے مرحلے پر انسان کو بیدار کرتے ہوئے کہتا ہے: ان راستوں میں سے بعض انحرافی ہیں (ومنہا جائز) (۲)

انسان کے کمال اور ارتقاء کے لئے چونکہ اختیار و ارادہ کی آزادی اہم ترین عامل ہے لہذا قرآن ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ”اگر خدا چاہتا تو ہم سب کو زبردستی راہ راست کی ہدایت کرتا“ یہاں تک کہ تم ایک قدم آگے اس سے نہ رکھ سکتے ﴿وَلَوْ شَاءَ لَهْدَاكُمْ اَجْمَعِينَ﴾ لیکن اس نے یہ کام نہیں کیا کیونکہ جبری ہدایت نہ باعث افتخار ہے اور نہ تکامل و ارتقاء کا ذریعہ اس نے تمہیں آزادی دی ہے تاکہ تم یہ راستہ اپنے قدموں سے طے کرو اور اوج کمال تک جا پہنچو۔

قرآن کا جملہ ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگر انسانوں کا ایک حصہ منحرف راستے کی طرف چل پڑتا ہے تو اس سے یہ وہم پیدا نہ ہو کہ ان کے مقابلے میں خدا مغلوب ہو گیا ہے بلکہ اس کی خواہش اور تقا جائے حکمت ہے کہ انسان آزاد ہیں۔

اگلی آیت میں بھی مادی نعمت کا ذکر ہے تاکہ انسانوں کے احساس شکر کو ابھارا جائے اور ان کے دلوں میں عشق الہی کے نور سے اجالا کیا جائے اور انہیں ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کی زیادہ سے زیادہ معرفت کی دعوت دی جائے۔ قرآن کہتا ہے: وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً﴾۔ حیات بخش، میٹھا، صاف شفاف اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک پانی جسے تم پیتے ہو ﴿لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ﴾۔

اور اسی سے پودے اور درخت نکلتے ہیں کہ جنہیں چرنے کے لئے تم اپنے جانور بھیجتے ہو ﴿وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ﴾۔ ”تسیمون“ ”اسامہ“ کے مادہ سے جانوروں کو چرانے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جانور زمین کے پودوں سے بی استفادہ کرتے ہیں اور درختوں کے پتوں سے بھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ عربی لغت میں ”شجر“ کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ یہ لفظ درخت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور پودے کے لئے بھی

اس میں شک نہیں کہ بارش کا فائدہ یہی نہیں کہ اس کا پانی انسانوں کے پینے اور پودوں کے اگنے کے کام آتا ہے بلکہ اس سے ہوا صاف ہو جاتی ہے انسانی جسم کا درکار طوبت اور نرمی حاصل ہوتی ہے انسانی تنفس میں سہولت کا باعث ہے اور اسی طرح اس بارش کے اور بے شمار فائدے ہیں لیکن چونکہ مذکورہ دو باتیں زیادہ اہم تھیں اس لئے فقط انہی کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: بارش کے پانی ہی سے تمہاری کھیتیاں اگاتا ہے ﴿يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ﴾ (

مختصر یہ کہ تمام پھل اسی سے اگتے ہیں ﴿وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾۔

یقیناً یہ رنگا رنگ پھل اور طرح طرح کی کھیتیاں خدا کی طرف سے ان لوگوں کے لئے واضح نشانیاں ہیں جو صاحب فکر ہیں ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔

”زرع“ کے مفہوم میں ہر طرح کی زراعت شامل ہے ”زیتون“ ایک خاص درخت کا نام ہے اور اس درخت کے پھل کو بھی ”زیتون“ کہتے ہیں (لیکن بعض مفسرین کے نزدیک ”زیتون“ صرف درخت نام ہے اور ”زیتونہ“ اس کے پھل کا نام ہے جبکہ سورہ کی آیت ۳۵ میں لفظ ”زیتونہ“ خود درخت کے لئے استعمال ہوا ہے)۔

”نخیل“ کا معنی ہے ”کھجور کا درخت“ یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

”اعناب“ جمع ہے ”عنب“ کی جس کا معنی انگور۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے تمام پھلوں میں سے صرف ان تین پھلوں زیتون، کھجور اور انگور کا ذکر کیوں کیا ہے اس کی دلیل انشاء اللہ آپ اسی آیت میں پڑھیں گے۔

اس کے بعد اس نعمت کی طرف اشارہ ہے کہ اس جہان کے مختلف موجودات انسان کے لئے مسخر کردئے گئے ہیں ، ارشاد الہی ہے اللہ نے تمہارے لئے رات اور دن کو مسخر کر دیا ہے اور اسی طرح سورج اور چاند کو بھی ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ﴾۔

اسی طرح ستارے بھی حکم انسان کے سامنے مسخر ہیں ﴿وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ﴾۔

ان امور میں یقیناً خدا اور اس کی خلقت کی عظمت کی نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقل و فکر رکھتے ہیں ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾۔

سورہ رعد اور سورہ ابراہیم کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کے لئے موجودات مسخر ہونے کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ موجودات انسانی فائدے کے لئے مصروف خدمت ہوں اور انسان کو اس بات کا امکان فراہم کریں کہ وہ ان سے استفادہ کر سکے۔ اسی بناء پر رات، دن، سورج، چاند اور ستاروں میں سے ہر کوئی انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اس لحاظ سے یہ موجودات انسان کے لئے مسخر ہیں۔

یہ جاذب نظر تعبیر کہ موجودات حکم خدا سے انسان کے لئے مسخر ہیں۔ اسلام اور قرآن کی نگاہ میں انسان کے مقام اور حقیقی عظمت کو واضح کرتی ہے اور اس کے خلیفہ اللہ ہونے کی اہلیت کا اظہار کرتی ہے اس تعبیر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کی گونا گوں نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کے جذبہ تشکر کو ابھارا جائے اور وہ اس عمدہ و بدیع نظام کی اپنے لئے تسخیر کو دیکھتے ہوں خدا کے نزدیک ہو جائے۔

اسی لئے آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: اس تسخیر کے لئے ان میں نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اسرار تسخیر سے زیادہ اہم ہے کہ لئے سورہ ابراہیم کی آیات ۳۲ اور ۳۳ کی تفسیر دیکھئے۔

ان کے علاوہ ”زمین میں پیدا کی گئی مخلوقات کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے“ ﴿وَمَا ذَرَأَّا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ﴾۔
 رنگا رنگ کی مخلوقات ﴿مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ﴾۔ طرح طرح کے لباس، مختلف قسم کی غذائیں، پاکیزہ بیویاں، آرام و آسائش کے وسائل، قسم قسم کے معدنیات، زیر زمین و پائے زمین مفید چیزیں اور دوسری نعمتیں ان میں بی واضح نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھ جاتے ہیں“ ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ﴾۔

۱۔ بعض بزرگ مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے ”المیزان“ میں ”قصد“ کو ”قاصد“ کے معنی میں لیا ہے کہ جو ”جائز“ (حق سے منحرف) کا الٹ ہے۔

۲۔ ”منھا“ کی ضمیر ”سبیل“ کی طرف لوٹتی ہے اور سبیل مونث مجازی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ مادی اور روحانی نعمتیں

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں مادی و روحانی نعمتیں اس طرح آپس میں ملی جلی ہوئی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اس کے باوجود آیات کے اس سلسلے میں مادی اور روحانی نعمتوں کے بارے میں لب و لہجہ میں ایک فرق ضرور ہے۔

کسی موقع پر نہیں کہا گیا کہ خدا پر لازم ہے کہ تمہارے لئے فلاں روزی پیدا کرے لیکن راہ راست کی ہدایت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ خدا پر لازم ہے کہ وہ تمہیں سیدھے راستے کی ہدایت کرے اور اس راستے کو طے کرنے کے لئے درکار قوت و توانائی بھی تمہیں عطا کرے، تکوینی لحاظ سے بھی اور تشریعی لحاظ سے بھی۔ اصولی طور پر قرآن کی یہ روش ہی نہیں کہ وہ کسی بحث کے کسی ایک پہلو پر ہی نظر رکھے۔ یہاں تک کہ درختوں اور پھلوں کی خلقت اور چاند سورج کی تسخیر ہونے کی بات کرتے ہوئے بھی معنوی اور روحانی ہدف کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے یہ مادی نعمتیں بھی خلقت و خالق کی عظمت کی نشانی ہیں۔

۲۔ زیتون، کھجور اور انگور ہی کا ذکر کیوں؟

ہو سکتا ہے یہ سمجھا جائے کہ قرآن نے مندرجہ بالا آیات میں طرح طرح کے پھلوں میں سے زیتون، کھجور اور انگور کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ نزول قرآن کے علاقے میں موجود تھے لیکن قرآن کے عالمی اور جاودانی ہونے اور اس کی تعبیرات کی گواہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ مطلب اس سے کہیں اونچا ہے۔

غذا شناس وہ عظیم سائندان جنہوں نے اپنی عمر کے ساہا سال مختلف پھلوں کے خواص کے مطالعے میں صرف کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بہت کم پھل ایسے ہیں جو غذائیت کے اعتبار سے انسانی جسم کے لئے ان تین پھلوں سے جتنے مفید اور موثر ہوں وہ کہتے ہیں کہ زیتون کا تیل بدن کے جلے ہوئے حصے کے پھر بننے کے لئے بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے اس میں حرارت بہت زیادہ ہوتی ہے اسی بناء پر یہ ایک قوت بخش شے ہے جو لوگ اپنے صحت و سلامتی کی حفاظت چاہتے ہیں انھیں اس اکسیر سے استفادہ کرنا چاہیے۔

زیتون کا تین انسان کے جگر کا مخلص دوست ہے گروں صفر کے عوارض اور گردے اور جگر کے درد دفع کرنے کے لئے خشکی کو دور کرنے کے لئے بہت ہی مؤثر ہے اسی بناء پر اسلامی روایات میں بھی اس کی بہت مدح و ثنا اور توصیف کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضا (علیہ السلام) سے زیتون کے بارے میں مروی ہے:

بڑی اچھی غذا ہے منہ کو خوشبودار بنادیتی ہے، بلغم کو دور کرتی ہے چہرے کو صفائی اور تازگی بخشتی ہے۔ اعصاب کو تقویت دیتی ہے بیماری اور درد کو ختم کر دیتی ہے اور غصے کی آگ کو بجھا دیتی ہے۔^(۳)

اسی طرح میڈیکل سائنس اور علم غذا شناسی کی ترقی نے دوا کی حیثیت سے کھجور کی اہمیت کو بھی درجہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔

کھجور میں موجود کیلشیم ہڈیوں کی مضبوطی اور پختگی میں اہم کردار کرتے ہیں نیز اس میں فاسفر (Phosphore) بھی موجود ہے۔ جس سے دماغ کے اصلی عناصر کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ اعصاب کو کمزوری اور خستگی سے بھی بچاتا ہے اور قوت بینائی کو زیادہ کرتی ہے۔

اس میں پوٹاشیم بھی موجود ہے جبکہ پوٹاشیم کی کمی ہی بدن میں کمی ہی زخم معده کی حقیقی وجہ سمجھی جاتی ہے نیز اس کا وجود پٹھوں اور بدن کے تانے بانے کے لئے بہت ہی قیمتی ہے دور حاضر کے غذا شناسوں میں یہ بات مشہور ہے کہ کھجور سرطان کو روکتی ہے کیونکہ اس سلسلے میں جو اعداد شمار مہیا ہوئے ہیں وہ نشانہ ہی کرتے ہیں کہ جن علاقوں میں کھجوریں زیادہ کھائی جاتی ہیں وہ سرطان کی بیماری میں کم مبتلا ہوئے ہیں۔ عرب کے بدو اور صحرائین جن کی زندگی فقر و فاقہ میں گزرتی ہے کھجور کھانے کے وجہ سے کبھی سرطان میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ کھجور میں میگنیشم (Magnesium) موجود ہے۔

ضرے میں شکر بہت ہے اور یہ شکر کی زیادہ صحیح اور بہتر قسم ہے یہاں تک کہ بعض مواقع پر شوگر کی بیماری میں مبتلا شخص بھی آرام کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

سائنس دانوں نے کھجور میں تیرہ قسم کی حیاتی مادے اور پانچ طرح کے مٹامن معلوم کئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے یہ ایک نہایت قیمتی اور بھرپور غذا ہے^(۴)

اسی بناء پر اسلامی روایات میں بھی اس کے بارے میں بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

کل التمر فان فيه شفاء من الادوائ

کھجور کھاؤ کہ اس میں بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔

نیز یہ بھی روایت ہے کہ حضرت علی (علیہ السلام) کی غذا اکثر اوقات روٹی اور کھجور پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک اور روایت ہے کہ:

جس گھر میں کھجور کا درخت نہیں اس کے رہنے والے در حقیقت بھوکے ہیں۔^(۵)

سورہ مریم کی آیات میں بھی آئے گا کہ حضرت مریم جس بیابان میں تھیں وہاں کچھ بھی نہ تھا جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں تازہ کھجور عطا کیں یہ اس طرف اشارہ ہے کہ زچہ کے لئے تازہ کھجور بہترین غذاؤں میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اس آیت می ذیل میں آنے والی روایات کے مطابق اس حالت میں عورتوں کے لئے بہترین دوا کھجور ہی ہے۔^(۶)

باقی رہا انگور تو غذا شناس ماہرین کے بقول یہ اس قدر موثر عوامل رکھتا ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک طبعی میڈیکل سٹور ہے۔ علاوہ ازیں انگور خواص کے لحاظ سے ماں کے دودھ کے قریب قریب ہے یعنی ایک مکمل غذا ہے انگور جس میں گوشت سے دگنی حرارت پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ یہ زہر کی ضد اور کاٹ ہے خون کی صفائی، جوڑوں کے درد کے علاج و رم کے آرام اور خون بڑھانے کے لئے یہ ایک موثر دوا ہے۔ انگور معدہ اور آنتوں جو غیر مشکوک کر دیتا ہے یہ نشاط آفریں ہے، اور رنج و غم کو برطرف کر دینے والا اعصاب کو تقویت پہنچاتا ہے اس میں موجود مختلف وٹامن انسان کو قوت بخشتے ہیں انگور ایک نہایت قیمتی غذا ہونے کے علاوہ جراثیم کشی کی بہت صلاحیت رکھتا ہے یہاں تک کہ سرطان کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی یہ ایک موثر عامل ہے۔^(۷)

اسی بناء پر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مروی ایک حدیث کے مطابق:

خیر طعامکم الخبز و خیر فاکھتکم العنب

تمہاری بہترین غذا روٹی اور بہترین پھل انگور ہے۔^(۸)

ان پھلوں کے بارے میں غذا شناسوں نے جو کچھ کہا ہے اور فراواں روایات جو ان کے بارے میں اس اسلامی مصادر میں آئی ہیں ہم وہ سب کچھ بیان کرنے لگیں تو یقیناً روش تفسیر سے ہٹ جائیں گے۔ مقصد یہ تھا کہ ہم واضح کریں کہ قرآن نے ان تین پھلوں کا ذکر بلاوجہ نہیں کیا اور شاید اس زمانے میں ان کے فوائد کا اہم حصہ لوگوں سے مخفی تھا۔

۳۔ تفکر تعقل اور تذکر

زہر بحث آیات میں نعمات الہی کو تین حصوں میں بیان کرنے کے بعد لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے فرق یہ ہے کہ ایک موقع پر قرآن کہتا ہے:

ان میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

دوسری جگہ کہتا ہے:

اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

تیسری جگہ کہتا فرماتا ہے:

ان میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو متذکر ہوتے ہیں۔

تعبیر کا یہ اختلاف یقیناً ازراہ تعفن نہیں ہے بلکہ جیسا کہ قرآن کی روش سے واضح ہوتا ہے ان میں سے ہر ایک کسی نکتے کی طرف اشارہ ہے شاید فرق کا پہلو یہ ہے کہ زمی کی انگارنگ نعمتوں کا مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ وہاں صرف تذکر اور یاد دہانی کافی ہے لیکن زراعت کا معاملہ اور زیتون کھجور، انگور اور کلی طور پر پھلوں کا مسئلہ ایسا ہے جس پر کچھ غور و فکر کرنا ضروری ہے تاکہ ان کی غذائی خواص اور علاج کے لئے ان کی اہمیت سے آشنائی ہو سکے لہذا اس ضمن میں ”تفکر“ کی دعوت دی گئی ہے۔

رہا سورج، چاند اور ستاروں کی تسخیر کا مسئلہ، نیز رات اور دن کے اسرار کا معاملہ تو اس کے لئے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہے لہذا ”تعقل“ کا ذکر آیا ہے گویا یہ عام غور و فکر سے بالاتر مسئلہ ہے۔

بہت حال قرآن کا روئے سخن ہر جگہ سوچ بچار کرنے والوں، اہل فکر و نظر اور صاحبان عقل کی طرف ہے۔

اس طرف توجہ کریں کہ قرآن ایک ایسے ماحول میں اترتا ہے جہاں جہالت کے سوا کسی چیز کی حکمرانی نہ تھی اس سے تعبیرات کی عظمت اور آشکار ہوتی ہے یہ امر ان لوگوں کے لئے دندان شکن جواب بھی ہے جو بعض خرافاتی مذاہب کی وجہ سے سچے مذاہب پر بھی سرخ لکیر کھینچ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب تو افیون ہے اور یہ فکر و نظر اور عقل و فہم کو بے کار کر دیتا ہے اور خدا پر ایمان لانا آدمی کی جہالت کی پیداوار ہے قرآن کی ایسی آیات تقریباً تمام سورتوں میں موجود ہیں جو وضاحت سے کہہ رہی ہے کہ سچا مذہب سوچ بچار اور تعقل کی پیداوار ہے اور اسلام ہر مقام پر سر و کار ہی اہل فکر و نظر اور اولوالالباب سے رکھتا ہے نہ کہ جاہل خرافات بلکنے والوں اور بے منطق روشن فکروں سے۔

۱۔ بعض بزرگ مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے ”المیزان“ میں ”قصد“ کو ”قاصد“ کے معنی میں لیا ہے کہ جو ”جائز“ (حق سے منحرف) کا الٹ ہے۔

۲۔ ”منھا“ کی ضمیر ”سبیل“ کی طرف لوٹتی ہے اور سبیل مؤنث مجازی ہے۔

۳۔ اسلام پرنشکٹ بی دارو۔

۴۔ کتاب ”اولین دانش گاہ و آخرین پیامبر“ جلد ۷ ص ۶۵۔ یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس کتاب کی ساتویں جلد میں غذاؤں ہی کے خواص بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں علاج کے طور پر کھجور اور خرما کے بارے میں و کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا مبالغہ ان دونوں غذاؤں کی اہمیت سے آشنا کرتا ہے۔

۵۔ سفینۃ البحار، جلد ۱ ص ۱۲۵۔

۶۔ سفینۃ البحار جلد ص ۱۲۵۔

۷۔ اولین دانش گاہ اور آخرین پیامبر۔ جلد ۷ ص ۱۰۱ و ص ۱۴۲۔

۸۔ اسلام پرنشکٹ بی دارو۔

آیات ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴

۱۴ ﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاحِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

۱۵ ﴿وَالَّذِي فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾ -

۱۶ ﴿وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ -

۱۷ ﴿أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾ -

۱۸ ﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ اللَّهَ لَعَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ -

ترجمہ

۱۴۔ وہ ذات وہی ہے جس نے (تمہارے لئے) دریا کو مسخر کیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھا سکو اور لباس کے لئے اس سے وسائلِ زینت نکالو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ دریا کا سینہ چیرتی ہیں تاکہ تم (تجارت کر سکو اور) فضلِ خدا سے بہرہ مند ہو شاید تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

۱۵۔ اور اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑ دیا تاکہ تمہیں اس کی حرکت اور لرزے سے محفوظ رکھے اور اس نے دریا پیدا کئے اور راستے بنائے تاکہ تمہیں ہدایت حاصل ہو۔

۱۶۔ اور اس نے نشانیاں پیدا کیں اور (رات کے وقت) ان (لوگوں) کی ستاروں کے ذریعے راہنمائی کی گئی ہے۔

۱۷۔ کہ خلق کرنے والا اس کی مانند ہے جو خلق نہیں کرتا کیا تم خیال نہیں کرتے۔

۱۸۔ اور اگر تم نعماتِ خدا کو گننا چاہو تو ہرگز شمار نہیں کر پاؤ گے۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

پہاڑ، دریا اور ستارے نعمت ہیں:

ان آیات میں انسان کو حاصل کچھ اور اہم نعماتِ الہی کا ذکر ہے یہاں بات دریاؤں سے شروع کی گئی ہے کہ جو انسانِ زندگی کا بہت اہم منبع ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: جس نے دریاؤں اور سمندروں کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے اور انہیں تمہاری خدمت پر مامور کیا ہے۔ ﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ﴾ -

ہم جانتے ہیں کہ زمین کا زیادہ تر حصہ دریاؤں اور سمندروں پر مشتمل ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ زندگی کی پہلی نپل دریا سے پھوٹی۔ اس وقت بھی دریا اور سمندر انسانوں اور زمین کی تمام موجودات کی زندگی کو جاری رکھنے کے لئے اہم منبع ہیں انھیں خدمتِ بشر یا مہر کرنا خدا تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔

اس کے بعد دریاؤں کے تین فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ۔ (لَتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا)۔ وہ گوشت کہ جس کی پرورش کی زحمت تم نے نہیں اٹھائی۔ صرف خدا کے دستِ قدرت نے انھیں سمندروں اور دریاؤں میں پالا ہے اور تمہیں یہ مفت حاصل ہوا ہے۔

اس گوشت کی یازگی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اس نے زمانے میں بھی پرانا اور باسی گوشت، لٹا تھا اور ہمارے اس زمانے میں بھی اس صورت حال پر نظر رہے تو اس نعمت کی اہمیت اور تازہ گوشت سے غذا تیار کر کے کھانے کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

انسان کی مادی زندگی اور تمدن میں بہت ترقی ہوئی اس کے باوجود آج بھی دریا اور سمندر انسانی غذا کا ایک اہم منبع ہیں ہر سال لاکھوں ٹن گوشت جسے لطف پروردگار کے دستِ مبارک نے انسانوں کے لئے پالا ہے دریا اور سمندر سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس وقت جب انسان زمین پر بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر اور ابتدائی مطالعہ کے بعد بعض لوگ آئندہ غذائی کمی ہو جانے کا احساس کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ غذائیں آئندہ کی یہ متوقع کمی ڈراتی ہے لیکن سائنس دانوں کی توجہ دریاؤں اور سمندروں کی طرف ہے انھوں نے ان کی طرف چشمِ امید لگائی رکھی ہے ان کا خیال ہے کہ مختلف النوع مچھلیاں پال کر اور ان کی نسل کو بڑھا کر اس کمی کو بہت حد تک پورا کیا جاسکتا ہے دوسری طرف سائنس دانوں نے دریاؤں کے پانی کو آلودگی سے اور مچھلیوں کی نسل کی تباہی سے بچانے کے لئے قوانین اور طریقے بھی وضع کیے ہیں ان کے مجموعی مطالعے سے قرآن کے مذکورہ جملے کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جو کہ چودہ سو سال پہلے نازل ہوا ہے۔

سمندروں سے ملنے والی چیزوں میں سے زینت اور بناؤ سنگار کے کام آنے والی چیزیں بھی ہیں لہذا قرآن مزید کہتا ہے تاکہ اس سے پہننے کے لئے زینت کی چیزیں نکال سکو ﴿وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا﴾۔

انسان چوپایوں کی طرح ذوق سے محروم نہیں بلکہ روحِ انسانی کے چار مشہور پہلو ہیں ان میں سے ایک جمالیاتی حس ہے یہی ذوق حقیقی شعر اور ہنر کی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کا روحانی پہلو بشری زندگی میں بہت مؤثر ہے لہذا صحیح طریقے سے، افراد و تفریط سے بچتے ہوئے اس پہلو کی ضروریات بھی پوری کرنی چاہئیں۔

جو لوگ جمال پرستی اور زینتوں اور لذتوں میں غرق ہیں وہ اسی طرح گمراہ ہیں جیسے وہ خشک افراد کہ جو ہر قسم کی زینت کے مخالف ہیں ان میں سے ایک گروہ افراد میں مبتلا ہے اور دوسرا تفریط میں۔ ایک گروہ سرمایے کو ضائع کرنے، طبقاتی فاصلے پیدا کرنے اور معنویات کو قتل کرنے کا باعث ہے جبکہ دوسرا جمود اور ٹھہراؤ کا باعث ہے۔

اسی بناء پر اسلام میں معقول طریقے سے اور فضول خرچی سے بچتے ہوئے زیب و زینت سے استفادہ کی اجازت دی گئی ہے مثلاً اچھے لباس پہننے، مختلف قسم کے عطر استعمال کرنے بعض قیمتی پتھروں سے استفادہ کرنے کی سفارش کی گئی ہے خصوصاً عورتوں کے لئے چونکہ وہ زیب و زینت کی طرف فطری طور پر زیادہ رغبت رکھتی ہیں لیکن ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ فضول خرچی سے خالی ہونا چاہیے۔

آخر میں تیسری دریائی نعمت کا ذکر ہے اور وہ ہے اس میں کشتیوں کا چلنا جو کہ انسان اور اس کی ضروریات کی نقل و حمل کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ فرمایا گیا ہے: کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ سمندر کا سینہ چیرتی ہیں ﴿وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرَ فِيهِ﴾۔ کشتی پر بیٹھے ہوئے لوگ جب صفہ سمندر پر چل رہے ہوتے ہیں تو یہ منظر کس قدر قابل دید ہوتا ہے ”خدا نے یہ نعمت تمہیں بخشی ہے تاکہ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور راہ تجارت میں اس کے فضل و کرم سے استفادہ کرو ﴿وَلْتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾

۔ (۱)

ان سب نعمتوں کی طرف متوجہ ہونے سے تم میں احساس ذمہ داری پیدا ہو تو ”شاید اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ“ ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾۔

لفظ ”فلک“ کشتی کے معنی میں ہے مفرد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ”مواخر“ ”ماخر“ کی جمع ہے اس کا مادہ ”مخر“ ہے جو پانی کو دائیں بائیں سے چیرنے کے معنی میں ہے کشتیاں چونکہ چلتے وقت پانی کا سینہ چیرتی ہیں اس لئے انھیں ”ماخر“ یا ”ماخرۃ“ کہتے ہیں۔

اصولاً وہ کون ہے جس نے اس مادہ میں یہ خاصیت رکھی ہے جس سے کشتی بنائی جاتی ہے کہ وہ پانی کے اوپر ٹھہر سکے اگر ہر چیز پانی سے زیادہ بھاری ہوتی اور پانی کا مخصوص دباؤ بھی نہ ہوتا تو ہم سمندر کے بیکراں صحنے پر کبھی بھی نہیں چل

سکتے تھے نیز وہ کون ہے جو سمندروں کی سطح پر منظم ہواؤں کی چلاتا ہے اور وہ کون ہے جس نے بخارات میں یہ طاقت پیدا کی ہے کہ ان سے ہم سمندر پر انجن والی کشتیاں چلا سکیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک عظیم نعمت نہیں ہے۔

سمندری راستے خشکی کی سڑکوں اور شاہراہوں کی نسبت بہت وسیع، بہت کم خرچ اور زیادہ مہیا ہوتے ہیں۔ بعض دیو قامت بحری جہاز شہروں کی طرح وسیع ہوتے ہیں اور اس طرح انسانوں کو حمل و نقل کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہاتھ آیا ہے ہم اس طرف توجہ کریں تو کشتی رانی کے لئے سمندروں کی نعمت کی عظمت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

سمندروں اور دریاؤں کے نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن سخت اور مضبوط پہاڑوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑ پھاڑ دیئے گئے ہیں تاکہ اسے لرزے اور حرکت کرنے سے بچایا جائے اور تم اس پر آرام و اطمینان سے رہ سکو ﴿وَالْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ﴾ - (۲)

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ پہاڑوں کی بنیادیں اور جڑیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور باہم وابستہ اور پیوستہ ہیں اور زرہ کی طرح زمین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں یہ چیز اندرونی گیس کے سبب ہر لمحہ ممکن ہے سرزنش سے زمین کو بہت حد تک بچائے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں پہاڑوں کی خاص وضع پانی کے مد جزر کے مقابلے میں زمین کی جلد کی قوت مدافعت کو بڑھاتی ہے ورنہ اس پر پانی کے مد جزر کے اثر کو بہت کم کر دیتی ہے اسی طرح پہاڑ زمین پر آنے والے شدید طوفان کو قوت اور ہواؤں کی حرکت کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کی ہموار سطح تیز آندھیوں اور طوفان کی زد میں رہتی اور اس حالت میں اس کے لئے سکون ممکن نہ تھا۔

نیز پہاڑ چونکہ اصل خزانوں میں سے ہیں (برف کی صورت میں یا اندرونی طور پر ان میں پانی ہوتا ہے) لہذا ان کے ساتھ ہیں فوراً دریاؤں اور نہروں کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: اور تمہارے لئے دریا اور نہریں پیدا کی گئی ہیں ﴿وَأَنْهَارًا﴾ -

ممکن تھا کہ پہاڑوں کی وجود سے یہ تو ہم پیدا ہوتا کہ وہ زمین کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں اور راستوں کو بند کر دیتے ہیں لہذا مزید فرمایا گیا ہے اور تمہارے لئے راستے بنائے گئے ہیں تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ

تَهْتَدُونَ﴾ - (۳)

یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کہ دینا میں پہاڑوں کے بڑے بڑے سلسلوں میں کٹاؤ موجود ہے جس سے انسان ان کے درمیان سے اپنا راستہ بنا لیتا ہے اور بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ پہاڑ زمین کے حصوں کو بالکل ہی ایک دوسرے سے الگ کر دیں۔

راستہ چونکہ نشانی اور علامت اور راہنما کے بغیر انسان کو مقصد تک نہیں پہنچاتا لہذا راستے کی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد ان نشانیوں اور علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: اور علامتیں قرار دی گئی ہیں ﴿وَعَلَامَاتٍ﴾۔ یہ علامتیں مختلف قسم کی ہیں پہاڑوں کی شکل و صورت، درے اور ان کا ایک دوسرے سے کٹاؤ اور علیحدگی، زمین کا نشیب و فراز، مختلف رنگ کی مٹی، پہاڑوں کے مختلف رنگ یہاں تک کہ ہر ایک میں چلنے والی ہواؤں کی کیفیت راستے تلاش کرنے کے لئے علامتیں ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ یہ علامتیں مسافروں کے لئے کس قدر مددگار ہیں یہ انھیں منزل سے دور ہو جانے اور کھو جانے سے بچاتی ہیں بعض بیابان ایک ہی طرز کے ہوتے ہیں انھیں عبور کرنا بہت زیادہ مشکل اور خطرناک ہے ایسے ایسے بیابان ہیں کہ کتنے ہی لوگ ان میں گئے ہیں اور پھر پلٹ کر نہیں آئے۔ غور کیجئے کہ اگر اسی طرح ساری زمین ایک ہی طرز اور کیفیت کی ہوتی، پہاڑ ایک جیسے ہوتے۔ سب دشت و بیابان ایک ہی رنگ کے ہوتے اور درے ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے تو کیا پھر انسان آسانی سے اپنے راستے معلوم سکتے؟

بعض اوقات انسان تاریک راتوں میں بیابانوں میں سفر کرتا ہے یا رات کو وسط سمندر میں سفر کرتا ہے اور اس کے لئے ایسی کوئی علامات نہیں ہوتیں ایسے کوئی علامات نہیں ہوتیں ایسے میں اللہ تعالیٰ آسمانی علامتوں کو مدد کے لئے بھیجتا ہے تاکہ اگر زمین میں کوئی علامت نہیں ہے تو مسافر آسمانی علامت سے استفادہ کریں اور بھٹک نہ جائیں لہذا مزید فرمایا گیا ہے اور ستاروں کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کی جاسکتی ہے ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾۔

البتہ یہ ستاروں کے فوائد میں سے ایک کا ذکر ہے ورنہ ان کے بہت سے فوائد ہیں تاہم اگر ان کا صرف یہی فائدہ ہوتا تو بھی اہم تھا اگرچہ اب تو کشتیاں قطب نما کی مدد سے تیار کردہ نقشوں کے مطابق اپنا راستہ معین کر لیتی ہیں لیکن قطب نما کی ایجاد سے پہلے تو سمندروں میں ستاروں کی مدد کے بغیر چلنا ممکن ہی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ رات کو جب بادل آسمان پر چھا لئے ہوتے تھے کشتیاں رک جاتی تھیں اور اگر وہ ایسے میں چلتی رہتیں تو انھیں موت کا خطرہ درپیش رہتا۔

البتہ ہم جانتے ہیں کہ جو ستارے آسمان میں ہمیں اپنی جگہ بدلتے نظر آتے ہیں وہ پانچ سے زیادہ نہیں ہیں گویا یہ سیاہ کپڑے کو افق کی ایک طرف سے کھینچ کر دوسری طرف لے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ثوابت کی حرکت مجموعی ہے لیکن سیاروں کی حرکت انفرادی ہے اور دیگر ستاروں سے ان کا راستہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں ثابت ستاروں کی مختلف شکلیں ہیں جو ”اشکال فلکی“ کے نام سے مشہور ہیں اور چاروں سمتیں (مشرق، مغرب، شمال، جنوب) معلوم کرنے کے لئے ان شکلوں کی پہچان بہت مفید ہے۔

پروردگار کی ان عظیم نعمتوں اور پوشیدہ الطاف کا ذکر کرنے کے بعد قرآن انسانی وجدان کو فیصلے کی دعوت دیتا ہے کیا پیدا کرنے والا اس کی طرح جو پیدا نہیں کرتا، کیا تم خیال نہیں کرتے ﴿أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾۔

یہ تربیت کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ قرآن نے اس سے بہت سے مواقع پر استفادہ کیا ہے۔ قرآن سوالیہ طریقے سے مسائل پیش کر دیتا ہے اور ان کا جواب ان پر چھوڑ دیتا ہے جن کا وجدان پیدا ہے۔ قرآن اس طریقے سے لوگوں کے احساس کو ابھارتا ہے تاکہ جواب ان کی روح کے اندر سے اٹھے اور پھر وہ اسے قبول کر لیں اور اس جواب سے اس طرح محبت کریں جیسے وہ اپنے وجود سے پیدا ہونے والی اولاد سے کرتے ہیں۔

اصول طور پر علم نفسیات کی رو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ صحیح تعلیم و تربیت کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جانا چاہئیے اس طرح کی جسے تعلیم دی جا رہی ہو وہ مطالب نکلیں اسے یہ احساس نہ ہو کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو باہر سے اس پر ڈالی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ ان مطالب کو اپنے پورے وجود کے ساتھ قبول کرے اور ان کا دفاع بھی کرے۔

اس نکتے کا تکرار بھی ضروری ہے کہ وہ مشرکین جو مختلف بتوں کے سامنے ریزہ ہوتے ہیں ان کا کبھی یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ بت پیدا کرتے ہیں اور وہ خالق ہیں بلکہ وہ بھی خلقت کو اللہ کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے: کیا ان نعمتوں کے خالق کے سامنے سجدہ کرنا چاہئیے یا ان کے سامنے جو ایک ناپسندیدہ مخلوق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور جنہوں نے کبھی کسی چیز کو خلق نہیں کیا اور نہ وہ خلق کر سکتے ہیں۔

آخر میں اس بناء پر کہیں کوئی یہ خیال نہ کرے کہ نعمتِ الہی انہی چیزوں پر منحصر ہے، قرآن کہتا ہے: اور اگر خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو یہ تمہارے بس میں نہیں ﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا﴾۔

سرتاپا تمہارا وجود اس کی نعمتوں میں مستغرق ہے ہر سانس جو اندر اور باہر آتا ہے یہی دو نعمتیں نہیں۔ لمحہ بھر میں ہزاروں نعمتیں ہیں اور ہر نعمت پر ایک شکر واجب ہے ہماری عمر کے گزرنے والے ہر لمحے کے لئے ہمارے بدن کے اندر اور باہر لاکھوں زندہ اور بے جان موجود کام کرتے ہیں جن کی فعالیت کے بغیر لمحہ بھر کی زندگی ممکن نہیں۔

اصولاً ہم تمام نعمتوں سے آگاہ نہیں۔ انسانی علم و دانش کا دامن جتنا پھیلتا رہا رہا ہے ان نعمتوں کے نئے افق ہم پر کھلتے جارہے ہیں ایسے افق کہ جو بے کنار ہیں کیا ان حالات میں ہم خدا کی نعمتیں شمار کر سکتے ہیں؟

اس وقت سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم کس طرح اس کے شکر کا حق ادا کر سکتے ہیں اس حالت میں کیا ہم ناشکروں کے زمرے میں نہیں آئیں گے؟ اس سوال کا جواب قرآن اس آیت کے آخری جملے میں دیتا ہے، کہتا ہے: خدا غفور و رحیم ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَعَفُورٌ رَحِيمٌ﴾۔

جی ہاں! اللہ اس سے زیادہ مہربان اور بزرگوار ہے کہ اپنی نعمتوں پر شکر کی طاقت نہ ہونے پر تمہارا مواخذہ کرے اگر تم یہ جان لو کہ تم سرتاپا اس کی نعمت میں غرق ہو اور اس کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو اور اپنا عذر کوتاہی اس کی بارگاہ میں پیش کرو تو تم نے اس کا بہت شکر ادا کیا ہے ورنہ وہ شکر کہ جو اس کی خداوندی کے لائق ہے کوئی ادا نہیں کر سکتا لیکن یہ سب کچھ اس میں مانع نہیں کہ ہم مقدور بھر اس کی نعمتوں کو شمار کریں کیونکہ جس قدر جہاں بینی اور جہان شناسی میں اضافہ ہوتا جائے گا معرفت الہی میں بھی اضافہ ہوگا اور عشق الہی کا نور بھی دل میں زیادہ ضیا پاش ہوگا۔ اس کی نعمتوں پر غور ہمارے احساس گزاری کو بھی متحرک کرتا ہے اسی لئے دیان دین اپنے ارشادات میں بلکہ اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں بھی اس کی کچھ بے پایاں نعمتوں کو بیان کیا کرتے تھے تاکہ دوسروں کے لئے سبق ہو۔

شکر نعمت کے بارے میں اور اس بارے میں کہ انسان پروردگار کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتا ہم سورہ ابراہیم کی آیہ ۳۴ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

۱۔ ”وَلْيَتَنَبَّهُوا مِنْ فَضْلِهِ“ واؤ عطف کے ساتھ آیا ہے اس کا کوئی معطوف علیہ ہونا چاہیے قاعدہ مقدر ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے ”لَتَنْفَعُوا بَهَا وَلَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ“ تم دیکھتے ہوئے کشتیاں پانی کا سینہ چیرتی ہیں تاکہ تم اس سے مختلف فائدے اٹھا سکو اور تجارت کے لئے اس سے بہرہ ور ہو سکو۔

۲۔ ”ان تمید بکم“ تقدیر میں یوں تھا ”لَفَلَا تَعْبُدُ بَکُمْ“ یا ”کَرَاهَا انْ تَعْبُدَ بَکُمْ“ تاکہ وہ تمہیں بلا وجہ نہ سے یا تمہیں حرکت دینے کو ناپند کرتے ہوئے۔

۳۔ بہر حال مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کے عملی معجزات میں سے ہے۔ یہ بات کم از کم اس زمانے میں لوگوں پر ابھی منکشف نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لئے ہماری کتاب ”قرآن و آکرین پیامبر“ دیکھئے۔

نکتہ

راہ، نشانی اور رہبر

مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ زمین کے راستوں کا ذکر ایک نعمت الہی کے طور پر آیا ہے کیونکہ راستے تمدن انسانی کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ اسی لئے ترقی کاموں میں سب سے پہلے مناسب راستہ بنانے کی فکر کی جاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی قسم کی آباد کاری اور انسانی فعالیت ممکن نہیں۔

بہر حال ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں قرآن کا بیان انسان کی روحانی اور معنوی زندگی کے لئے نمونے کے طور ہو کیونکہ ہر مقدس ہدف تک پہنچنے کے لئے سب سے پہلے صحیح راستے کا انتخاب ضروری ہے تیر راستے کے علاوہ علامات اور نشانیوں کا وجود بھی زندگی کے لئے بہت اہم ہے کیونکہ ایک دوسرے سے مشابہ راستے بہت ہیں اور ان میں سے اصلی راستہ بھول جانا بہت ممکن ہے۔ ایسے مواقع پر ”علامات“ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

خصوصاً وہ مومنین جنہیں قرآن نے ”متوسمین“ (ہوشیار) کہا ہے انھیں چاہیئے کہ ان نشانیوں کے حوالے سے پہچانیں اور حق کی نشانیوں کو دیکھ کر اسے باطل سے جدا طور پر پہچانیں۔ اسی طرح رہبر و رہنما کا مسئلہ بھی محتاج وضاحت نہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی بہت سی روایات میں ”نجم“ سے رسول اللہ اور ”علامات“ سے آئمہ مراد لی گئی ہے۔ بعض روایات میں ”نجم“ اور ”علامات“ دونوں سے آئمہ اور ہادیانِ راہِ حق مراد لی گئی ہے ہم یہاں ان میں سے چند ایک احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ (علیہ السلام) نے فرمایا:

النجم رسول الله و العلامات الائمة علیہم السلام

ستارہ رسول اللہ کی طرف اور علامات آئمہ علیہم السلام کی طرف اشارہ ہے۔^(۱)

بعینہ یہی مضمون امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔

۲۔ ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا:-

نحن النجم

ہم ستارے ہیں۔^(۲)

۳۔ ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول اللہ نے حضرت علی (علیہ السلام) سے فرمایا: انت نجم بنی ہاشم

تم بنی ہاشم کا ستارہ ہو۔^(۳)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے حضرت علی (علیہ السلام) سے فرمایا: انت احد العلامات
علامات میں سے ایک تم ہو۔

یہ سب روایات مندرجہ بالا آیات کی معنوی تفسیر کی طرف اشارہ ہیں۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

۲۔ (تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵)۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

آیات ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳

- ۱۹۔ ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ﴾
 ۲۰۔ ﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ﴾ -
 ۲۱۔ ﴿أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ -
 ۲۲۔ ﴿إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ﴾ -
 ۲۳۔ ﴿لَا جَزَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ﴾ -

ترجمہ

- ۱۹۔ جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم اعلانیہ کرتے ہو اللہ سب کو جانتا ہے۔
 ۲۰۔ خدا کے علاوہ وہ جن معبودوں کو پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں۔
 ۲۱۔ وہ بے جان موجودات ہیں جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں اور انھیں معلوم نہیں کہ ان کی عبادت کرنے والے کب محشور ہوں گے۔
 ۲۲۔ تمہارا معبود خدائے یکتا ہے لیکن جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل حق کا انکار کرتے ہیں اور وہ بڑے بن بیٹھے ہیں۔
 ۲۳۔ جسے وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں یقیناً خدا اس سب سے باخبر ہے۔ اور وہ مستکبرین کو پسند نہیں کرتا

مردہ اور بے شعور معبود

تفسیر

جن معبودوں کو وہ پکارتے ہیں وہ مردہ ہیں اور شعور نہیں رکھتے

گذشتہ آیات میں خدا کی ان دو نہایت اہم صفات کی طرف اشارہ تھا جن میں سے کوئی بھی بتوں اور تراشے ہوئے معبودوں میں نہیں تھی یعنی موجودات کا خالق ہونا اور نعمتیں عطا کرنا۔

زیر نظر پہلی آیت میں معبود حقیقی کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے علم اور دانائی۔ ارشاد ہوتا ہے: جسے تم پنہاں رکھتے ہو اور جسے تم آشکار کرتے ہو خدا سب کو جانتا ہے (وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسْرُونَ وَمَا تَعْلِنُونَ)۔ پھر تم پھر بتوں کے پیچھے کیوں جاتے ہو کہ جن کائنات کی خالقیت میں ذرہ برابر بھی حصہ نہیں۔ نہ جنہوں نے تمہیں کوئی چھوٹی سی چھوٹی نعمت بخشی ہے اور نہ جو تمہارے پوشیدہ اسرار اور ظاہری اعمال کو جانتے ہیں یہ کیسے معبود ہیں کہ جن میں ضرورت کی ایک بھی صفت نہیں۔

اس کے بعد قرآن دوبارہ مسئلہ خالقیت کی طرف لوٹتا ہے لیکن اس کے مشابہ آنے والی پہلی آیت سے بات کچھ آگے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جن معبودوں کو وہ پکارتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ کوئی چیز خلق نہیں کرتے بلکہ خود بھی مخلوق ہیں۔ ﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ﴾۔

اب تک تو بحث اس بارے میں تھی کہ وہ خالق نہیں ہیں لہذا لائق عبادت نہیں ہو سکتے اب فرمایا گیا ہے کہ وہ تو خود مخلوق ہیں، نیاز مند ہیں۔ اور اس صورت میں وہ انسانوں کا سہارا کیسے ہو سکتے ہیں۔ کس طرح ان کی مشکل کشائی کر سکتے ہیں؟ یہ کیسا احمقانہ فیصلہ ہے۔

علاوہ ازیں وہ تو ”مردہ“ ہیں۔ انہوں نے زندگی کی بوتل نہیں سونگی اور نہ اس کی استعداد رکھتے ہیں ﴿أَمْ مَوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ﴾۔

کیا معبود کو موجود زندہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جو اپنے عبادت کرنے والوں کی نیاز، حاجت اور عبادت سے باخبر ہو۔ لہذا معبود حقیقی کی چوتھی صفت یعنی ”حیات“ بھی ان میں بالکل نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: یہ بت بالکل نہیں جانتے کہ ان کی عبادت کرنے والے کس وقت اور کس زمانے میں مبعوث ہوں گے ﴿وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾۔

ثواب اور جزا ان کے ہاتھ میں ہوتی تو انہیں کم از کم اپنے عبادت گزاروں کے پھر سے جی اٹھنے کا تو پتہ ہوتا ہے۔ اس جہالت کے ہوتے ہوئے ہو کس طرح لائق عبادت ہو سکتے ہیں یہ پانچویں صفت ہے جو معبود حقیقی میں ہونا چاہیے جبکہ وہ اس سے محروم ہیں۔^(۱)

مشرکین اور ان کے بت دونوں ہی جہنم میں ہوں گے۔

لیکن واضح ہے کہ اگر یہ مراد ہو تو پہلے اور بعد کی آیات میں مناسب ربط نہیں ہوگا لہذا صحیح تفسیر وہی ہے جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں (غور کیجئے گا)۔

اب تک ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ بت اور بت پرستی کا قرآن کی منطق میں وسیع مفہوم ہے ہر موجود یا ہر شخص جسے ہم خدا کے بدلے سہارا قرار دے لیں اور اپنی تقدیر اس کے ہاتھ میں سمجھیں وہ ہمارا بت شمار ہوگا لہذا جو کچھ مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے وہ ان لوگوں کے بارے میں بھی ہے جو ظاہراً بت پرست نہیں ہیں لیکن ایک سچے مومن کا سا استقلال نہیں رکھتے وہ وہ جو کمزور بندوں کو اپنا سہارا بناتے ہیں اور آزادی کی بجائے وابستگی اور دوسروں پر انحصار کی زندگی گزارتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عالمی سوپر طاقتیں مشکلات میں ان سہارا بن سکتی ہیں جبکہ یہ طاقتیں جہنمی اور خدا سے بیگانہ ہیں ایسے لوگ بھی عملی طور بت پرست اور مشرک ہیں اور ہمیں ان سے کہنا چاہیے کہ کیا تمہارے ان معبودوں نے کوئی چیز خلق کی ہے کیا وہ کسی نعمت کا سرچشمہ ہیں؟ کیا یہ تمہارے اندرونی اسرار سے آگاہ ہیں۔

کیا وہ جانتے ہیں کہ تم کب اپنی قبروں سے اٹھو گے کہ تمہیں تمہاری جزایا سزا دے سکیں۔ پس کیوں ان کی بتوں کی سی پرستش کرتے ہو۔

بتوں کی صلاحیت کی نفی پر ان واضح دلائل کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: تمہارا الہ واحدی ہے ﴿إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ﴾۔

مبداء و معاد چونکہ ہر جگہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں لہذا بلافاصلہ مزید فرمایا گیا ہے وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور فطرتاً مبداء کے بارے میں بھی ٹھیک ایمان نہیں رکھتے۔ (ان کے دل حقیقت کے منکر ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں مستکبر بنے ہوئے ہیں ﴿فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ﴾)۔^(۲)

ورنہ توحید کے دلائل تو متلاشیان حق کے لئے اور حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والوں کے لئے آشکار ہیں۔ ایس طرح معاد کے دلائل بھی واضح ہیں۔ اسکبار اور تکبر اور حق کے سامنے سر نہ جھکانے کے سبب وہ ہمیشہ انکار ہی کرتے ہیں یہاں تک کہ حسی حقائق کے بھی منکر ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ ان کا یہ طرز عمل ان میں رچ بس جاتا ہے اور اس کے عادت کے ہوتے ہوئے حق کی کوئی بات اور دلیل و منطق ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

بت، پرستش کے لائق نہیں اس سلسلے میں گذشتہ آیات میں جو زندہ دلائل گزر چکے ہیں کیا وہ کافی نہیں کہ ہر ذی شعور تصدیق کرے کہ بت لائق عبادت نہیں لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں یہ لوگ پھر بھی حقیقت قبول نہیں کرتے۔

زیر بحث آخری آیت میں ہم پھر دیکھتے ہیں۔ غیب و شہود اور پنہاں و آشکار پر خدا کی آگاہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: جسے تم پنہاں رکھتے ہو اور جسے تم آشکار کرتے ہو یقیناً خدا اس سے باخبر ہے ﴿لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسْرُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾۔

یہ جملہ در حقیقت کفار اور دشمنان حق کے لئے ایک دھمکی ہے کہ خدا تمہاری حالت سے ہر گز غافل نہیں ہے وہ نہ صرف ان کے ظاہر کو جانتا ہے بلکہ ان کے باطن سے بھی آگاہ ہے اور موقع آنے پر ان سے حساب لے گا۔ وہ مستکبر ہیں اور ”خدا مستکبرین کو پسند نہیں کرتا“ ﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ﴾۔ کیونکہ حق کے سامنے استکبار اور تکبر خدا سے بیگانگی کی پہلی دلیل ہے۔

لفظ ”لا جرم“ ”لا“ اور ”جرم“ کا مرکب ہے یہ لفظ عام طور پر تاکید کے لئے اور قطعاً اور یقیناً کے معنی میں آتا ہے اور کبھی ”لابد“ (ناچار) کے معنی میں آتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات قسم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: ﴿لَا جَرَمَ لافعلن﴾

میں قسم کھاتا ہوں کہ کام کروں گا۔

ربا یہ سوال کہ ”لا جرم“ سے یہ معانی کیسے معلوم ہوئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ”جرم“ دراصل درخت سے پھل چننے اور توڑنے کے معنی میں ہے اور جب اس کے شروع میں ”لا“ لگا دیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اسے توڑ اور کاٹ نہیں سکتی اس طرح اس سے مسلماً، ناچار اور کبھی قسم کا مفہوم حاصل ہو جاتا ہے۔

۱۔ ”أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ“ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے دیگر احتمالات بھی ذکر کئے ہیں ان میں سے ایک کے مطابق یہاں مراد یہ ہے کہ بت نہیں جانتے کہ وہ کب مبعوث ہوں گے اس سلسلے میں مفسرین نے بعض آیات سے شواہد بھی پیش کئے ہیں۔ سورہ انبیاء کی آیت ۶۸ میں خدا فرماتا ہے:

۲۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ”فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ“ میں فاء تفریع کے لئے ہے۔ قیامت و مبعوث ہونے کا انکار مبداء کے انکار کی وجہ سے ہے اور ان سرچشمہ استکبار ہے۔

مستکبر کون ہیں؟

قرآن مجید کی چند آیات میں ”استکبار“ کفار کی ایک خاص صفت کے عنوان سے استعمال ہوا ہے ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ”تکبر“ کرتے ہوئے حق کو قبول نہ کرنا ہے۔ سورہ نوح کی آیہ ۷ میں ہے:

﴿وَانِیْ کَلِمًا دَعَوْتَهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا اَصَابِعَهُمْ فِیْ اِذْخٰهُمْ وَاسْتَغْنٰوْا ثِیَابَهُمْ وَاصْبَرُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا اِسْتَكْبَارًا﴾

میں اپنے میں سے اس بے ایمان گروہ جو دعوت دیتا ہوں تاکہ تیری عفو و بخشش ان کے شامل حال ہو تو اس دعوت پر وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے لباس کے نیچے چھپالتے ہیں اور گراہی پر اصرار کرتے ہیں اور حق کے سامنے استکبار کرتے ہیں۔

نیز سورہ منافقین کی آیہ ۵ میں ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رءِیًّا وَهُمْ یَصْطَدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ﴾۔

اور جب ان سے کہو کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمہارے لئے بخشش و مغفرت طلب کرے تو وہ نافرمانی کرتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ لوگوں کو راہ حق سے روکتے ہیں اور استکبار کرتے ہیں۔

اور سورہ جاثیہ کی آیت ۸ میں اسی گروہ کے بارے میں ہے: ﴿یَسْمَعُ آٰیَاتِ اللَّهِ تَتْلٰی عَلَیْهِ ثُمَّ یَصِرْ مُسْتَكْبِرًا کَانَ هُمْ

یَسْمَعُهَا﴾

اللہ کی آیات انہیں سنائی جاتی ہیں وہ سنتے ہیں لیکن اس کے باوجود کفر پر اس طرح سے اصرار کرتے ہیں گویا انہوں نے یہ آیت سی ہی نہیں۔

در حقیقت بدترین استکبار یہی ہے کہ حق کو قبول کرنے کی بجائے تکبر کیا جائے کیونکہ ہدایت کے تمام راستے انسان کے سامنے بند کر دیتا ہے اور وہ ساری عمر بد بختی، گناہ اور بے ایمانی میں بھٹکتا رہتا ہے۔

نبیؐ البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں حضرت علیؑ علیہ السلام نے صراحت سے شیطان کو ”سلف المستکبرین“ (تکبر کرنے والوں کا سربراہ) قرار دیا ہے کیونکہ اس نے پہلا قدم ہی اٹھایا کہ حق کی مخالفت کی اور اس حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا کہ آدم اس سے زیادہ کامل ہیں اسی طرح وہ تمام افراد جو حق کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیتے ہیں مالی طور پر تہی دست ہو یا دو لہتمند وہ مستکبر ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اکثر اوقات زیادہ مالی طاقت ہی کے سبب انسان حق کو قبول کرنے سے روگردانی کرتا ہے۔

روضۃ الکافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:
و من ذهب یری ان له علی الآخرة فضلا فهو من المستکبرین ، فقلت انما یری ان له علیہ فضلا بالعافیة اذا راہ
مرتکباً للمعاصی ؟ هیہات هیہات ! فعله ان یکون قد غفرله ماتی ، و انت موقوف تحاسب ، اما تلوت قصة سحرة
موسیٰ (ع)

جو شخص دوسرے پر برتری اور امتیاز کا قائل ہو وہ مستکبرین میں سے ہے۔
راوی کہتا ہے: میں نے امام سے پوچھا کیا اس میں کوئی صرح ہے کہ انسان کسی کو گناہ میں مشغول دیکھے اور خود اس
نے چونکہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا لہذا اس پر اپنی برتری اور امتیاز سمجھے؟
امام نے فرمایا:

تو نے اشتباہ اور غلطی کی ہے ہو سکتا ہے کہ خدا بعد ازاں اس کا گناہ بخش دے اور تجھے حساب کے لئے کھڑا رکھے۔
کیا تو نے قرآن میں زمانہ موسیٰ کے جادو گروں کا قصہ نہیں پڑھا (کہ وہ فرعون کے انعام و اکرام کی خاطر اور اس کے دربار
میں تقرب حاصل کرنے کے لئے، اللہ کے ایک اولوالعزم پیغمبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔
لیکن جو نہی انھوں نے حق کا چہرہ دیکھا فوراً اپنا راستہ بدل لیا یہاں تک کہ فرعون کی طرف سے قتل کی دھمکیاں سن کر
بھی وہ ڈرتے رہے اور خدا تعالیٰ نے انھیں اپنی عفو و بخشش اور رحمت و مہربانی سے نوازا) (۱)۔

آیات ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹

۲۴۔ ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أُنْزِلَ رُبُّكُمْ قَالُوا أَصَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾ -

۲۵۔ ﴿لِيُخْضِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّوهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلْسَاءَ مَا يَزِرُونَ﴾ -

۲۶۔ ﴿قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَآتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَحَرَّ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ مِنَ فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ﴾ -

۲۷۔ ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ -

۲۸۔ ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ فَأَلْقَوْا السَّلَامَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ بَلَى إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ -

۲۹۔ ﴿فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فَلَنْ تَسْمَعُوا فِيهَا لَكُمْ مَتْنُونَ الْمُتَكَبِّرِينَ﴾ -

ترجمہ

۲۴۔ اور جس وقت ان سے کہا جائے کہ تمہارے پروردگار نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں یہ خدائی وحی نہیں) یہ تو گزشتہ لوگوں کے جھوٹے افسانے ہیں۔

۲۵۔ روز قیامت ان کے گناہوں کا بوجھ انہیں پوری طرح اپنے کندھے پر اٹھانا ہوگا اور ان لوگوں کے گناہوں کا ایک حصہ بھی جنہیں انہوں نے جہالت کی وجہ سے گمراہ کیا ہے۔ جان لو کہ اپنے کندھے پر برا سنگین بوجھ اٹھاتے ہیں۔

۲۶۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ (بھی) اس قسم کے سازشیں کرتے تھے لیکن خدا ان کی (زندگی) کی بنیاد کی طرف گیا اور اسے بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور اوپر سے ان کے سروں پر چھت گرائی اور (اس کا) عذاب ان پر ادھر سے آیا جہاں سے وہ نہیں جانتے تھے۔

۲۷۔ پھر قیامت کے دن خدا تمہیں رسوا کرے گا اور انہیں کہے گا کہ تم نے میرے شریک بنا رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ دشمنی کرتے تھے وہ کہاں ہیں۔ اس وقت راہل علم کہیں گے کہ آج کے دن رسوائی اور بد بختی کا فروں کے لئے ہے۔

۲۸۔ (روح قبض کرنے والے) فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کریں گے کہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا۔ اس وقت وہ سر جھکا لیں گے۔ (اور کہیں گے کہ) ہم برے کام نہیں کرتے تھے۔ جی ہاں! جو کچھ تم انجام دیتے تھے خدا اسے جانتا ہے۔

۲۹۔ اب جہنم کے دروازوں میں سے داخل ہو جاؤ وہ اس عالم میں ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ مستکبرین کے لئے کیسا برا ٹھکانا ہے۔

شان نزول

مجمع البیان میں ہے کہ بعض روایات کے مطابق پہلی آیت ”مقتسمین“ (تبعیض کرنے والوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے متعلق پہلے بحث ہو چکی ہے۔

یہ سولہ افراد تھے۔ ان کے چار گروپ تھے ان میں سے چار افراد حج دنوں میں مکہ کی سڑک پر لوگوں کے راستے میں کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ مکہ میں لوگوں کے داخل ہونے سے پہلے ان کے ذہنوں کو قرآن اور اسلام کے خلاف کردیں وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ محمد کوئی نیا دین نہیں لایا بلکہ وہی پرانے لوگوں کے جھوٹے افسانے ہیں۔

تفسیر

جو دوسروں کے گناہ اپنے کندھے پر لا دیتے ہیں

گذشتہ آیات میں ان مستکبرین کے بارے میں گفتگو تھی کہ جو کبھی بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح حق قبول کرنے سے بچ جائیں۔

زیر نظر آیات میں اس بے ایمان گروہ کی دائمی منطق بیان کرنے سے بچ جائیں۔ زیر نظر آیات اس بے ایمان گروہ کی دائمی منطق بیان کیا گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا چیز نازل کی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی وحی نہیں ہے یہ تو وہی اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَآذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ﴾۔

اس تکلیف دہ بات کے ساتھ دو باتیں وہ اور بھی کہتے۔ پہلی یہ کہ ہماری سطح فکر ان مسائل سے بہت بلند ہے یہ باتیں تو افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھیں جو عوام کو مشغول رکھنے کے لئے گھڑی گئی ہیں دوسری یہ کہ یہ کوئی نئی باتیں نہیں

ہیں کیونکہ یہ پہلا موقع نہیں کہ کوئی انسان ایسی باتیں سنائے کہ ہم کہیں کہ محمد نے کوئی ایجاد کی ہے یا کوئی اپنی نئی تخلیق کی ہے یہ تو انہیں گزشتہ لوگوں کی فضول باتوں کا تکرار ہے ”اساطیر“ ”اسطور“ (۶)۔

کی جمع ہے یہ لفظ فضول اور جھوٹے قصے کہانیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ نوربہ انبیاء کے مقابلے میں بے ایمان کافروں کا زبانی نقل ہوا ہے وہ لوگ اکثر اوقات ہادیانِ الہی کی دعوت کے جواب میں اپنی مخالفت کی توجیہ اور بہانے کے لئے اس لفظ کا سہارا لیتے تھے تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمیشہ لفظ ”اساطیر“ کے ساتھ ”اولین“ کو بھی صفت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاکہ ثابت کریں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہاں تک کہ کبھی تو یہ بھی کہتے کہ :

یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے ہم بھی اگر چاہیں تو ان جیسی باتیں کر سکتے ہیں۔ (انفال ۳۱)

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ آج کے مستکبرین بھی اکثر اوقات حق سے فرار کرتے ہوئے تکلیف و اذیت دینے کے لئے نیز دوسروں کو گمراہ کرنے کے لئے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں یہاں تک کہ انھوں نے معاشرہ شناسی کے نام پر کتابیں لکھی ہیں اور اپنے ان نظریات کو علمی شکل میں پیش کیا ہے انھوں نے مذہب کو انسانی جہالت کی کمی پیداوار اور مذہبی تفاسیر و تشریحات کو افسانے اور قصے کہانیاں قرار دیا ہے لیکن اگر ان کی فکر کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسئلہ کچھ اور ہے اور یہ لوگ فضول اور جعلی مذاہب کے خلاف مصروف جنگ نہیں بلکہ یہ خود ان کی پیدائش اور نشرو اشاعت کا عامل ہیں۔

ان کی مخالفت صرف سچے مذاہب کے ساتھ ہے کہ جو انسانی افکار کو پیدا کرتے ہیں۔ سامراج و استعمار کی زنجیریں توڑتے ہیں اور مستکبرین اور استعمار گروں کے لئے سدا رہ ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات ان کے منصوبوں کے خلاف ہیں کیونکہ وہ عدل و انصاف کے برخلاف مذہب کے اخلاقی احکام سرکش ہوا و ہوس اور بے سرو پا آزادیوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان سب پہلوؤں کو جب وہ مجموعی طور پر دیکھتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ اس رکاوٹ کو راستے سے ہٹا دیں یقیناً اپنے اس کام کے لئے انھیں ایک جواب کی بھی ضرورت ہے جو وہ لوگوں کو دے سکیں لہذا ان کے لئے اس سے بہتر کونسا جواب ہے کہ ان تعلیمات کو جھوٹے افسانے قرار دے لیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کو کامیاب کرنے میں ان خرافات کا بہت ہاتھ ہے جنھیں بعض اوقات ناداں اور ناآگاہ افراد گھڑتے ہیں اور انھیں مذہب کے سانچے میں ڈھال کر مذہب کے نام پیش کرتے ہیں۔

مذہب کے تمام حقیقی طرفداروں پر لازم ہے کہ وہ ایسی خرافات کا شدت سے مقابلہ کریں اور ان کے خلاف جنگ کریں اور دشمنوں کا غیر مسلح کمردیں یہ حقیقت ہر گز لکھیں اور کہیں کہ اس قسم کی خرافات سچے مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور دشمن کو انھیں سند نہیں بنانا چاہیے۔ اصول عقائد اور مسائل عملی کے بارے میں انبیاء کی تعلیمات عقل و منطق سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ ان کے لئے اس قسم کی تہمتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

اگلی آیت میں ان دل کے اندھوں کے اعمال کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: روز قیامت یہ لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ پوری طرح اپنے دوش پر اٹھائیں گے اور ایک حصہ ان لوگوں کے گناہوں کا بھی کہ جنہیں جہالت کی وجہ سے انہوں نے گمراہ کیا ہے ﴿لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّوهُمْ بَغِيرٍ عِلْمٍ﴾۔

جان لو کہ وہ بدترین بوجھ اور ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے ﴿الْأَسَاءَ مَا يَرْثُونَ﴾۔

کیونکہ بعض اوقات ان کی گفتگو ہزاروں افراد کی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔

کس قدر دشوار ہے انسان اپنے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے ہزاروں دوسرے افراد کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے اور اگر ان کی گمراہ کن باتیں بعد کی نسلوں کی گمراہی کا سرچشمہ بن جائیں تو ان کا بوجھ بھی ان کے کندھے پر پڑے گا۔

”لیحملوا“ (چاہیے کہ اس بوجھ کو کندھے پر اٹھائیں) یہ لفظ صیغہ امر کی شکل میں ہے جس کا مقصد نتیجہ اور انجام کار بیان کرنا ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ اب جب کہ یہ غلط کام تو نے انجام دیا ہے تو اس کا نتیجہ بھی بھگتو اور اس کی تلخی بھی چکھو۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ”لیحملوا“ کی لام لام عاقبت ہے۔

”اوزار“ ”وزر“ کی جمع ہے اس کا معنی بھاری بوجھ۔ یہ لفظ گناہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور یہ جو ”وزیر“ کو ”وزیر“

کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کس طرح کہتا ہے کہ کچھ افراد کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھاتے ہیں جنہیں انھوں نے گمراہ کیا ہے۔

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ ”ان کے تمام گناہ“ حالانکہ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی برے کام کی بنیاد رکھے تو جتنے لوگوں نے اس پر عمل کیا ان کے سب کا گناہ بنیاد رکھنے والے کے کندھے پر ہوگا۔

بعض مفسرین کے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ گمراہ پیروکاروں کے دو قسم کے گناہ ہوتے ہیں ایک وہ کہ جن کا ارتکاب وہ اپنے بہروں کی پیروی میں کرتے ہیں اور دوسرے وہ کہ جو خود سے بجا لاتے ہیں جبکہ بہروں کے کندھے پہلی قسم کے گناہوں کا بوجھ ہے۔

بعض نے مندرجہ بالا آیت میں لفظ ”من“ کو تبعیض کے لئے نہیں لیا بلکہ ”من“ کو اس بات کا بیان سمجھا ہے کہ پیروکاروں کے گناہ بہروں کے دوش پر ہیں۔

لیکن ایک اور تفسیر بھی نظر آتی ہے جو ان سب سے زیادہ دلچسپ ہے اور وہ یہ ہے کہ گمراہ پیروکاروں کی دو حالتیں ہیں، بعض اوقات وہ جانتے بوجھتے ہوئے ان منحرف اور کج رہروں کے پیچھے جاتے ہیں اور ان کے مثالیں پوری تاریخ میں بہت ہیں اس صورت میں گناہ کا عامل بہروں کا حکم بھی ہے اور ان کا اپنا ارادہ بھی۔ یہ مقام کہ جہاں ان کے گناہوں کی ذمہ داری کا ایک حصہ بہروں کے کندھے پر ہے۔ (بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں سے کسی چیز کی کسی ہو)۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پیروکار مائل راغب نہیں ہوتے بلکہ انھیں غفلت میں ڈالا جاتا ہے اور وہ گمراہ بہروں کے وسوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں بہت سے معاشروں میں عوام میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں ہو سکتا ہے کبھی وہ ایسے کاموں میں ”تقرب الی اللہ“ کی نیت سے شریک ہوں اس صورت میں ان کے تمام گناہوں کا بوجھ گمراہ پیشواؤں کے کندھے پر ہے اور اگر ایسے پیروکاروں نے تحقیق میں کوتاہی نہ کی ہو تو جوابدہ نہیں ہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے علم و آگہی ہوتے ہوئے گمراہ پیشواؤں کی پیروی کی یقیناً ان کے گناہوں میں سے سوئی کے سرے کے برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی جبکہ ان کے پیشواؤں کے کندھے پر بھی ذمہ داری کا ایک حصہ ڈالا جائے گا۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ”بغیر علم“ کے الفاظ اس بات کی دلیل نہیں کہ ان گمراہوں کے پیروکار اپنے بہروں کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے اور وہ بالکل ہی غافل تھے کہ اس طرح کی کوئی ذاتی ذمہ داری ہی نہ ہو بلکہ یہ تعبیرات اس بات کی طرح ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ جاہل و نادان افراد اغوا کرنے والوں کے جال میں جلدی پھنس جاتے ہیں لیکن دانا اور سمجھ دار لوگ بہت دیر میں۔

اسی لئے قرآن نے دوسری آیات میں ان پیروکاروں کا جبری الذمہ نہیں قرار دیا بلکہ ذمہ داری کا ایک حصہ ان کے کندھے پر رکھا ہے چنانچہ سورہ مومن کی آیہ ۴۷ اور ۴۸ میں ہے :-

﴿وَاذْيَحْجَوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اَنَا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فُهِلْ اَنْتُمْ مَغْنُونٌ عَنَا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ قَالَ

الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا اَنَا كُلٌّ فِيْهَا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ﴾ -

گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے آپس میں دوزخ میں بحث و مباحثہ اور جھگڑا کریں گے ناداں اور کمزور پیر و کار ، مستکبرین سے کہیں گے ہم تمہارے پیرو تھے تو کیا آگ کا کچھ حصہ ہماری طرف سے تم قبول کرو گے وہ جواب میں کہیں گے : ہم سب دوزخ میں خدا نے اپنے بندوں میں (عاد لامنہ) فیصلہ کیا ہے ۔

بعد والی آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ مستکبرین ہادیانِ الہی پر تہمت لگا رہے ہیں اور آسمانی وحی کو ”اساطیر الاولین“ (پہلے لوگوں کے افسانے) شمار کرتے ہیں بلکہ ان سے پہلے بھی ایسی سازشیں کرتے تھے لیکن خدا ان کی زندگی کی بنیاد کی طرف گیا اور اسے بنیاد سے اکھڑ دیا اور اوپر سے ان کے سروں پر چھت گمراہی ﴿قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَحَرَّ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ -

اور عذاب الہی ادھر سے ان کی طرف آیا جدھر کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا ﴿وَأَنَّا لَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ﴾ -

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر نمرود کے ایک واقعہ سے کی ہے اس نے ایک عمارت بنائی تھی تاکہ آسمان کی طرف چڑھ کر آسمانی خدا سے مقابلہ کرے ۔

بعض دیگر مفسرین نے اسے بخت النصر کے واقعہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے ۔

لیکن مسلم ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور اس میں تمام مستکبرین اور گمراہ رہبر شامل ہیں ۔

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ خدا ان مستکبرین کے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لئے ان کی عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف سے اقدام نہیں کرتا بلکہ ان کی جڑ اکھاڑنے اور بیج کنی کے لئے اقدام کرتا ہے اور چھتوں کو ان کے سروں پر گراتا ہے جی ہاں ایسے لوگوں کے لئے خدائی سزا ایسی ہی ہوتی ہے ۔

عمارت کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا اور چھت کو نیچے گرانا ہو سکتا ہے ظاہری طور پر عمارتوں اور چھتوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو زلزلوں اور بجلیاں گرنے سے تباہ و برباد ہو جائیں اور ان کے سروں سے آگریں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ارادوں اور ڈوپلیمینٹ کی طرف اشارہ ہو کہ جو حکم خدا سے جڑ سے اکھاڑ پھینکی گئیں اور تباہ و برباد ہو گئیں ۔ اس میں بھی کوئی صرح نہیں کہ آیت دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو ۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن لفظ ”سقف“ کے بعد ”من فوقہم“ کہتا ہے حالانکہ مسلم ہے کہ چھت ہمیشہ اوپر کی طرف ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تاکید کے لئے بھی ہو اور یہ نکتہ بیان کرنا بھی مقصود ہو کہ بعض اوقات چھت نیچے گرے لیکن صاحب خانہ چھت کے نیچے نہ ہو جب کہ ان ظالموں پر چھت گری تو وہ اس کے نیچے تھے اور وہ نابود ہو گئے آج کی اور گزشتہ تاریخ میں اس خدائی سزا کے کس قدر مناظر موجود ہیں۔

کئی طاقت اور جابر حکمران ہیں جو اپنے محل اقتدار کو اس قدر مستحکم سمجھتے تھے کہ انھوں نے صرف اپنے لئے بلکہ اپنی اولاد کے لئے مستقبل کے لئے بھی اس کے منصوبے بنا رکھے تھے ان کے پروگرام مکمل تھے اور ظاہراً انھوں نے اپنے اقتدار اور نظام کی بقا اور حفاظت کے پورے انتظامات کر رکھے تھے لیکن اچانک اس طرف سے عذاب الہی ان کی طرف آیا جدھر سے وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے اور ان کے اقتدار کی چھت ان کے سر پر آگری اور وہ یوں نابود و منتشر ہوئے گویا وہ صفحہ ارض پر تھے ہی نہیں۔ جو کچھ کہا گیا وہ ان کے لئے دنیاوی عذاب ہے لیکن ان کی سزائیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے بعد روز قیامت بھی خدا انھیں رسوا کرے گا ﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ﴾۔ وہاں ان سے پوچھے گا اور کہے گا کہاں ہیں تمہارے وہ شریک جو تم نے میرے لئے بنائے تھے، اور ان سے تمہیں بڑی عقیدت تھی اور ان کی وجہ سے تم دوسروں سے جنگ و جدال کرتے تھے بلکہ دشمنی پر تل جاتے تھے۔ ﴿وَيَقُولُ آئِنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ﴾ (۲)۔

یقیناً اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں ہے لیکن موقع پر اہل علم لب کشائی کریں گے اور کہیں گے۔ شرمندگی، رسوائی اور بد بختی آج کے دن کفار کے لئے ﴿وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾۔ یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ روز قیامت گفتگو علماء کریں گے کیونکہ اس عظیم بارگاہ میں ایسی گفتگو کرنا چاہیے جس میں کوئی غلطی نہ ہو اور ایسا اہل ایمان علماء کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتا۔ یہ جو بعض روایات میں اس سے مراد آئمہ اہل بیت (علیہ السلام) لئے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ”با ایمان علماء“ کا بہترین مصداق ہیں۔ (۳)۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مشرکین اور علماء کے درمیان اس سوال و جواب کا رد و بدل کسی پنہاں بات کو ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ یہ بھی مشرکین کے لئے ایک قسم کی نفسیاتی سزا اور عذاب ہے خصوصاً آگاہ مومنین اس جہاں میں ہمیشہ ان مفرور مشرکین کی ملامت کا نشانہ بنتے رہے تھے اور وہاں یہ مفرور اپنی سزا بھی اسی کیفیت سے پائیں

کے انھیں بھی ملامت کی جائے گی جبکہ وہ ایسی جگہ پر ہوں گے جہاں وہ نہ انکار کر سکتے ہوں گے اور نہ وہاں سے نکل سکتے ہوں گے۔

گذشتہ آیت کے آخر میں جن کفار کا ذکر تھا اگلی آیت کے بارے میں انہی کا ذکر ہے یہ ذکر دراصل ایک ہلادیتے والا اور غافل افراد کو بیدار کرنے والا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ موت کے فرشتے اس عالم میں ان کی روہیں قبض کرتے ہیں جبکہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوتا ہے ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ﴾۔

انسان جو ظلم و ستم کرتا ہے، پہلے مرحلے میں وہ خود اسی پر ہوتا ہے اور دوسروں کے گھر سے پہلے وہ اپنا ہی گھر ویران کرتا ہے کیونکہ ظلم کا پہلا قدم یہ ہے کہ خود ظلم کرنے والے کی باطنی خوبیاں اور اس کی اپنی صفات برباد ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جن معاشرے میں ظلم کی بنیاد رکھی جائے اجتماعی اور معاشرتی رشتوں کے حوالے سے چکر لگاتا ہوا وہ ظلم خود ظالم کے گھر کی طرف پلٹ آتا ہے۔

لیکن یہ ظالم جب اپنے آپ کو موت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں اور غرور و غفلت کے پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹے ہوئے ہیں تو وہ فوراً مان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے برا کام انجام دیا ہے ﴿فَأَلْقُوا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ شَوْءٍ﴾۔ وہ ہر قسم کے برے کام کا انکار کیونکر کریں گے؟ کیا وہ جھوٹ بولیں گے، اس لئے کہ بار بار جھوٹ بولنے کی وجہ سے جھوٹ ان کی ذاتی صفت بن گیا ہے یا کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے یہ کام انجام دئے ہیں لیکن ہم سے غلطی ہو گئی ہے اگرچہ ہماری نیت بری نہیں تھی۔ ممکن ہے دونوں وجوہ ہوں۔

مگر ان سے فوراً کہا جائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو تم نے بہت سے برے کام کئے ہیں جی ہاں! اللہ تمہارے اعمال اور اسی طرح تمہاری نیتوں سے باخبر ہے ﴿بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔ لہذا اب انکار کرنے اور بہانے بنانے کی گنجائش نہیں۔ اب جبکہ ایسا ہے تو جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ کہ تم نے اس میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے ﴿فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا﴾۔ متکبرین کا ٹھکانا کس قدر برا ہے ﴿فَلْيَنْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ﴾۔

۱۔ بعض اسے جمع الجمع سمجھتے ہیں ان کے مطابق ”اساطیر“ ”اسطار“ ”سطر“ کی جمع ہے بعض کا نظریہ ہے کہ ”اساطیر“ وہ جمع ہے جس کا مفرد اس کی جنس میں سے نہیں ہے لیکن مشور وہی ہے جو ہم نے متن تفسیر میں بیان کیا ہے۔

۲۔ ”شاقون“ ”شقاق“ کے مادہ سے مخالفت اور دشمنی کے معنی میں ہے اور اس کی اصل ”شق“ نصف کرنے (اور شگافتہ کرنے) کے معنی میں آیا ہے۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

چند اہم نکات

۱۔ اچھی اور بری نیت

ایک عمل انجام دینے سے پہلے کئی مرحلوں سے گزرتا ہے اس میں رہبروں، ہدایت کرنیوالوں یا وسوسے ڈالنے والوں کا اثر بھی اہمیت رکھتا ہے اسی طرح اچھی یا بری سنین اور رسمیں بھی اعمال کے لئے فکری اور معاشرتی اعتبار سے زمین ہموار کرتی ہیں اس بات کا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بعض اوقات رہبروں اور کسی کام کی بنیاد رکھنے والوں کا اثر دیگر تمام عوامل سے زیادہ ہوتا ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ برائیوں یا نیکیوں میں شریک نہ ہوں اسی منطق کی رو سے قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں نیکی یا بدی کی بنیاد رکھنے یا اچھی بری سنت قائم کرنے کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ گمراہ کنندہ مستکبر اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر رکھتے ہیں اور ایک حصہ اپنے پیروکاروں کے گناہوں کا بھی (بغیر اس کے کہ پیروکاروں کی ذمہ داری میں کوئی کمی واقع ہو)۔

یہ بات اس قدر اہم ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: الدال علی الخیر کفاعله

نیکی کی دعوت دینے والا نیکی کرنے کی طرح ہے^(۱)

زیر بحث آیت کے ذیل میں رسول اللہ سے منقول حدیث میں ہے آپ نے فرمایا:

ایما داع دعی الی الہدی فاتبع ، فله مثل اجورهم ، من غیر ان ینقص من اجورهم شیئا و ایما داع دعی الی ضلاله

فاتبع علیہ فان علیہ مثل اوزار من اتبعہ ، من غیر ان ینقص من اوزارهم شیئا۔

جو شخص ہدایت کی دعوت دے اس کا اجر اس ہدایت پر عمل کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ عمل کرنے والوں کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی کی دعوت دے گا اسے اس کے پیروکاروں جتنی سزا ملے گی جبکہ پیروکاروں کی سزائیں بھی کوئی تخفیف نہ ہوگی۔^(۲)

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

من استن بسنة عدل فاتبع کان له من عمل بها، من غیر ان ینتقص من اجورهم شیء و من استن سنة جور فاتبع

کان علیہ مثل وزر من عمل به ، من غیر ان ینتقص من اوزارهم شیء

جو شخص کسی اچھی سنت کی بنیاد رکھے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا اجر پیروی کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ خود عمل کرنے والوں کا اجر بھی کم نہ ہوگا اور جو شخص کسی ظلم و جور کی بنیاد رکھے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا عمل کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔^(۳)

اس مضمون کی متعدد دیگر روایات معصوم پیشواؤں سے نقل ہوئی ہیں شیخ صر عالی علیہ الرحمۃ نے یہ روایات وسائل کی جلد ۱۱ کتاب ”الامر بالمعروف و انہی عن المنکر“ کے باب ۱۶ میں جمع کی ہیں۔

صحیح مسلم میں بھی رسول اکرم سے اس مضمون کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے۔

رسول اللہ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے کچھ افراد آپ کے پاس آئے ان کے پاؤں ننگے تھے جسم پر لباس نہیں تھا، تلواریں انھوں نے اپنی کمروں سے باندھ رکھی تھیں (اور وہ جہاد کے لئے تیار تھے) ان کے فقر و فاقہ کا یہ عالم دیکھا تو رسول اللہ کا چہرہ دگر ہو گیا آپ اپنے گھر میں چلے گئے واپس آئے تو بلال کو حکم دیا کہ لوگوں سے کہو کہ جمع ہو جائیں اور انھیں نماز کی دعوت دو، نماز پڑھی گئی، اس کے بعد رسول اللہ نے خطبہ دیا اور فرمایا:

اے لوگو! خدا سے ڈرو، وہی خدا کہ جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے، اور جان لو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے لوگو تقویٰ اختیار کرو اور کل قیامت کے لئے غور و فکر کرو۔ تم میں سے جو جس کے بس میں ہے۔ دینار، درہم، لباس، گندم، کھجور یہاں تک کہ آدھی کھجور سے بھی حاجت مند کی مدد کرو۔

اس دوران ایک انصاری رقم کی ایک تھیلی لے آیا۔ تھیلی اتنی بڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس سے لوگوں کو تشویق ہوئی۔ یکے بعد دیگرے انھوں نے مختلف چیزیں امداد کے طور پر دیں، یہاں تک کہ اناج اور لباس کے دو ڈھیر لگ گئے۔

رسول اللہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس وقت آپ نے فرمایا:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها و اجر من عمل بها بعده من غیر ان ينقص من اجورهم شیء و من

سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعد من غیر ان ينقص من اوزارهم شیء۔

یعنی جس نے اسلام میں کسی اچھی سنت کی بنیاد رکھی، اسے اس کا اجر ملے گا اور اس پر جو عمل ہوگا اس کا اجر بھی ملے گا جبکہ عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جو کوئی اسلام میں کسی بری سنت کی بنیاد رکھے اسے اس کا بوجھ اٹھانا پڑے گا اور اس پر جو عمل ہوگا اس کا بوجھ بھی۔ جبکہ عمل کرنے والوں کے بوجھ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔^۳

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ یہ احادیث اور ان جیسی قرآنی سورہ انعام کی اس آیت سے کیسے مطابقت رکھتی ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے: ولا تزر وازرة وزر اخرى

کوئی دوسرے کا گناہ اپنے کاندھے پر نہیں اٹھاتا۔ (انعام ۱۶۵) ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ لوگ دوسرے کے گناہوں کے جواب دہ نہیں ہیں بلکہ اپنی ہی گناہوں کے جواب دہ ہیں کیونکہ یہ دوسروں کے گناہوں کے عمل میں شریک ہیں اور ایک لحاظ سے یہ خود ان ہی کا گناہ شمار ہوتا ہے۔

۲۔ بے موقع تسلیم حق

بہت کم ایسے لوگ ہیں جو حقیقت کو شہود کے عالم میں دیکھ کر بھی جھٹلادیں۔ یہی وجہ ہے کہ گنہگار اور ظالم جب موت کی چوکھٹ پر پہنچتے ہیں اور غفلت و غرور کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ برزخ کھل جاتی ہے تو اظہار ایمان کرنے لگتے ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے۔ ﴿فَالْقَوَا السَّلَام﴾

البتہ ایسے لوگ اس موقع پر مختلف باتیں کرتے ہیں۔ بعض اپنے پرانے اعمال کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی برا کام نہیں کیا ہے اگرچہ وہ جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کا موقع نہیں پھر بھی جھوٹ بولتے ہیں یہاں تک کہ بعض آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ روز قیامت بھی جھوٹ بولیں گے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿قَالُوا اِنَّ اللّٰهَ رَبُّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾

مشرکین کہیں گے پروردگار کی قسم ہم مشرک نہیں ہیں (انعام ۲۳)

بعض دوسرے اظہار ندامت کریں گے اور دنیا کی طرف لوٹائے جانے کی درخواست کریں گے۔ (سجده ۱۲)

بعض ایسے بھی ہوں گے جو صرف اظہار ایمان کریں گے مثلاً فرعون۔ (یونس ۹۰)

بہر حال ان میں سے کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ اس کا وقت گزر چکا ہوگا۔ ایسا اظہار ایمان اضطراری پہلو رکھتا ہے۔

اور ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اضطراری ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص ۴۳۶-۲۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص ۴۳۷-۴۔ صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۰۴ (باب "الحث علی صدقة ولو بشق تمر")

آیات ۳۰، ۳۱، ۳۲

۳۰۔ ﴿وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرٌ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ

دَارُ الْمُتَّقِينَ﴾۔

۳۱۔ ﴿جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُجْرَى مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ كَذَلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ﴾۔

۳۲۔ ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔

ترجمہ

۳۰۔ جب پرہیزگاروں سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں خیر (اور سعادت) جن لوگوں نے اس دنیا میں نیکی کی ہے ان کے لئے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو اس سے بھی بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کتنا اچھا ہے۔

۳۱۔ بہشت جاوداں کے باغات ہیں کہ جن میں وہ سب داخل ہوں گے ان کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ جو کچھ چاہیں گے وہاں موجود ہے۔ اس پرہیزگاروں کو اسی طرح جزا دیتا ہے۔

۳۲۔ وہی کہ (قبض روح کرنے والے) فرشتے جن کی روح اس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاک و پاکیزہ ہوں گے انہیں کہیں گے کہ تم پر سلام ہو اپنے اعمال کے سبب بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

تفسیر

نیک لوگوں کا انجام:

گذشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین قرآن کے بارے میں کیا اظہار خیال کرتے تھے ان آیات میں ہم نے ان مشرکین کا انجام بھی پڑھا ہے۔ زیر نظر آیات میں مومنین کا اعتقاد بتا دیا گیا ہے اور ان کے انجام کار کی بھی خبر دی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جب پرہیزگاروں سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں خیر و سعادت ﴿وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرٌ﴾۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم مکہ میں تھے تو موسم حج میں جزیرۃ العرب کے مختلف گوشوں سے لوگ جو ق درجہ مکہ میں آتے تھے۔ ان کے کانوں تک پیغمبر اسلام کے بارے میں ادھر ادھر سے اڑتی ہوئی باتیں پہنچی ہوتی تھیں لہذا جب وہ مختلف لوگوں سے ملتے تو اس بارے میں پوچھتے۔ جب وہ مشرکین سے بات کرتے تو وہ کہتے کہ کوئی خاص بات نہیں وہی فضول افسانے اور گھسی پٹی کہانیاں ہیں اور جب ان کی ملاقات مومنین سے ہوتی اور وہ ان سے سوال کرتے تو وہ کہتے کہ ہمارے پروردگار نے سوائے خیر و سعادت کے کوئی چیز نازل نہیں کی۔

”خیر“ کس قدر معنی خیز، خوبصورت اور جامع تعبیر ہے وہ بھی مطلق صورت میں کہ جس کے مفہوم میں تمام طرح کی نیکیاں، مادی و روحانی سعادتیں اور کامیابیاں شامل ہیں دنیا میں خیر، آخرت میں خیر، فرد کے لئے خیر، معاشرے کے لئے خیر، تعلیم و تربیت میں خیر، سیاست و اقتصاد میں خیر اور امن و آزادی کی خیر، مختصر یہ کہ ہر لحاظ سے خیر۔ (کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب کسی لفظ کے متعلق کو حذف کر دیا جائے تو اس کے مفہوم میں عمومیت پیدا ہو جاتی ہے)۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن کے متعلق خود قرآن میں طرح طرح کی تعبیریں آئی ہیں مثلاً نور، شفاء، ہدایت اور فرقان (حق کو باطل سے جدا کرنے والا) حق اور تذکرہ وغیرہ، لیکن شاید یہ واحد آیت ہے جس میں ”خیر“ کی تعبیر آئی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دیگر تمام خاص مفاہیم اس عام مفہوم میں جمع ہیں۔

ضمناً وہ اختلاف تعبیر جو مشرکین اور مومنین قرآن کے بارے میں کرتے تھے قابل ملاحظہ ہے مومنین کہتے تھے ”افضل خیراً“ یعنی خدا نے خیر و سعادت نازل کی ہے اس طرح سے وہ اپنے ایمان کا بھی اظہار کرتے تھے کہ قرآن وحی الہی ہے۔^(۱)

جبکہ مشرکین سے پوچھا جاتا کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ”اساطیر الاولین“ یعنی گزرے ہوؤں کے قصے کہانیاں ہیں اس طرح وہ قرآن کے وحی الہی ہونے کا قطعی انکار کر دیتے تھے۔^(۲) اس کے بعد جیسا کہ گزشتہ آیات میں مشرکین کی باتوں کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں دنیا اور آخرت میں کئی گنا مادی و روحانی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

زیر نظر آیات میں مومنین کے اعتقادات کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے جنہوں نے نیکی کی ہے ان کے لئے اس دنیا میں نیکی ہے ﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ﴾۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ ان کی جزا ”حسنۃ“ ان کے اظہار ایمان ”خیر“ کی طرح مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں اس جہان کی انواع و اقسام کی حسنات اور نعمات شامل ہیں۔

یہ تو ان کی دنیا کی جزا ہے جبکہ ”آخرت کا گھر اس سے بھی بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کس قدر اچھا ہے ﴿وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ﴾۔

یہاں پھر ہم ”خیر“ اور ”نعم الدار المتقین“ کے الفاظ پارہے ہیں یہ دونوں اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ مطلق ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیئے کیونکہ ثواب اور جزا کیفیت و کمیت کے اعتبار سے انسانی اعمال کا عکس العمل ہیں۔

جو کچھ ہم نے لکھا سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ﴿لِلَّذِينَ احْسَنُوا﴾ تا آخر آیہ ”ظاہر اکلام خدا ہے اور ان آیات اور گذشتہ آیات میں مقابلے کا قرینہ اس معنی کو تقویت پہنچاتا ہے ہے البتہ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں دو احتمال ذکر کئے ہیں پہلا یہ کہ یہ کلام خدا ہے اور دوسرا کہ پرہیزگاروں کے کلام کا تمہ ہے۔

پہلے تو پرہیزگاروں کے گھر کا ذکر سر بستہ کیا گیا ہے اگلی آیت میں اس کی توصیف یو کی گئی ہے: پرہیزگاروں کا گھر بہشت کے جاوداں باغ ہیں۔ یہ سب ان گھروں میں داخل ہو جائیں گے ﴿جَنَّاتٌ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا﴾ ان درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ﴿بَجَرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾۔ یہی نہیں کہ وہاں باغات اور درخت ہوں گے بلکہ وہ جو کچھ چاہیں وہ وہاں موجود ہے ﴿لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ﴾۔

کیا نعمات بہشت کی جامعیت اور وسعت کے بارے میں اس سے بہتر تعبیر ہو سکتی ہے؟ سوال یہاں تک کہ یہ تعبیر سورہ زخرف کی آیہ ۷۱ میں آنے والی تعبیر سے زیادہ وسیع نظر آیت ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

﴿وَفِيهَا مَا تشتهيہ النفس و تلذ الاعین﴾

بہشت میں ہر وہ چیز موجود ہے جو دل چاہیں گے اور آنکھیں جس سے لذت محسوس کریں گی۔

سورہ زخرف کی اس آیت میں دلوں کی خواہش کا ذکر ہے جبکہ زیر بحث آیت میں مطلق ”خواہش“ کی بات کی گئی ہے (یشاءون) بعض مفسرین نے ”لہم فیہا“ کے ”ما یشاؤن“ پر مقدم ہونے سے انحصار کا استفادہ کیا ہے یعنی صرف وہی ایسی جگہ ہے جہاں انسان کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہے گا ورنہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات میں پرہیزگاروں کی زندگی اور موت کی کیفیت بیان کی گئی ہے، گزشتہ آیات دے ہم آہنگ اور ہم قرینہ ہیں کہ جن میں مستبکر مشرکین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ وہاں ہم نے پڑھا ہے کہ فرشتے ان کی

روح اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ ظالم ہیں اور ان کی موت ان کی بد بختی کے نئے دور کی ابتداء ہے۔ اس کے بعد ابھیں حکم دیا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

لیکن یہاں فرمایا گیا ہے: پرہیزگار وہ لوگ ہیں کہ روح قبض کرنے والے فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ﴾۔ اس موقع پر فرشتے ”انھیں کہتے ہیں سلام ہو تم پر“ ﴿وَيَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ﴾۔ وہ سلام کہ جو امن و سلامتی اور آرام و سکون کی نشانی ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں: اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ ﴿ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾۔ تتوفاهم (ان کی روح حاصل کرتے ہیں) یہ موت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ موت فنا و نابودی نہیں اور اس سے ہر چیز ختم ہو جاتی بلکہ ایک بالاتر مرحلہ کی طرف منتقل ہونے کا مرحلہ ہے۔ تفسیر المیزان میں ہے کہ:

اس آیت میں تین موضوعات پیش کئے گئے ہیں:

۱۔ متقین کی روح اس حالت میں قبض کی جائے گی کہ وہ پاک و طیب ہوں گے۔

۲۔ ان کے لئے ہر لحاظ سے امن و سلامتی کا ہونا۔

۳۔ بہشت کی طرف ان کی راہنمائی۔

ان تین نعمات کی نظیر سورہ انعام کی آیہ ۸۲ میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں۔

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾۔

وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا ان کے لئے امن و امان ہے اور وہی ہدایت

یافتہ ہیں۔

۱۔ ”خیراً“ در حقیقت فعل محذوف کا مفعول ہے اور تقدیر میں ”انزل خیراً“ تھا۔

۲۔ ”اساطیر الاولین“ بتداء محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں ”ہذہ اساطیر الاولین“ تھا۔

آیات ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴

- ۳۳۔ ﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ -
- ۳۴۔ ﴿فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾ -
- ۳۵۔ ﴿وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَزَمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ -
- ۳۶۔ ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ أُعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾ -
- ۳۷۔ ﴿إِنْ تَحَرَّصَ عَلَى هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ﴾ -

ترجمہ

- ۳۳۔ کیا وہ اس چیز کے علاوہ کسی چیز کے منتظر ہیں کہ (قبض روح کرنے والے) فرشتے ان کے پاس آئیں یا پھر (ان کی سزا کے پارے میں) تیرے پروردگار کا حکم آپہنچے (اور پھر وہ توبہ کریں جبکہ اس وقت کی توبہ بے سود ہے) ان سے پہلے والے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔
- ۳۴۔ اور ان کے برے اعمال کا نتیجہ ان تک پہنچا اور جس (وعدہ عذاب) کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ ان تک آپہنچا۔
- ۳۵۔ مشرکین نے کہا: اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے آباء اجداد اس کے غیر کی عبادت نہ کرتے اور نہ ان کی اجازت کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے (جی ہاں) ان سے پہلے لوگوں نے بھی یہی کام انجام دئے ہیں لیکن کیا انبیاء کی ذمہ داری سوائے واضح تبلیغ کے کچھ ہے؟
- ۳۶۔ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب کریں۔
- ایک گروہ کو خدا نے ہدایت کی اور ایک گروہ کو گمراہی دامن گیر ہوئی پس روئے زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔
- ۳۷۔ تم ان کی ہدایت کی جتنی بھی لالچ کرو (کوئی فائدہ نہیں) کیونکہ اللہ نے جسے گمراہ کیا ہے اس کی ہدایت نہیں کرتا اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

تفسیر

انبیاء کی ذمہ داری واضح تبلیغ ہے

قرآن دوبارہ مشرکین اور مستکبرین کی طرز فکر اور طرز عمل کے بارے میں تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اور تہدید آمیز لہجے میں کہتا ہے: وہ کس انتظار میں ہیں ”کیا وہ اس بات کے منظر ہیں کہ موت کے فرشتے ان کے پاس آئیں“ توبہ کے دروازے بند ہو جائیں دفتر اعمال لپیٹ دیا جائے اور واپسی کی کوئی راہ باقی نہ رہے ﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ﴾۔

یا پھر وہ کیا اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے لئے تیرے پروردگار کی طرف سے عذاب کا حکم صادر ہو ﴿أَوْ يَأْتِيَ أَمْرٌ رَبِّكَ﴾ جبکہ اس حالت میں بھی توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے اور بازگشت اور تلافی کا راستہ باقی نہ رہے گا۔

یہی ان کی کیسی طرز فکر ہے، کیسی ہٹ دھرمی ہے اور کیا احمقانہ انداز ہے۔

یہاں لفظ ”ملائکہ“ اگرچہ مطلق طور پر آ رہا ہے لیکن گذشتہ آیات کی طرف تو کہہ کرے ہوئے کہ جن میں روح قبض کرنے والے فرشتے کے بارے میں گفتگو ہے یہاں بھی وہی مراد ہیں۔

”یاتی امر ربک“ (خدا کا حکم آجائے گا) اس جملے سے بہت سے احتمالات پیدا ہو سکتے ہیں لیکن اگر اس امر کی طرف توجہ کی جائے یہی تعبیر قرآن کی مختلف آیات میں نزول عذاب کے بارے میں آئی ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہاں بھی وہی معنی مراد ہے۔

بہر حال مجموعی طور پر ان دونوں جملوں سے تہدید کا مفہوم نکلتا ہے یہ تہدید اور دھمکی مستکبرین کے لئے ہے ان سے کہا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پند و نصیحت اور اس کے انبیاء کی طرف سے وعظ و نصیحت سے تم بیدار نہیں ہوتے تو عذاب اور موت کے تازیانے تمہیں بیدار کریں گے لیکن اس بیدار ہونے سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہی گروہ نہیں کہ جس کا طرز عمل ہے بلکہ ”گذشتہ مشرکین اور مستکبرین بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے“ ﴿كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾۔ خدا نے تو ان پر ظلم نہیں کیا انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا ہے ﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾۔

کیونکہ درحقیقت خدا ان کے اعمال ہی کا نتیجہ ان کی طرف لوٹائے گا، یہ جملہ پھر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کہ ہر ظلم اور برائی جو انسان سے سرزد ہوتی ہے آخر کار اسی کی دامن گیر ہوتی ہے بلکہ ہر چیز سے پہلے ان تک پہنچتی ہے کیونکہ ہر

عمل کے برے آثار اپنے فاعل کی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس سے اس کا دل تاریک ہو جاتا ہے روح آلودہ ہو جاتی ہے اور آرام و سکون جاتا رہتا ہے۔

دوبارہ ان کے اعمال کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: بالآخرہ ان کے اعمال کی برائیاں ان تک آپہنچی ہیں ﴿فَأَصَابَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا﴾۔

(وعدہ عذاب الہی کہ) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ان تک آپہنچے گا ﴿وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾۔
 ”حاق بھم“ کا معنی ہے ”ان پر وارد ہوا“ لیکن قرطبی، فرید وجدی اور دیگر مفسرین نے اسے احاطہ کرنے کے معنی میں لیا ہے البتہ اس سے ایسا مفہوم مراد لیا جانا چاہیے جس میں وارد ہونا اور احاطہ کرنا دونوں معانی شامل ہوں۔
 بہر حال یہ آیت جو کہتی ہے کہ ”ان کے اعمال کی برائیاں ان تک آپہنچیں“ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ یہ انسان کے اپنے اعمال ہیں کہ جو اس جہان میں بھی اور اس جہاں میں بھی اسے دامن گیر ہوتے ہیں اس کے یہ اعمال مختلف صورتوں میں بھی مجسم ہوتے ہیں اور اسے رنج تکلیف، آزار اور اذیت دیتے ہیں۔^(۱)
 اگلی آیت مشرکین کی ایک کمزور اور بے بنیاد منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: مشرکین کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم کو ہمارے آباء و اجداد اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتے“ اور بتوں کا رخ نہ کرتے ﴿وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا﴾۔ اور کوئی چیز اس کے اذن کے بغیر حرام قرار دیتے (وَلَا عَزَمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ)۔ یہ جو کچھ چوپایوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنہیں مشرکین نے زمانہ جاہلیت میں اپنی طرف سے حرام قرار دے لیا تھا ان کے اس طرز عمل پر پیغمبر شدید تنقید کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ ان کا دعویٰ تھا کہ بتوں کی پرستش اور حلال حرام قرار دینا اور ان کے دیگر کام اللہ کی رضا سے ہیں اور اس کے اذن کے بغیر نہیں ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ گفتگو اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ وہ جبر کا عقیدہ رکھتے تھے اور ہر چیز کو تقدیر سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس آیت سے بہت سے مفسرین نے یہی مراد لیا ہے۔

لیکن یہ احتمال بھی ان کا یہ کہنا عقیدہ جبر کی بنیاد پر نہ ہوا اور اس کا استدلال یہ ہو کہ اگر ہمارے اعمال پر خدا راضی نہیں ہیں ہے تو پھر اس نے پہلے پیغمبر اور رسول بھیج کر ان سے منع کیوں نہیں کیا اور کیوں ہمارے بزرگوں سے پہلے دن ہی نہیں کہا کہ میں ان کاموں سے راضی نہیں ہوں۔ اس کی یہ خاموشی اس کی رضا کی دلیل ہے۔

یہ تفسیر اس آیت اور کے بعد کی آیات کے ظاہری مفہوم سے مناسبت رکھتی ہے اسی لئے بلافاصلہ فرمایا گیا ہے ان کے آباء و اجداد بھی یہی کچھ کرتے تھے (اور انہی بہانوں کا سہارا لیتے تھے) لیکن کیا انبیاء الہی کی ذمہ داری واضح تبلیغ کے علاوہ کچھ اور ہے؟ ﴿كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾۔

یعنی

اولاً یہ جو تم کہتے ہو کہ خدا نے سکوت اختیار کر رکھا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے، جو پیغمبر بھی آیا ہے اس نے توحید کی اور نفی شرک کی دعوت دی ہے۔

ثانیاً خدا اور پیغمبر کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ مجبور کریں بلکہ ان کے ذمہ ہے کہ راستے کی نشان دہی کریں اور یہ کام کیا جا چکا ہے۔

ضمنی طور پر ”﴿كَذَلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾“ (جو لوگ اس سے پہلے تھے انھوں نے بھی یہی کام انجام دیئے ہیں) یہ ایک طرح سے پیغمبر کی تسلی کے لئے ہے تاکہ وہ جان لیں کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں پہلے انبیاء کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا آیا ہے لہذا ملول نہ ہوں، استقامت سے کام لیں اور ڈٹ جائیں خدا آپ کا یار و مددگار ہے۔

یہ حقیقت بیان کرنے کے بعد کہ انبیاء کی ذمہ داری صرف ابلاغ آشکار اور تبلیغ واضح ہے۔ اگلی آیت میں انبیاء کی کیفیت دعوت کی طرف ایک مختصر اور جامع اشارہ کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا ہے ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا﴾۔

لفظ ”امہ“ ”ام“ ماں کے معنی میں ہے یا ہر چیز کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز کو اپنا ضمیمہ قرار دے لہذا ہر وہ جماعت کہ جس کے افراد میں زمان، مکان، فکریا ہدف میں کسی طرح کی وحدت ہو اسے ”امہ“ کہا جاتا ہے قرآن میں یہ لفظ ۶۴ سے زیادہ مرتبہ آیا ہے ان کے مطالعے سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کہ ان سب رسولوں نے یہی دعوت دی ہے کہ خدا نے یکتا کی پرستش کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو ﴿أَنْ أَعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾۔ (۲)

یعنی تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد پر عقیدہ توحید اور طاغوت سے مقابلہ تھا اور یہی وہ پہلی چیز تھی کی جس کی طرف سب انبیاء بلا استثناء دعوت دیتے تھے کیونکہ اگر توحید کے سستوں مستحکم نہ ہوں اور انسانی معاشرے سے طاغوتیت اور طاغوتی افکار نکال باہر نہ کئے جائیں تو کوئی اصلاحی پروگرام قابل عمل نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں ”طاغوت“ مبالغے کا صیغہ ہے یہ ”طغیان کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے حد اور سرحد سے تجاوز کرنا اور ”طاغوت“ تجاوز کرنے والے کو کہتے ہیں لہذا شیطان، بت اور ظالم و ستمگر حاکم کو ”طاغوت“ کہتے ہیں اور ہر وہ راستہ جو غیر حق تک جا پہنچائے اسے ”طاغوت کہا جاتا ہے یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے اگرچہ بعض اوقات اس کی جمع ”طواغیت“ کی جاتی ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کی دعوت توحید کا نتیجہ کیا نکلتا ہے قرآن کہتا ہے: ان امتوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں خدا نے ہدایت کی ﴿فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللَّهُ﴾۔ اور ان میں ایسے تھے کہ گراہی جنہیں دامن گیر ہوئی ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ﴾۔

اس موقع پر بھی مکتب جبر کے پیروں کا رویہ آواز بلند کی ہے کہ یہ آیت بھی ہمارے مکتب کی صداقت کے لئے ایک دلیل ہے لیکن ہم نے بارہا کہا ہے کہ اگر ہدایت و ضلالت والی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور نہ صرف یہ کہ وہ جبر کی طرف اشارہ نہیں کرتیں، وضاحت سے انسانی اختیار، ارادے اور آزادی کو بیان کرتی ہیں کیونکہ بہت سی قرآنی آیات میں ہے کہ خدائی ہدایت و ضلالت اس اہلیت اور نااہلی کے بعد کہ جو انسان کے اعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ ظالموں، ہیرا پھیری کرنے والوں، جھوٹوں اور اس قسم کے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا اس کے برعکس جو لوگ راہ خدا میں جہاد اور جدوجہد کرتے ہیں اور دعوت انبیاء کو قبول کرتے ہیں ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ انھیں تکامل و ارتقاء کی منزلوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور سیر الی اللہ کا راستہ کہ جو نشیب و فراز سے پر ہے اس میں ہدایت کرتا ہے جبکہ ظالموں اور جھوٹوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتیں اور عالم بے راہ روی میں سرگرداں رہیں نیز اعمال اچھے ہوں یا برے ان کی خاصیت چونکہ خدا کی طرف سے ہے لہذا ان کے نتائج کی نسبت خدا کی طرف دی جاسکتی ہے۔

جی ہاں! خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ ہدایت تشریعی کا طریقہ اختیار فرماتا ہے یعنی انبیاء کو مبعوث کرتا ہے تاکہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر لوگوں کو توحید اور نفی طاغوت کی دعوت دیں اس ہدایت تشریعی کے بعد جو شخص یا گروہ اپنی لیاقت و اہلیت ثابت کرتا ہے وہ اس کے لطف و ہدایت تکوینی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

جی ہاں! یہ ہے خدا کی دائمی سنت، نہ وہ کہ جو فکر الدین رازی اور اس جیسے مکتب جبر کے طرفداروں نے کہا ہے کہ خدا پہلے انبیاء کے ذریعہ دعوت دیتا ہے اور پھر جبری طور پر (بغیر کسی وجہ کے) لوگوں میں ایمان یا کفر پیدا کر دیتا ہے، تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں اس سلسلے میں خدا سے کسی قسم کا کوئی سوال و جواب نہیں ہو سکتا۔

واقعا لوگوں نے خدا کا کیسا وحشت ناک تصور پیش کیا ہے کہ جو کسی عقل، احساس اور منطق سے مناسبت نہیں رکھتا۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں ہدایت و ضلالت کے بارے میں مختلف انداز سے بات کی گئی ہے پہلے فرمایا گیا ہے: ”خدا نے ایک گروہ کی ہدایت کی“ لیکن ضلالت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ ”خدا نے ایک گروہ کو گمراہ کیا“۔ بلکہ فرمایا:۔ حقت علیہم الضلالة

یعنی گمراہی ان کے لئے ثابت ہو گئی اور ان کے دامن سے لپٹ گئی۔

تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے۔ دوسری آیات قرآن اور بعض روایات سے ظاہر ہونے والی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ ہدایت کا زیادہ تعلق ان مقدمات سے ہے جو خدا تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں، اس نے عقل دی ہے، انسانی فطرت کو توحید کے لئے آمادہ کیا ہے، انبیاء بھیجے ہیں اور تشریعی و تکوینی آیات دکھائی ہیں اب صرف بندوں کی طرف سے ایک آزادانہ ارادے کی ضرورت ہے کہ جو انہیں منزل مقصود تک پہنچادے۔

جبکہ ضلالت و گمراہی میں تمام قمر کردار خود بندوں کا ہے کیونکہ خود بندے ہی تکوینی و تشریعی ہدایت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں الہی فطرت کے قوانین کو پامال کرتے ہیں۔ تشریعی و تکوینی آیات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور انبیاء کی دعوت پر چشم بصیرت اور گوش ہوش بند کر لیتے ہیں۔ خلاصہ یہ تخریب و تحریف کے ان سب عناصر کے ساتھ وادی ضلالت میں قدل رکھتے ہیں

تو کیا یہ سب امور انہی کی طرف سے نہیں ہیں؟

سورۃ نساء کی آیہ ۷۹ میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ﴿ما اصابک من حسنة فمن الله و ما اصابک من سيئة

فمن نفسك﴾

جو بھلائی تجھے حاصل ہو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی تجھے پہنچے وہ خود تیری طرف سے ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی طرف سے اصول کافی میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ اس مطلب کو زیادہ واضح کرتی ہے۔

ایک صحابی نے آپ سے جبر و اختیار کے بارے میں سوال کیا:-

آپ (علیہ السلام) نے جواب میں فرمایا:

۱۔ اس بناء پر ضروری نہیں کہ ہم ”جزا“ کو ”سینات“ سے پہلے مقدر فرض کریں۔

۲۔ یہ جملہ تقدیر میں یوں تھا۔ ”لیقول لهم اعبدوا الله

لکھو

بسم الله الرحمن الرحيم

قال علی بن الحسین قال الله عزوجل :

یا بن آدم ! بمشیتی كنت انت الذی تشاء، بقوتی ادیت الی فرائضی، وبنعمتی قویت الی معصیتی ، جعتک سمیعاً بصیراً

” ما اصابک من حسنة فمن الله وما اصابک من سيئة فمن نفسك“

”وذلك الی اولیٰ بحسناتک منک ، اونت اولیٰ بسیئاتک منی“

ترجمہ

بسم الله الرحمن الرحيم

(امام) علی بن الحسین (زین العابدین) نے فرمایا کہ

(حدیث قدسی میں) اللہ عزوجل فرماتا ہے:

اے فرزند آدم! میرا ارادہ ہے کہ جس کی بنیاد پر تو ارادہ کر سکتا ہے (میں نے تو تجھے ارادے کی آزادی بخشی ہے)،

اور میری عطا کردہ قوت کے ساتھ تو واجبات ادا کر سکتا ہے،

جبکہ میری نعمت سے سوئے استفادہ کرتے ہوئے تو نے اس وقت کو نافرمانی کی طاقت میں بدل لیا ہے،

میں نے تجھے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے (اور صحیح و غلط راستے کی نشاندہی کر دی ہے)۔

اب جو بھلائی تجھے پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جس برائی کا تجھے سامنا کرنا پڑتا ہے وہ خود تیری طرف سے

ہے۔“

یہ اس لئے ہے کہ توجونیک کام انجام دیتا ہے اس کے حوالے سے میں تجھ سے اولیٰ اور زیادہ مستحق ہوں اور جن برے کاموں کا تو مرتکب ہوتا ہے مجھ سے سزاوارتر ہے۔^(۱)

یہ تعبیر بھی انسانی ارادے کی آزادی کے لئے ایک زندہ دلیل ہے کیونکہ ہدایت و گمراہی جبری ہوتی تو زمین میں چلنا پھرنا اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنا فضول تھا لہذا یہ حکم بذاتِ خود اس بات کی تاکید ہے کہ کسی شخص کی سر نوشت پہلے سے معین شدہ نہیں ہے بلکہ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

”سیر فی الارض“ (زمین میں چلنا پھرنا) اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنا، اس بارے میں قرآن مجید میں بہت اور قابل توجہ مباحث موجود ہیں اس کا تفصیلی ذکر ہم تفسیر نمونہ، جلد ۳ سورہ آل عمران آیت ۱۳ کے ذیل میں کر آئے ہیں۔

زیر بحث آیت میں پیغمبر اکرم کی دلجوئی کے طور پر تاکید کی گئی ہے کہ آخر کار یہ گمراہ اور ہٹ دھرم لوگ اس مقام تک جا پہنچیں گے تو جس قدر بھی ”ان کی ہدایت کے لئے خواہش مند ہو جائے اور کوشش کرے، کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ خدا جسے گمراہ کرے (پھر اسے) ہدایت نہیں کرتا“۔ ﴿إِنْ تَحَرَّصَ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ﴾۔ اور ان کے لئے کوئی یار و مددگار نہیں ہے“ ﴿وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ﴾۔

”تحرص“ مادہ ”حرص“ سے خوب کوشش کے ساتھ کوئی چیز طلب کرنے کے معنی میں ہے۔ واضح ہے کہ یہ جملہ تما منخرین اور کجرو لوگوں کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کا فریضہ ہے تبلی و ہدایت کرنا اور ہم جانتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ تبلیغ و ہدایت بہت سے گمراہوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے باعث سے بہت سے افراد دین حق سے منسلک ہو جاتے ہیں اور بڑے عشق اور جذبے سے دین حق کا دفاع کرنے لگتے ہیں اور اس کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔

لہذا مندرجہ بالا جملہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے کہ جن کی ہٹ دھرمی اور بددماغی انتہا کو پہنچ گئی ہو اور وہ استکبار، غرور، غفلت اور گناہ میں ایسے غرق ہو گئے ہوں گے کہ ان کے سامنے ہدایت کے دروازے نہ کھل سکیں۔ ایسے لوگوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر جتنی بھی کوشش کر لیں بے نتیجہ ہوتی ہے کیونکہ اپنے اعمال کے سبب وہ اس حد تک گمراہ ہیں کہ قابل ہدایت نہیں رہے۔

فطری امر ہے کہ ایسے لوگوں کا کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہوتا کیونکہ یا و مددگار تو کسی مناسب موقع پر ہی اقدام کر سکتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر بھی نفی جبر کی دلیل ہے کیونکہ ”ناصر“ ایسے موقع سے مربوط ہے جہاں خود انسان کے اندر سے جوش پیدا ہو اور اس کا نتیجہ نصرت و مدد ہو ﴿غور کیجئے گا﴾۔

”ناصرین“ جمع کی صورت میں ہے یہ شاید اس طرف اشارہ ہو۔ اس گروہ کے برعکس گروہ مومنین کا ایک دوست اور مددگار نہیں بلکہ بہت سے دوست اور مددگار ہیں خدا ان کا مددگار ہے انبیاء اور اولیاء الہی ان کے ناصر ہیں۔ ملائکہ رحمت بھی ہیں ان کے حامی و مددگار ہیں۔ سورہ مومن کی آیہ ۵۱ میں ہے۔

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُومُ الشَّهَادَةُ﴾

ہم اپنے رسولوں کی اور اسی طرح مومنین کی اس جہان میں روز قیامت جبکہ گواہی دینے والے شہادت کے لئے اٹھیں گے، نصرت کریں گے۔

نیز سورۃ حم السجدہ کی آیہ ۳۰ میں ہے :-

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَ ابْشِرُوا بِالْجُنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس عقیدہ پر استقامت سے قائم رہتے ہیں ان پر آسمان کے ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور انھیں کہتے ہیں ڈرو نہیں اور غم نہ کھاؤ تمہیں اس جنت کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ ”بلاغِ مبین“ کیا ہے

آیات بالا میں بتایا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی ذمہ داری ”بلاغِ مبین“ ہے۔

﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾

یعنی ہادیان الہی محدود وقت کے سوا اپنی دعوت مخفی طور پر جاری نہیں رکھ سکتے۔ مخفی کام اور وہ بھی دعوت رسالت کے زمانے میں قابل قبول اور نتیجہ بخش نہیں ہو سکتا ایسی صراحت کہ جس میں رشد و ہدایت اور قاطعیت ہو تدبیر کے ساتھ ساتھ اس دعوت کی شرط ہے۔

اسی بناء پر تاریخ شاہد ہے کہ تمام انبیاء اگرچہ وہ عام طور پر تنہا ہوتے تھے اپنی دعوت صراحت اور وضاحت سے پیش کرتے تھے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی مشکلات کے لئے تیار رہتے تھے اور یہی تمام حقیقی رہبروں کا دستور العمل ہے چاہے وہ انبیاء و مرسلین ہوں یا ان کے علاوہ۔ کیونکہ خاموش رہنے سے دعوت کو کوئی قبول نہیں کرتا اور نہ ہی دو مختلف پہلو رکھنے والی باتوں سے کوئی استفادہ پاتا ہے۔ حقیقی رہبر حقیقت بیان کرنے کے لئے کوئی چیز فرو گذاشت نہیں کرتے وہ اس صراحت اور قاطعیت کے تمام نتائج بھی دلوں جان سے قبول کرتے ہیں۔

۲۔ ہر امت کے لئے ایک رسول

زیر بحث آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے ہر امت میں ایک رسول مبعوث کیا ہے۔ یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر ہر امت میں رسول بھیجا گیا ہے تو پھر دنیا کے تمام ممالک میں پیغمبر مبعوث ہوئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کم از کم امت ہے حالانکہ تاریخ اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی۔ ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ خدائی دعوت امتوں کے کانوں تک پہنچ جائے ورنہ ہم جانتے ہیں کہ جس زمانے میں پیغمبر اسلام نے مکہ یا مدینہ میں قیام کیا تھا حجاز کے دوسرے شہروں میں کوئی پیغمبر نہیں تھا لیکن رسول اللہ نے اپنے نمائندے ان علاقوں میں بھیجے تھے ان نمائندوں نے رسول اللہ کی آواز ان سب کے کانوں تک پہنچائی علاوہ ازیں خود رسول اللہ نے خطوط لکھے اور مختلف ممالک مثلاً ایران، روم اور حبشہ کی طرف قاصد روانہ کئے اس طرح ان تک پیغام الہی پہنچایا گیا۔ اس وقت ہم بھی ایک امت ہیں ہم نے صدیوں بعد پیغمبر اسلام کی دعوت آپ کا پیغام لانے والے علماء کے ذریعے سنی ہے۔

ہر امت میں رسول بھیجنے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۱۔ آیت کے آخر میں گمراہوں کو بیدار کرنے اور ہدایت یافتہ افراد کی روحانی تقویت کے لئے ایک عمومی حکم صادر فرمایا گیا ہے: زمین میں چلو پھرو اور صفحہ زمین پر باتہ خاک چھپے ہوئے گزشتہ لوگوں کے آثار کا مطالعہ کرو اور دیکھو آیات الہی کی تلمذ کرنے والوں کا کیا انجام ہوا (فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ)۔

آیات ۳۸، ۳۹، ۴۰

۳۸۔ ﴿وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَنْ يَمُوتُ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

۳۹۔ ﴿لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلَفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ﴾۔

۴۰۔ ﴿إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾۔

ترجمہ

- ۳۸۔ انہوں نے تاکید سے قسم کھا کر کہا کہ مر جانے والوں کو خدا ہر گز مبعوث نہیں کرے گا۔ جی ہاں! یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مرنے والوں کو پھر سے زندہ کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
- ۳۹۔ مقصد یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے وہ ان کے سامنے واضح کر دی جائے تاکہ انکار کرنے والے جان لیں کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔
- ۴۰۔ (معاد و قیامت ہمارے لئے مشکل نہیں ہے کیونکہ) ہم جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف کہتے ہیں کہ ہو جا، تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

شان نزول

- پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں مفسرین نقل کرتے ہیں:
- ایک مسلمان نے کسی مشرک سے کچھ لینا تھا جب اس نے مطالبہ کیا تو اس نے قرض ادا کرنے میں لیت و لعل کی۔ مسلمان پریشان ہوا، اس نے دوران گفتگو قسم کھائی:
- اس چیز کی قسم کہ جس کے انتظار میں ہوں
- (اس کا مقصد قیامت اور حساب خدا تھا) مشرک کہنے لگا:
- ”تم سمجھتے ہو کہ ہم موت کے بعد زندہ کئے جائیں گے۔ واللہ وہ کسی مردہ کو زندہ نہیں کرے گا۔“
- (اسکے بعد یہ بات اس لئے کہی کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مردوں کی بازگشت اور حیاتِ نو فضول یا محال بات ہے)
- (اس کے بعد اس بات پر یہ آیت نازل ہوئی اس میں اسے اور اسے جیسے افراد کو جواب دیا گیا ہے اور مسئلہ معاد کو واضح دلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔^(۱))

۱۔ تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر ابو الفتوح رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر

معاد اور اختلافات کا خاتمہ

گذشتہ آیات توحید اور رسالتِ انبیاء کے بارے میں تھیں۔ زیر بحث آیات میں مباحثِ توحید کے ایک پہلو کا ذکر ہے

ارشاد ہوتا ہے: وہ تاکید کے ساتھ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ مرجانے والوں کو خدا ہرگز مبعوث نہیں کرے گا اور انھیں حیات نو عطا نہیں کرے گا ﴿وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَن يَمُوتُ﴾۔

بغیر کسی دلیل کے ان کا یہ انکار اور بھی تاکیدِ قسموں کے ساتھ ان کی نادانی اور جہالت کی نشانی ہے لہذا ان کے جواب میں قرآن کہتا ہے: یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مرنے والوں کو حیات نو عطا کرے گا تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ دکھ لیں) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اور نہ جاننے کی وجہ سے انکار کر دیتے ہیں ﴿بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔

”بلی“ (جی ہاں) ”حقاً“ اور اس کے بعد وعدہ کا ذکر، وہ وعدہ کہ جو خدا کی طرف سے ہے۔ معاد کی تاکید اور قطعیت کی دلیل ہیں۔

اصول طور پر جو شخص کسی حقیقت کا قاطعیت کے ساتھ انکار کرے اس جواب بھی قاطعیت کے ساتھ دیا جانا چاہیے تاکہ اس انکار کے برے نفسیاتی اچرات اثباتِ قاطع کے ذریعہ دور ہو سکیں اور یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کی طرف سے نفی، بے خبری اور نادانی کی وجہ سے ہے۔ اس طرح انکار اپنا اثر بالکل کھو دے گا۔

اس کے بعد معاد و قیامت کا مقصد اور اس پر خدا کی قدرت کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس امر کی نشاندہی کی جائے کہ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حیات نو قدر خدا میں نہیں ہے تو یہ ان کا بہت بڑا اشتباہ ہے اور اگر ان کا خیال ہے کہ معاد و قیامت بے مقصد ہے تو یہ بھی ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔

فرمایا گیا ہے: خدا مرنے والوں کو مبعوث کرے گا تاکہ جو چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے ان کے سامنے واضح کر دے ﴿لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يُخْتَلَفُونَ فِيهِ﴾۔ اور اس لئے کہ وہ جان لیں کہ وہ اس حقیقت کا جھوٹ انکار کرتے تھے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ﴾۔

کیونکہ وہ جہان تو ایسا ہے جس میں پردے ہٹ جائیں گے، اور حقائق آشکار ہو جائیں گے۔

جیسا کہ سورہ ق کی آیت ۲۲ میں ہے:- ﴿لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾
انسان سے کہا جائے گا کہ تو اس دن کے بارے میں غفلت میں تھا لیکن ہم نے تیری آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھا دیا ہے اور آج تو خوب دیکھتا ہے۔

سورہ طارق کی آیہ ۹ میں ہے:- ﴿يَوْمَ تَبْلَى السَّرَائِرُ﴾

قیامت ایسا دن ہے کہ جب راز ہائے پنہاں آشکار ہو جائیں گے۔

نیز سورہ ابراہیم کی آیت ۴۸ میں ہے:- ﴿وَبَرِّزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾

اس روز سب کے سب خدائے واحد و قہار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ وہ دن شہود، کشفِ اسرار اور ظہور کا دن ہے۔ اس روز پنہاں چیزیں آشکار ہو جائیں گی ایسے حالات اور ماحول میں اختلافِ عقیدہ کا کوئی معنی نہیں ہے اگرچہ ممکن ہے کہ بعض ہٹ دھرم من کمر اپنے آپ کو بچانے کے لئے جھوٹے سہارے لینے کی کوشش کریں لیکن یہ ایک استثنائی اور زود گزر امر ہے یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی مجرم کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے تو اپنے تمام جرائم کا انکار کر دے لیکن جب فوراً ٹیب ریکارڈ لگا کر اس کی آواز اسے سنائی جائے اس کے دستخط اسے دیکھائے جائیں اور واضح ثبوت اس کے سامنے پیش کیے جائیں اور اسے ساتھ لے جا کر، اس کے جرم کے آثار، موقع و محل دکھایا جائے تو اب جائے کلام باقی نہ رہے گی اور وہ اقرار کر لے گا۔ عالم قیامت میں حقائق کا ظہور اس سے بھی زیادہ واضح اور آشکار ہو گا۔

موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کے مختلف اہداف و مقاصد ہیں جن کی مختلف مقامات پر آیات قرآنی میں نشاندہی کی گئی ہے مثلاً انسان کا تکامل و ارتقاء، اجرائے عدالت، اس جہان کی زندگی کو با مقصد بنانا، فیضِ الہی کو جاری و ساری رکھنا وغیرہ۔

زیر بحث آیت ایک اور مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ہے اختلافات کو دور کرنا اور توحید طرف لوٹنا۔ ہم جانتے ہیں کہ بہترین اصل کہ جو سارے عالم پر حکمران ہے وہ اصل توحید ہے۔ یہ وسیع اور ہمہ گیر اصل خدا کی ذات، صفات اور افعال پر صادق آتی ہے سارے عالم خلقت اور قوانین آفرینش پر بھی یہ اصل حکمران ہے اور ہر چیز کو آخر کار اسی اصل کی طرف پلٹنا چاہیئے لہذا ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ اختلافات اور نزاعات ایک دن ختم ہو جائیں گے اور

ساری دنیا کے لوگ ایک حکومت کے پرچم تلے جمع ہو جائیں گے اور یہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت ہوگی کیونکہ عالم ہستی کی روح یعنی توحید کے برخلاف جو کچھ بھی ہے اسے آخر ایک دن ختم ہونا چاہیئے۔
لیکن عقائد کا یہ اختلاف دنیا سے مکمل طور پر ختم کبھی بھی ختم نہیں ہوگا کیونکہ یہ عالم غطا ہے یہاں بہت کچھ پردے میں ہے۔

البتہ ایک دن آئے گا کہ جب یہ پردے ہٹ جائیں گے اور وہ ”یوم ظہور“ ہے۔ اس بناء پر معاد کا ایک ہدف یہ ہے کہ سب وحدت کی طرف پلٹ آئیں اور تمام اختلافات ختم ہو جائیں۔ اسی ہدف کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے قرآن مجید کی بہت سی آیات میں اس مسئلے کی تکرار اور تاکید موجود ہے کہ خداوند عالم روز قیامت لوگوں کے درمیان عدالت کرے گا اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ ۲

دوسرا نکتہ ایک اور حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ کہ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی بازگشت اور نئی زندگی محال ہے تو یہ جان لیں گے قدرت خدا اس سے برتر اور بالا ہے ”جب ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو فقط یہ کہتے ہیں کہ ”ہو جا“ تو وہ فوراً موجود ہوتی ہے“ ﴿إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾۔

ایسی قدرت کاملہ کہ جس میں صرف ”ہو جا“ کا فرمان ہر چیز کے وجود کے لئے کافی ہو تو پھر اس کے لئے مردوں کے حیات نو عطا کرنے کی قدرت کے بارے میں تردد و شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ ”کن“ (ہو جا) کی تعبیر بھی تنگی بیان کی وجہ سے ہے ورنہ خدا کے لئے ”کن“ کی ضرورت نہیں۔ اس کا ارادہ ہی کام کا ہو جانا ہے۔ اس کی ناقص سی مثال اپنی زندگی سے پیش کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ ہم ارادہ کرتے ہیں کس چیز کے تصور کا تو وہ ہمارے ذہن میں ایجاد ہو جاتا ہے ہم اگر کسی عظیم پہاڑ، وسیع، سمندر، درختوں سے بھرے بہت بڑے باغ یا ایسی کسی چیز کا تصور کرنا چاہیں تو ہمارے لئے کیا مشکل ہے کیا اس کے لئے ہمیں کسی جملے اور لفظ کی احتیاج ہے؟ ان موجودات تصویر کی تو صرف تصور ہی سے ہمارے صفحہ ذہن پر ابھر آتی ہے۔ تو اسی طرح خدا کے ”ہو جا“ کہے بغیر، صرف ارادہ سے چیز موجود ہو جاتی ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ ایک صحابی نے آپ سے عرض کیا کہ خدا کے ارادہ اور مخلوق کے ارادہ کے بارے میں وضاحت فرمائیے تو امام (علیہ السلام) نے فرمایا:

مخلوق کا ارادہ باطنی ہے اس کے بعد افعال ہیں کہ جو بعد میں آشکار ہوتے ہیں لیکن خدا کا ارادہ ہی اس کی ایجاد ہے نہ کہ اس کا غیر، کیونکہ خدا میں سوچ بچار، تصمیم اور فکر و نظر نہیں ہے (کیونکہ یہ صفات زائد بر ذات ہیں) خدا کے بارے میں ان چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہے یہ مخلوقات کی صفات ہیں لہذا خدا کا ارادہ ہی ایجاد، افعال ہے۔ فقط خدا کہتا ہے: ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتا ہے بغیر کوئی لفظ ادا کئے، اسے زبان سے ادا کرنے، کمر ہمت باندھنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔^(۳)

۱۔ تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر ابو الفتوح رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ اس سلسلے میں آل عمران کی آیہ ۵۵، مائدہ کی ۴۸، انعام کی ۱۶۴، نحل کی ۹۲، اور حج کی ۶۹ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۳۔ اصول کافی جلد ۱، باب الارادہ، حدیث نمبر ۳۔

آیات ۲۱، ۲۲

۴۱۔ ﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنَبُوِّنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَا جَزَاءُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾۔

۴۲۔ ﴿الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾۔

ترجمہ

۴۱۔ جن لوگوں پر ظلم ہوا اور پھر انہوں نے خدا کے لئے ہجرت کی ہے ہم اس دنیا میں انہیں اچھا مقام دیں گے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کی جزا بہت بڑی ہے۔

۴۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے صبر و استقامت کو اختیار کیا ہے اور وہ صرف اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔

شان نزول

ان آیات کی شان نزول میں بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ مکہ میں اسلام لانے کے بعد بعض مسلمانوں مثلاً بلال، عمار یا سر صہیب اور خنابہ پر سخت تشدد کیا گیا اسلام کی تقویت اور دوسروں تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے پیغمبر اکرم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی یہ ہجرت آپ کی اور دوسروں کی کامیابی کا باعث بنی صہیب سن رسیدہ شخص تھے انہوں نے مشرکین مکہ سے کہا کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں اگر تمہارے پاس رہوں تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور اگر میں تمہارا مخالف تو تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تم ایسا کرو کہ میرے مال لے لو اور مجھے مدینہ جانے دو۔ اس پر صہیب سے لوگوں نے کہا کہ تم نے نفع کا سود کیا ہے اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں اس جہان میں، دوسرے جہان میں ان کی اور ان جیسے لوگوں کی کامیابی کا تذکرہ ہے۔

تاریخ میں ہے کہ خلفاء کے زمانے میں جب بیت المال کے اموال تقسیم ہوتے تھے تو مہاجرین کے باری آتی تھی تو انہیں کہا جاتا تھا کہ اپنا حصہ لے لو یہ وہی ہے کہ جو خدا نے تمہیں دنیا میں دینے کا وعدہ کیا ہے اور جو کچھ دوسرے جہان میں تمہارے انتظار میں ہے وہ بہت زیادہ ہے اس کے بعد وہ مذکورہ بالا آیت کی تلاوت کرتے تھے۔^(۱)

۱۔ مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

تفسیر

مہاجرین کی جزا

ہم نے بار بار کہا ہے کہ قرآن اپنے تربیتی امور میں جس موثر ترین روش سے استفادہ کرتا ہے وہ ہے موازنہ اور تقابل۔ قرآن ہر چیز کو اس کے متضاد کے سامنے لے آتا ہے تاکہ ہر ایک کا مقام واضح اور متعین ہو جائے۔ گزشتہ آیات میں منکرین قیامت اور ہٹ دھرم مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات سچے اور پاکباز مہاجرین کی بات کرتی ہیں تاکہ موازنہ اور تقابل سے دونوں کی کیفیت واضح ہو جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے ستم اٹھائے اور راہ خدا میں ہجرت کی ہم اس دنیا میں انھیں اچھی جگہ اور مقام دیں گے ﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَنَبْؤَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾۔

یہ ان کی دنیاوی جزا ہے، رہی اخروی جزا، اگر وہ جانے تو بہت ہی بڑی ہے ﴿وَلَا جُزْءَ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾۔

بعد والی آیت میں ان سچے اور با استقامت اہل ایمان مہاجرین کی توصیف میں ان کے دو اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے صبر و استقامت کا دامن تھاما اور جو اللہ پر توکل رکھتے ہیں ﴿الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾۔

چند اہم نکات

۱۔ ہجرت اور مہاجرین:

آغاز اسلام میں مسلمانوں نے دو ہجرتیں کیں۔ پہلی ہجرت نسبتاً مختصر تھی اس میں چند مسلمانوں نے ہجرت جعفر بن ابی طالب (علیہ السلام) کی سربراہی میں حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ دوسری ہجرت ہمہ گیر تھی۔ اس میں رسول اللہ اور تمام مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ زیر نظر آیات دوسری ہجرت سے متعلق ہیں۔ ان آیات کی شان نزول بھی اس امر کی تائید کرتی ہے۔

گذشتہ زمانے میں اور دور حاضر میں مسلمانوں کے لئے ہجرت کی دائمی اہمیت کے متعلق ہم سورہ نساء کی آیہ ۱۰۰ اور سورہ انفال کی آیہ ۷۵ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔^(۲)

بہر حال مہاجرین کا مقام اسلام میں بہت بلند ہے، خود پیغمبر اکرم اور بعد کے مسلمان سب ان کا خاص احترام کرتے تھے کیونکہ انہوں نے دعوت اسلام کی توسیع کی خاطر اپنا تمام سرمایہ حیات کو ٹھوکر ماردی۔ بعض نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا صہیب بعض افراد نے اپنے سارے مال و متاع سے منہ پھیر لیا۔

ان دنوں میں اگر ان مہاجرین کا ایشارہ ہوتا تو مکہ کا تنگ ماحول اور اس میں موجود شیطانی عناصر ہرگز اجازت نہ دیتے کہ اسلام کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچے یہ وہ آواز ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے حلقوم میں دبا دیتے لیکن یہ مہاجرین تھے کہ جن کی اس سوچی سمجھی تحریک اور انقلاب کے ذریعے نہ صرف مکہ ان کے زیر تسلط آگیا بلکہ اسلام کی آواز پوری دنیا کے کانوں تک پہنچ گئی ان کا یہ طرز عمل بعد کے مسلمانوں کے لئے اس قسم کے حالات میں ایک دائمی سنت کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ ”ہاجروا فی اللہ“ کا مفہوم:

اس تعبیر میں لفظ ”سبیل“ تک ذکر نہیں ہوا۔ یہ دراصل ان مہاجرین کے انتہائی خلوص کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے صرف خدا کی راہ میں، اس کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی حفاظت کے لئے اس قسم کی ہجرت کی، نہ کہ اپنی جان بچانے کے لئے یا کسی دوسرے مادی مفاد کے لئے۔

۳۔ ”من بعد ما ظلموا“ کا مطلب:

یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ میدان فوراً خالی نہیں کر دینا چاہیے بلکہ جب تک ممکن ہو قیام کرنا چاہیے اور مشکلات کو برداشت کرنا چاہیے۔ البتہ جس وقت دشمن کے آثار اور مظالم برداشت کرنے کا نتیجہ اس کی جسارت میں اضافہ ہو اور مومنین کی کمزوری کے سوا کچھ نہ ہو اس وقت ہجرت کرنا چاہیئے تاکہ زیادہ طاقت جمع کرنے اور زیادہ مضبوط مورچے قائم کرنے کا موقع مل سکے اور ہمہ گیر جہاد کے لئے بہتر جگہ میسر آ سکے اور اہل حق کو فوجی، ثقافتی اور تبلیغی محاذ پر کامیابی حاصل ہو سکے۔

۴۔ ”لنبوئنہم فی الدنیا حسنة“ کا مفہوم:

یہ جملہ ”بوائت لہ مکاناً“ (وہ مکان کہ جو میں نے اس کے لئے تیار کیا اور اسے اس میں جگہ دی) کے مادہ سے لیا گیا ہے، یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ حقیقی مہاجرین اگرچہ ابتداء میں اپنے مادی وسائل کھو بیٹھے تھے لیکن آخر کار انہیں مادی زندگی کے لحاظ سے بھی کامیابی حاصل ہوئی۔^(۳)

انسان آخر دشمن کی ضربوں میں رہ کر ذلت کے ساتھ کیوں مر جائے؟ وہ شجاعت و جرات کے ساتھ ہجرت کیوں نہ کر جائے اور کیوں نہ نئی جگہ سے مقابلے کی تیاری کرے تاکہ اپنا حق لے سکے۔

سورہ نساء کی آیہ ۱۰۰ میں یہی مسئلہ زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد الہی ہے:

﴿وَمَنْ يَهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مَرَاغِمًا كَثِيرًا وَسَعَةً﴾

جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں انھیں دنیا میں امن کی بہت وسیع جگہ ملے گی کہ جہاں رہ کر وہ دشمن کو رسوا کر سکتے ہیں۔

۵۔ مہاجرین کی صفات: مہاجرین کی دو صفات بیان کی گئی ہیں صبر اور توکل۔ ان کی ان صفات کو بیان کرنے کا مقصد واضح ہے کیونکہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے ایسے روح فرسا حوادث میں سب سے پہلے صبر و استقامت ضروری ہے جتنی مصیبت زیادہ ہوگی پھر اللہ پر توکل اور اعتماد بھی ضروری ہے اصول طور پر ایسی مشکلات میں اگر انسان کا کوئی مستحکم اور قابل اطمینان سہارا نہ ہو تو اس کے لئے صبر و استقامت ممکن نہیں ہے۔

بعض نے کہا کہ صبر کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس راہ میں پہلے خواہشات نفسانی کے مقابلے میں صبر و استقامت ضروری ہے اور توکل کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس راستے کا آخری یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا ہر کسی سے کٹ جائے اور اس سے پیوستہ ہو جائے لہذا پہلی صفت آغاز سفر ہے اور دوسری اختتام سفر۔^(۴)

بہر حال بیرونی ہجرت اندرونی ہجرت کے بغیر ممکن نہیں ہے انسان کو چاہیے کہ پہلے وہ اندرونی مادی برائیوں کو چھوڑ کر اخلاقی فضائل کی طرف ہجرت کرے تاکہ وہ بیرونی طور پر اس قسم کی ہجرت کر سکے اور دار الکفر کی ہر چیز کو ٹھوکر مار کر مدار الایمان کی طرف منتقل ہو سکے۔

۱۔ مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۸۵ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ ”لَبِوْنَهُمْ“ اصل میں ”بواء“ کے مادہ سے جگہ کے اجزاء مساوی ہونے کے معنی میں ہے۔ اس کے برعکس ”نبوہ“ (بروزن ”مبداء“) جگہ کے اجزاء مساوی نہ ہونے کے معنی میں ہے۔ لہذا ”بوات لہ مکانا“ کا معنی ہے: میں نے اس کے لئے جگہ صاف کی لہذا یہ کسی کے لئے کوئی جگہ تیار کرنے کے معنی میں ہے۔

۴۔ تفسیر کبیر فخر رازی، شیر بحث آیت کے ذیل میں۔

آیات ۲۲، ۲۳

۴۳۔ ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾۔

۴۴۔ ﴿بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔

ترجمہ

۴۳۔ ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے مرد کہ جن پر وحی نازل کی، کے سوا کسی کو نہیں بھیجا، اگر تم نہیں جانتے تو باخبر لوگوں سے پوچھ لو۔

۴۴۔ (اور وہ لوگ جو) واضح دلائل اور (گزشتہ انبیاء کی) کتب سے (آگاہ ہیں) اور ہم نے اس ذکر (قرآن) کو تجھ پر نازل کیا تاکہ لوگوں کی طرف جو کچھ ہم نے بھیجا ہے وہ ان سے بیان کرو شاید وہ غور فکر کریں۔

تفسیر

نہیں جانتے تو پوچھ لو

گذشتہ دو آیتیں حقیقی مہاجرین کے بارے میں تھیں البتہ زیر بحث آیات کے بارے میں دوبارہ اصول دین سے متعلق گزشتہ مسائل کا ذکر ہے ان میں مشرکین کے ایک مشہور اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

وہ کہتے تھے کہ خدا نے تبلیغ رسالت کے لئے کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیج دیا (یا وہ کہتے تھے کہ پیغمبر کے پاس کوئی ایسی غیر معمولی قوت کیوں نہیں ہے جس کے ذریعے وہ ہمیں یہ کام ترک کرنے پر مجبور کر دے کہ جو ہم انجام دیتے ہیں) ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں اور وہ بھی بس ایسے ہی مرد تھے کہ جن پر وحی نازل ہوتی تھی ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ﴾۔

جی ہاں یہ مرد نوع بشر میں سے تھے ان میں تمام قرآنی جذبات و احساسات موجود تھے یہ لوگوں کی مشکلات اور مصائب کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ان کی ضروریات کو جانتے تھے جبکہ کوئی فرشتہ ان امور سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کے اندر جو گذرتی ہے فرشتہ اسے نہیں سمجھ پاتا۔

مسلم ہے صاحبان وحی کی اس کے سوا کوئی اور ذمہ داری نہ تھی کہ وہ ابلاغ رسالت کریں۔ ان کا کام تھا کہ وہ پیغام وحی حاصل کریں۔ اسے انسانوں تک پہنچائیں اور معمول کے ذرائع کے ساتھ مقاصد وحی کے حصول کی جدوجہد کریں۔ ان کا یہ کام نہ تھا کہ کسی غیر معمولی خدائی طاقت کے ذریعے تمام طبیعی قوانین کو توڑتے ہوئے لوگوں کو قبولیت کی دعوت

دیں اور انہیں انحرافات ترک کرنے پر مجبور کریں کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو پھر کسی کا ایمان لانا کوئی افتخار کی بات نہ ہوتی اور نہ ہی ایسا ایمان ترقی اور کمال کا ذریعہ ہوتا۔

اس حقیقت پر تاکید اور اس کی تائید کے لئے مزید فرمایا گیا ہے: اگر اس بات کا تمہیں علم نہیں تو جاؤ باخبر لوگوں سے پوچھو ﴿فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾۔

”ذکر“ آگاہی اور اطلاع کے معنی میں ہے اور ”اہل الذکر“ ایک وسیع مفہوم ہے۔ مختلف سطح پر اسکے مفہوم میں تمام آگاہ اور باخبر لوگ شامل ہیں۔

بہت سے مفسرین نے ”اہل الذکر“ سے اہل کتاب کے علماء مراد لیتے ہیں۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ”اہل الذکر“ کا مفہوم اسی میں محدود سمجھ لی جائے بلکہ درحقیقت اس کے کلی مفہوم کا ایک مصداق ہے کیونکہ اس کے بارے میں سوال قاعدتاً اہل کتاب کے اور یہود و نصاریٰ کے علماء سے کیا جانا چاہیے کہ گزشتہ انبیاء و مرسلین نوع بشر میں سے تھے اور مرد تھے کہ جو خدائی احکام کی تبلیغ اور اجراء کے لئے مامور ہوئے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اہل کتاب ہر لحاظ سے مشرکین کے ہم آہنگ نہ تھے بلکہ اسلام کی مخالفت میں وہ ان سے ہم آہنگ تھے لہذا گزشتہ انبیاء کے حالات بیان کرنے کے لئے اہل کتاب کے علماء بہتر ذریعہ تھے۔

مفردات میں راغب نے کہا ہے کہ ”ذکر“ کے دو معنی ہیں یہ لفظ کبھی ”حفظ“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی ”یاد آوری“ کے معنی میں۔

البتہ ممکن ہے یاد آوری دل ہی سے ہو (دل سے یاد کرنا دراصل باطنی ذکر شمار ہوتا ہے) یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کو ذکر کہا جاتا ہے یہ اس بناء پر ہے کہ قرآن حقائق کو واضح کرتا ہے۔

اگلی آیت میں ہے: اگر تم انبیاء اور ان کی کتب کے واضح دلائل سے آگاہ نہیں ہو تو آگاہ اور باخبر لوگوں کی طرف رجوع

کرو ﴿بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ﴾۔^(۱)

توجہ رہے کہ علم باء کے بغیر اور باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے پہلے ”ارسلنا“ مقدر ہے اور اصل میں یوں تھا ”ارسلنا ہم بالبینات والزبر“

بعض نے کہا ہے کہ اس کا متعلق ”و ما ارسلنا“ قبل کی آیت میں ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ”نوحی الیہم“ سے متعلق ہے۔

واضح ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے مطابق آیت کا ایک خاص مفہوم ہوگا لیکن مجموعی طور پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

”بینات“ ”بینۃ“ کی جمع ہے اس کا معنی ہے ”واضح دلائل“، ہو سکتا ہے یہاں یہ انبیاء کے معجزات اور ان کی حقانیت کے دیگر دلائل کی طرف اشارہ ہو۔

”زبر“ ”زبور“ کی جمع ہے اس کا معنی ہے ”کتاب“۔

در حقیقت ”بینات“ کا مفہوم ہے اثبات کے دلائل اور ”زبر“ ان کتب کی طرف اشارہ ہے جن میں انبیاء کی تعلیمات جمع تھیں۔

اس کے بعد قرآن روی سخن پیغمبر اکرم کی طرف کمرے ہوئے کہتا ہے: ہم نے یہ ذکر (قرآن) تجھ پر نازل کیا تاکہ لوگوں کے لئے جو کچھ نازل ہوا ہے تو ان سے بیان کرے ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾۔

تاکہ وہ ان آیات پر غور و فکر کریں اور ان کے حوالے سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں ان کی طرف متوجہ ہوں ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔

در حقیقت تیری دعوت اور رسالت کا پروگرام اصول طور پر کوئی نئی چیز نہیں۔ گزشتہ رسولوں پر بھی ہم نے آسمانی کتابیں نازل کی ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ان ذمہ داریوں سے آگاہ کریں کہ جو خدا، مخلوق اور خود اپنی ذات کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اس کے مفاہیم اور تعلیمات کو بیان کرے اور انسانوں کی فکر کو بیدار کرے تاکہ وہ مسئولیت اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ قدم اٹھائیں اور رشد و کمال کی طرف آگے بڑھیں (نہ کہ جبری طریقے سے اور خدا کی خلاف معمول جبری طاقت سے)۔

۱۔ ”بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ“ ترکیب کے لحاظ سے کس فعل سے متعلق ہے اس سلسلے میں مفسرین نے کئی ایک احتمالات ذکر کئے ہیں بعض نے اسے ”لَتَعْلَمُونَ“ سے متعلق سمجھا ہے (جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اور ظاہری مفہوم سے یہی بات مطابقت رکھتی ہے)۔

ایک اہم نکتہ

اہل ذکر کون ہیں؟

اہلبیت علیہم السلام کے ذرائع سے مروی متعدد روایات میں ہے کہ اہل ذکر آئمہ اہل بیت ہیں۔ ان میں سے ایک روایت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ اس آیت کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا: نحن اهل الذكر و نحن المسئولون

ہم ہے اہل ذکر اور ہم ہی سوال کیا جانا چاہئیے^(۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا: الذکر القرآن ، وآل الرسول اهل الذكر و هم المسئولون

ذکر قرآن ہے اور آل رسول اہل ذکر ہیں اور انہیں سے سوال کیا جانا چاہئیے۔^(۲)

بعض روایات میں ہے کہ ذکر خود رسول اللہ ہیں اور ان کے اہل بیت اہل ذکر ہیں۔^(۳) اس مضمون کی اور بھی کئی روایات ہیں۔

اہل سنت کی تفاسیر اور کتب میں بھی اسی مضمون کی بہت سی روایات ہیں ان میں سے ایک روایت ابن عباس سے مروی ہے جسے اہل سنت کی مشہور بارہ تفاسیر میں زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں: هو محمد و علی و فاطمہ و الحسن و الحسين هم اهل الذكر و العقل و البیان

محمد، علی، فاطمہ، حسن، اور حسین ہی اہل ذکر، اہل عقل اور اہل بیان ہیں۔^(۴)

بارہ تفاسیر سے مندرجہ ذیل تفاسیر مراد ہیں:

۱۔ تفسیر ابو یوسف ۲۔ تفسیر ابن حجر ۳۔ تفسیر مقاتل بن سلیمان ۴۔ تفسیر وکیع بن جراح

۵۔ تفسیر یوسف بن موسیٰ ۶۔ تفسیر قتادہ ۷۔ تفسیر حرب الطائی ۸۔ تفسیر سدی

۹۔ تفسیر مجاہد ۱۰۔ تفسیر مقاتل بن حیان ۱۱۔ تفسیر ابو صالح ۱۲۔ تفسیر محمد بن موسیٰ الشیرازی

اسی آیت کی تفسیر میں جابر جعفی کی ایک حدیث ثعلبی کی کتاب میں مرقوم ہے۔ وہ کہتا ہے:-

لما نزلت هذه الآية قال علی (علیہ السلام) نحن اهل الذكر

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، حضرت علی (علیہ السلام) نے فرمایا: ”اہم اہل ذکر ہیں“۔ (مذکورہ بالا مدرک کی طرف رجوع کریں)

آیات قرآن کی تفسیر میں معین مصدیق پر بنی روایات سے یہ ہمارا پہلا سابقہ نہیں ہے ایسا مصداق آیت کے وسیع مفہوم کو کبھی محدود نہیں کرتا۔

اسی طرح یہاں بھی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ذکر ہر قسم کی آگاہی، یاد آوری اور اطلاع کے معنی میں ہے اور اہل ذکر کے مفہوم میں ہر سطح کے آگاہ اور باخبر افراد شامل ہیں لیکن قرآن مجید چونکہ یاد آوری، علم اور آگاہی کا زیادہ واضح نمونہ ہے لہذا اس پر ”ذکر“ کا اطلاق ہوا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ کی ذات بھی اس کا واضح مصداق ہے اسی طرح آئمہ معصومین کہ جو آنحضرت کے اہل بیت اور آپ کے علم کے وارث ہیں وہ ”اہل الذکر“ کا واضح ترین مصداق ہیں۔

اس کے سارے مسئلے کو قبول کر لیا جائے تو یہ آیت کے عمومی مفہوم کے منافی نہیں اور نہ ہی اس بات کے منافی ہے کہ اہل کتاب کے علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء اصول اور فقہاء نے اس سے اجتہاد اور تقلید کرنا چاہیے۔

اس موقع پر ایک روایت کے حوالے سے ایک سوال ابھرتا ہے۔ روایت عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے روایت کے مطابق جو لوگ اس آیت کی تفسیر میں کہتے تھے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کرو اور ان پر آپ نے اعتراض کیا اور فرمایا:

سبحان اللہ! کیسے ممکن ہے کہ ہم علماء یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اس طرح تو یقیناً وہ ہمیں اپنے مذہب کی طرف دعوت دیں گے۔

پھر فرمایا: اہل ذکر ہم ہیں۔^(۵)

اس سوال کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ امام نے یہ بات ان لوگوں سے کہی ہے جو آیت سے یہ مراد سمجھتے ہیں کہ ہر دور میں صرف علماء اہل کتاب کی طرف رجوع کیا جائے حالانکہ یہ بات ہر زمانے کے لئے نہیں ہے۔ مثلاً امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کی ہر گز یہ ذمہ داری نہ تھی کہ وہ حقائق جاننے کے لئے یہودی اور عیسائی علماء کے پاس جائیں ایسے زمانے میں علماء اسلام مرجع ہیں اور علماء اسلام کے سید و سردار آئمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرم کے زمانے کے مشرکین کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس مسئلے سے آگاہی کے لئے کہ اللہ نبی نوع بشر میں سے تھے، علماء اہل کتاب کی طرف رجوع کریں بلکہ چاہیے کہ ہر مسئلہ اس مسئلے سے آگاہ افراد سے پوچھا جائے اور یہ ایک بدیہی بات ہے۔

بہر حال زیر بحث آیت میں ایک بیادی اسلامی اصول بیان کیا گیا ہے یہ آیت مادی و روحانی تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور تمام مسلمانوں کو تاکید کرتی ہے کہ جو چیز وہ نہیں جانتے اس کے بارے میں آگاہ افراد سے پوچھیں اور جن مسائل سے جو لوگ آگاہ نہیں ہیں وہ ان میں دخل اندازی نہ کریں۔ اس طرح سے قرآن نے نہ صرف اسلامی دینی مسائل میں ”تخصص“ (specialization) کی ضرورت کو باقاعدہ قانونی طور پر تسلیم کیا ہے بلکہ تمام شعبوں، تمام مواقع اور تمام علاقوں میں اس کے لئے تاکید کی ہے اس بناء پر تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہر زمانے میں ہر شعبے اور ہر موضوع پر ان کے پاس آگاہ اور ماہر افراد موجود ہوں۔ تاکہ نہ جاننے والے ان کی طرف رجوع کریں۔

اس نکتے کا ذکر نا بھی ضروری ہے کہ ہمیں ایسے متخصصین اور ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کی صداقت، بے غرضی اور دوستی ثابت ہو۔ کیا ہم کبھی کسی ایسے ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کریں گے خود جس کے کام سے ہم مطمئن نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ تقلید اور مرجعیت کی بحث میں اجتہاد یا علمیت کے ساتھ عدالت کو بھی قرار دیا جاتا ہے یعنی مرجع تقلید اسلامی مسائل کا عالم و آگاہ ہو، صاحب تقویٰ بھی ہو۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۵ تا ۵۶۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۵ تا ۵۶۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۵ تا ۵۶۔

۴۔ احقاق الحق جلد ۳ ص ۴۸۲۔

۵۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۷۔

آیات ۳۵، ۳۶، ۳۷

۴۵- ﴿أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ﴾ -

۴۶- ﴿أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقْلُبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾ -

۴۷- ﴿أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ -

ترجمہ

۴۵- کیا سازش کرنے والے اللہ کے اس دردناک عذاب سے مامون ہو گئے ہیں کہ جو ممکن ہے - خدا ان کو زمین میں دھنسا دے گی (اس کی) سزا ایسی جگہ سے ان کے پاس آہنچے کہ جہاں سے انھیں توقع نہیں ہے -

۴۶- یا جس وقت (زیادہ مال و دولت سمیٹنے کے لئے) وہ دوڑ دھوپ کر رہے ہوں ان کا دامن آپکڑے، جبکہ وہ کہیں فرار بھی نہ کر سکیں -

۴۷- مگر انھیں تدریجی طور پر خوف انگیز تنبیہات کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لے کیونکہ پروردگار رؤف اور رحیم ہے -

تفسیر

مختلف گناہوں کی مختلف سزائیں:

بہت سے مباحث میں قرآن استدلالی مطالب، جذباتی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ سامعین کے دلوں کے لئے بہت زیادہ اثر انگیز ہو جاتے ہیں۔ زیر بحث آیات کی اسی روش کا ایک نمونہ ہیں۔ گذشتہ آیات میں معاد و نبوت کے مسئلے پر مشرکین سے ایک بحث تھی لیکن زیر بحث آیات میں جابر، مستکبر اور ہٹ دھرم گناہ گاروں کا تہدید کی گئی ہے اور انھیں مختلف طرح کے عذاب الہی سے ڈرایا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: نور حق کو بجھا دینے کے لئے طرح طرح کی منحوس سازشیں کرنے والے یہ لوگ کیا عذاب الہی سے مامون ہوں گئے ہیں حالانکہ ہر آن ممکن ہے خدا انھیں مختلف طرح کے عذاب میں دھنسا دے ﴿أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ﴾

کیا یہ بعید ہے کہ زمین پر ایک وحشت ناک زلزلہ آجائے، سطح زمین پھٹ جائے اور اس میں وہ تمام ممر ساز و سامان حیات کے ساتھ دھنس جائیں اور اقوام عالم کی تاریخ میں ایسا بارہا ہوا ہے۔

”مكروا السيئات“ گھٹیا مقاصد اور غلط اہداف تک پہنچنے کے لئے سازشیں کرنے اور منصوبے بنانے کے معنی میں جیسا کہ مشرکین نور قرآن کو خاموش کرنے، پیغمبر اسلام کو ختم کرنے اور مومنین کو اذیت دینے کے لئے سازشیں کرتے تھے۔

”مخسف“ خسف“ (بروزن ”وصف“) کے مادہ سے پنہاں ہونے اور مخفی ہونے کے معنی میں ہے اسی لئے چاند کی روشنی جب زمین کے سائے میں چھپ جائے تو اسے ”خسوف“ کہتے ہیں۔ نیز مخسوف“ اس کنویں کو کہتے ہیں جس میں پانی چھپ جائے اسی طرح انسان اور مکان زلزلے وغیرہ سے پیدا ہونے والے زمین کے شگاف میں چھپ جائیں تو اسے ”خسف“ کہتے ہیں۔

اس سے بعد قرآن مزید کہتا ہے: یا جب وہ غفلت میں ہوں اور عذاب الہی ایسی جگہ سے آہنچے جہاں سے انھیں توقع ہی نہ ہو۔ ﴿أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ﴾۔

یا جس وقت وہ زیادہ مال جمع کرنے کے لئے دور دھوپ کر رہے ہیں انھیں عذاب دامن گیر ہو جائے ﴿أَوْ يَأْخُذْهُمْ فِي ثَغْلِهِمْ﴾۔ جبکہ وہ کہیں بھاگ بھی نہ سکیں ﴿فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں ”معجزین“ ”اعجاز“ کے مادہ سے ناتواں اور عاجز کرنے کے معنی میں ہے۔ ایسے مواقع پر یہ عذاب کے چنگل سے فرار کرنے کے معنی میں ہے۔

یا یہ کہ عذاب الہی اچانک ان تک نہ پہونچے بلکہ تدریجی طور پر پے درپے تنبیہوں کے بعد انھیں اپنی گرفت میں لے لے ﴿أَوْ يَأْخُذْهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ﴾۔

آج ان کا ہمسایہ کسی سانحے کا شکار ہوا، کل ان کے کسی باغ کو نقصان پہنچا اگلے روز ان کے کچھ اموال ضائع ہو گئے خلاصہ یہ کہ یکے دیگرے انھیں تنبیہیں کی گئیں وہ بیدار ہو گئے تو کیا خوب ورنہ آخری اور اصلی انھیں اپنی گرفت میں لے لے گا۔ کسی گروہ کے لئے ایسے مواقع پر عذاب اور سزا تدریجی اس لئے ہے کہ ابھی اس میں احتمال ہدایت موجود ہے اور خدا کی رحمت اجازت نہیں دیتی کہ اس کے ساتھ دوسروں کا سا سلوک کیا جائے کیونکہ تمہارا پروردگار رؤف اور رحیم ہے ﴿فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرْؤُوفٌ رَحِيمٌ﴾۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں چار قسم کی سزاؤں کا تذکرہ ہے:

پہلی ”خسف“ اور زمین دھنس جانا۔

دوسری بے خبری میں ایسی جگہ سے عذاب آنا کہ جہاں سے توقع نہ ہو۔

تیسری اس وقت عذاب آپہنچا جب انسان مال و دولت جمع کرنے کی دھن میں مگن تھا۔ چوتھی تدریجی سزا اور تدریجی عذاب۔

مسلم ہے کہ چار قسم کی ان سزاؤں میں سے ہر ایک کسی خاص قسم کے گناہ سے مناسبت رکھتی ہے اگرچہ یہ سب گناہ گار ”الذین مکروا السيئات“ (ایسے لوگ جو گھٹیا سازشیں کرتے اور غلط منصوبے بناتے ہیں) کا مصداق ہیں۔ مختلف گناہوں پر یہ مختلف سزائیں اس لئے ہیں کہ خدا کے تمام کام حکمت کے مطابق اور استحقاق کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔

جہاں تک ہماری نظر ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے کوئی بات نہیں کہی لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ: پہلا عذاب سازشیوں کے اس گروہ کے لئے مخصوص ہے جو خطرناک، جابر اور مستکبر ہیں جیسے قارون۔ خدا ان لوگوں کو اقتدار اور طاقت کی ایسی بلندی سے نیچے کھینچتا ہے اور انھیں زمین کی گہرائیوں میں سے اس طرح سے دھنسا دیتا ہے کہ وہ سب کے لئے باعثِ عبرت بن جاتے ہیں۔ دوسرا عذاب ایسے سازشیوں کے لئے مخصوص ہے کہ جو عیش و نوش میں سرمست ہوں اور جو سرکش ہو او ہوس میں غرق ہوں عذابِ الہی اچانک ایسی جگہ سے انھیں آپکڑتا ہے کہ جہاں سے انھیں توقع تک نہیں ہوتی۔ تیسرا عذاب دنیا پرست زراںدوز لوگوں کے لئے مخصوص ہے ایسے لوگ کہ جو شب و روز اس کوشش میں ہیں کہ جیسے بھی ممکن ہو اور جس جرم اور ظلم سے ہو سکے اپنی دولت میں اضافہ کریں یہ لوگ مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوتے ہیں کہ عذابِ الہی انھیں آجکڑتا ہے۔^(۱)

چوتھا عذاب ایسے لوگوں کے لئے جو طغیان و سرکشی اور سازش و گناہ میں اس حد تک جا پہنچے ہیں کہ اب ان کے لوٹ آنے کی اور کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس مقام پر ”تخوف“ تنبیہ و تہدید کے ذریعے اللہ تعالیٰ انھیں بیدار کرتا ہے، وہ بیدار ہو جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو بہتر ورنہ انھیں دہن عذاب میں ڈال دیتا ہے۔ خدا کی رافت و رحمت کا ذکر ایک علت کے طور پر چوتھے گروہ سے مربوط ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابھی خدا سے اپنے تمام رشتے منقطع نہیں کئے اور اپنی واپسی کے تمام راستے ابھی تباہ نہیں کئے۔

۱۔ لغت عرب میں ”تقلب“ اگرچہ ہر قسم کی آمد و رفت کے معنی میں ہے لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے اور بعض اسلامی روایات میں بھی تاکید کی گئی ہے ایسے مواقع پر نجات اور کسبِ مال کے لئے آمد و رفت کے معنی میں ہے (غور کیجئے گا)۔

آیات ۳۸، ۳۹، ۵۰

۴۸۔ ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَتَّحُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ﴾۔

۴۹۔ ﴿وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ﴾۔

۵۰۔ ﴿يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾۔

ترجمہ

۴۸۔ کیا انھوں نے مخلوق خدا کو نہیں دیکھا کہ ان کے سائے کس طرح دائیں بائیں سے حرکت کرتے ہیں اور وہ خضوع و خشوع سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔

۴۹۔ (نہ صرف ان مخلوق کے سائے بلکہ) آسمانوں اور زمین میں چلنے والے تمام اور ملائکہ خدا کے حضور سجدہ کرتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی تکبر نہیں ہے۔

۵۰۔ وہ اپنے پروردگار (کی نافرمانی) سے ڈرتے ہیں کہ جو ان کا حاکم ہے اور جس چیز پر وہ مامور ہیں اسے انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

سائے تک اللہ کے حضور سجدہ زیر ہیں

ان آیات میں دوبارہ بحث توحید کی طرف لوٹ آئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: کیا وہ (سازشی مشرک) مخلوق خدا کو نہیں دیکھتے کہ جس طرح ان کے سائے ان کے دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں اور بڑے خشوع و خضوع سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَتَّحُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ﴾۔^(۱) ”یتفتحوا“ ”فتی“ کے مادہ سے لوٹ آنے اور رجوع کے معنی میں ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ عرب چیزوں کے صبح کے سائے کو ”ظل“ کہتے ہیں اور عصر کے سائے کو ”فیتی“ کہتے ہیں اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ غنائم و اموال کے ایک حصے کو ”فیتی“ کہا گیا ہے تو یہ اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ مال دنیا کا بہترین حصہ بھی وقت عصر کے سائے کی طرح ہے کہ جو جلدی سے زائل اور ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طرح توجہ کی جائے کہ زیر بحث آیت میں دائیں اور بائیں طرف کے سایوں کا ذکر ہے اور لفظ ”فیتی“ ان سب کے لئے استعمال ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لفظ ”فیتی“ وسیع معنی رکھتا ہے اور اس کے مفہوم میں ہر طرح کا سایہ شامل ہے۔

جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے، انسان جنوب کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوا تو وہ دیکھے گا کہ سورج اس کی بائیں طرف افق مشرق سے بلند ہو رہا ہے اور تمام چیزوں کا سایہ اس کی دائیں طرف پڑ رہا ہے۔ اسی دائیں طرف مغرب ہے یہ صورت اسی طرح سے رہتی ہے اور دائیں طرف کا سایہ رفتہ رفتہ کم ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وقت زوال آ پہنچتا ہے اس وقت سائے بائیں جانب کو ڈھلنے لگتے ہیں اور غروب آفتاب تک مشرق کی طرف سائے بڑھتے پھیلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔

اس مقام پر خدا تعالیٰ چیزوں کے سایوں کی دائیں اور بائیں طرح حرکت کا ذکر اپنی عظمت کی نشانی کے طور پر کرتا ہے اور ان کے اس ڈھلنے کو پروردگار کے حضور عالم خضوع و خشوع میں سجدہ ریز ہونا قرار دیتا ہے۔

۱۔ ”داغر“ اصل میں ”دخور“ کے مادے سے انکساری اور اپنے آپ کو چھوٹا ظاہر کرنے کے معنی میں ہے۔

ہمارے سایوں کا ہماری زندگی پر اثر

اس میں شک نہیں کہ ہمارے سائے ہماری زندگی میں ایک اہم کردار کھاتے ہیں شاید بہت سے لوگ اس سے غافل ہیں قرآن نے سایوں کا ذکر اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے کیا ہے۔

سائے اگرچہ عدم نور کے علاوہ کچھ نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے فوائد کے حامل ہیں مثلاً:

۱۔ سورج کی روشنی اور اس کی حیات بخش شعائیں موجودات کی زندگی اور نشوونما کا باعث ہیں جبکہ سائے کی روشنی کی شعاعوں کی تابش کو اعتدال میں رکھنے کے لئے ایک حیات آفرین کردار کھاتے ہیں سورج کی روشنی اگر ایک ہی طویل عرصے کے لئے چمکتی رہے تو ہر چیز پژمرده ہو جائے اور جل جائے ایسے میں سایے شدت و حدت کو اعتدال عطا کرتے ہیں وہ کم و بیش ہوتے رہتے ہیں کبھی اس جانب کو جھکتے ہیں اور کبھی اس جانب کو۔ گویا کبھی ادھر نوازش کرتے ہیں اور کبھی ادھر عنایت کرتے ہیں سایوں کا یہ طرز عمل چیزوں کی حفاظت اور بچاؤ میں نہایت تاثیر بخش ہے۔

۲۔ جو لوگ بیابانوں میں پھرتے رہتے ہیں یا جنہیں بیابانوں میں رہنا اور گزرنا پڑ جائے ان کے لئے انسانی نجات کے لئے سایوں کی غیر معمولی اثر انگیزی بالکل واضح ہے ایسے میں سایہ بھی وہ جو متحرک ہو اور ایک ہی جگہ ٹھہرنے جاتا ہو اور ہر طرف حرکت کرتا ہو انسانی خواہش اور ضرورت کے عین مطابق ہوتا ہے۔

۳۔ سائے ایک مفید پہلو یہ بھی ہے جو عام لوگوں کے خیال کے برخلاف ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ صرف روشنی ہی ہے حالانکہ نور ہمیشہ سایے یا نیم سایے کے ساتھ ہوا تو چیزیں دکھائی دیتی ہیں دوسرے لفظوں میں اگر کسی موجود کے ہر طرف ایک جیسی روشنی چمکے اور اس پر کسی قسم کا کوئی سایہ یا نیم سایہ نہ ہو تو روشنی میں مستغرق یہ چیز ہرگز نہیں دیکھی جاسکے گی۔

یعنی جس طرح مطلق تاریکی میں کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی اسی طرح مطلق نور میں بھی کوئی چیز نہیں دیکھی جاسکتی بلکہ نور و ظلمت باہم ہوں تو چیزوں کا دیکھا جانا ممکن ہوتا ہے۔ لہذا سایے بھی چیزیں نظر آنے اور ان کی شناخت میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ (غور کیجئے گا)۔

زیر نظر آیت میں ایک نکتہ اور قابل توجہ ہے آیت میں لفظ ”یمین“ (دائیں طرف) مفرد صورت میں آیا ہے جبکہ ”شمال“ جمع کی صورت میں ہے ”شائل“ شمال“ (بروزن ”مشعل“) کی جمع ہے اور شمال کا معنی ہے بائیں طرف۔

تعبیر کا فرق ہو سکتا ہے اس بناء پر ہو کہ جو لوگ جنوب کی طرف رخ کئے ہوں دم صبح سایہ ان کے دائیں طرف پڑتا ہے اور پھر وہ مسلسل بائیں طرف حرکت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وقتِ مغرب افقِ مشرق میں محو ہو جاتا ہے۔^(۲) بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ”یمین“ اگرچہ مفرد ہے لیکن بعض اوقات اس سے جمع مراد ہوتی ہے اور یہاں جمع مراد ہے^(۳)

گذشتہ آیت میں صرف سایوں کے سجدہ کرنے کی بات ایک وسیع مفہوم کے طور پر آئی تھی لیکن اگلی آیت میں تمام مادی و غیر مادی آسمانی و زمینی موجودات کے بارے میں فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین میں حرکت کرنے والی تمام موجودات اور اسی طرح فرشتے خدا کے حضور سجدہ کرتے ہیں ﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ﴾۔ اور وہ اس میں کسی قسم کا کوئی تکبر نہیں کرتے ﴿وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾۔ اور وہ خدا اور اس کے فرمان کے سامنے تسلیم محض ہیں۔

سجدہ در حقیقت انتہائی خشوع و خضوع اور پرستش کا نام وہ سجدہ جو سات اعضاء کے ساتھ ہم انجام دیتے ہیں سجدہ کے عمومی مفہوم کا ایک مصداق ہے ورنہ سجدہ کا مفہوم بس اسی میں منحصر نہیں ہے۔ عالمِ تکوین اور جہانِ آفرینش میں خدا کی تمام مخلوقات اور موجودات عام قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ اور ان قوانین سے انحراف نہیں کرتیں اور تمام قوانین خدا کی طرف سے ہیں پس در حقیقت تمام چیزیں بارگاہِ الہی میں سجدہ ریز ہیں۔ سب اس کی عظمت کی ترجمان ہیں سب اس کی بزرگی و بے نیازی کا مظہر ہیں مختصر یہ کہ سب اس کی مقدس ذات کی دلیل ہیں۔

”دابة“ حرکت کرنے والے موجود کے معنی میں ہے نیز اس سے زندگی کا معنی بھی لیا جاتا ہے یہ جو زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں چلنے والی سب موجودات خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ موجودات کراڑ ہی سے مخصوص ہیں بلکہ آسمانی کرات میں بھی زندہ چلنے والے موجودات وجود رکھتے ہیں۔

اگرچہ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ لفظ ”من دابة“ صرف ”ما فی الارض“ کے لئے ہے یعنی یہاں صرف زمین میں حرکت کرنے اور پھرنے والوں کے بارے میں بات کی گئی ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے خصوصاً جبکہ شوریٰ کی آیہ ۲۹ میں ہے۔ ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهَا مِنْ دَابَّةٍ﴾

خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین دونوں میں اس کی چلنے پھرنے والی مخلوق موجود ہے۔

یہ بجا ہے کہ تکوینی اعتبار سے سجدہ اور خشوع و خضوع متحرک موجودات میں منحصر نہیں ہے لیکن چونکہ متحرک موجودات خلقت و آفرینش کے بہت سے اسرار و عجائب کا مظہر ہیں لہذا یہاں انہی کی نشادہی کی گئی ہے۔

آیت کے مفہوم میں چونکہ عقل رکھنے والے انسان اور صاحب ایمان فرشتے بھی شامل ہیں نیز حیوانات اور دوسرے جانور بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں لہذا سجدہ یہاں عام اختیاری اور تشریعی معنی کا بھی حامل ہے اور تکوینی و اضطراری معنی کا بھی۔

رہا یہ سوال کہ زیر بحث آیت میں فرشتوں کا الگ سے ذکر کیوں ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ”دابة“ صرف ان چلنے پھرنے والے موجودات کو کہا جاتا ہے کہ جو جسم رکھتی ہیں جبکہ فرشتے چلتے پھرتے تو ہیں لیکن مادی جسم نہیں رکھتے لہذا وہ ”دابة“ کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم فرماتے ہیں:

اللہ کے کچھ فرشتے ایسے بھی ہیں جو جو ابتدائے آفرینش سے خدا کے حضور سجدہ میں ہیں اور روز قیامت تک اسی طرح سر بسجود رہیں گے اور جب وہ قیامت کے دن سجدے سے سر اٹھائیں گے تو کہیں گے: ﴿مَا عَبْدْنَاكَ حَقَّ عِبَادِكَ﴾ ہم سے حق عبادت ادا نہ ہو سکا۔

”﴿وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ﴾“ فرشتوں کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بارگاہ حق میں خضوع اور سجدہ کرتے ہیں اور اس میں ان کے اندر غرور و تکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

لہذا اس کے بعد فوراً ان کی دو صفات کا تذکرہ ہے اور یہ دونوں ان میں تکبر کے نہ ہونے کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے وہ اپنے پروردگار کی مخالفت سے ڈرتے ہیں کہ جو ان کا حاکم ہے ﴿يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ اور جس چیز پر وہ مامور ہیں اسے خوب انجام دیتے ہیں ﴿وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾۔

جیسا کہ سورہ تحریم کی آیہ ۶ میں فرشتوں کے ایک گروہ کے بارے میں ہے:

﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾

وہ فرمان الہی کی مخالفت نہیں کرتے اور انھیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔

اسی آیہ سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ غرور و تکبر کے نہ ہونے کی دو نشانیاں ہیں۔ ذمہ داریوں کا خوف اور احکام الہی کو بے چوں و چرا انجام دینا۔ ان میں سے ایک تکبر نہ کرنے کی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور دوسری قوانین

اور احکام کے بارے میں ان کے طرز عمل کی طرف۔ طرز عمل در حقیقت نفسیاتی کیفیت کا ردّ عمل ہے اور اس کا عملی مظاہرہ ہے۔

آیت میں ”﴿مَنْ فَوْقَهُمْ﴾“ یقیناً حسی اور مکانی طور پر ہونے کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ مقام کی برتری کی طرف اشارہ ہے کیونکہ خدا سب سے برتر اور بالا تر ہے۔

سورہ انعام کی آیہ ۶۱ میں ہے۔ ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾

وہ اپنے بندوں پر قاهر و غالب ہے۔

قرآن میں ہے کہ فرعون نے قدرت و طاقت کے اظہار کے لئے کہا: ﴿وَأَنَا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ﴾

میں ان پر قاهر و غالب ہوں (اعراف ۱۲۷)

ان تمام مواقع پر لفظ ”فوق“ مقام کی برتری کو بیان کرتا ہے۔

۲۔ تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۳۔ تفسیر ابو الفتوح رازی جلد ۷ ص ۱۱۰۔

آیات ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵

۵۱۔ ﴿وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِي﴾۔

۵۲۔ ﴿وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ﴾۔

۵۳۔ ﴿وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ﴾۔

۵۴۔ ﴿ثُمَّ إِذَا كُشِفَ الضُّرُّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْكُمْ بِرِّهِنَّ يُشْرِكُونَ﴾۔

۵۵۔ ﴿لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾۔

ترجمہ

۵۱۔ اور اللہ نے حکم دیا ہے کہ دو خداؤں کا انتخاب نہ کرو (تمہارا) معبود صرف ایک ہے۔ صرف مجھ سے (اور میرے عذاب سے) ڈرو۔

۵۲۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اسی کا ہے اور دین (اور دینی قانون) ہمیشہ اسی کا ہے تو کیا اس کے غیر سے ڈرتے ہو؟

۵۳۔ تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمتیں ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں اور پھر جب تمہیں پریشانیوں (اور تکالیف) پہنچتی ہیں تو اسی کو پکارتے ہو۔

۵۴۔ اور جب وہ رنج و تکلیف تم سے دور کر دیتا ہے تو تم میں سے بعض پنے پروردگار کے لئے شریک ماننے لگتے ہیں۔

۵۵۔ (چھوڑو انھیں) ہم نے انھیں جو نعمتیں دی ہیں ان کا کفران کر لیں اور چند دن (اس دنیاوی مال و متاع سے) فائدہ اٹھالیں۔ پس عنقریب جان لو گے (کہ تمہارا انجام کار تمہیں کہا کھینچ لے آیا ہے)۔

تفسیر

ایک دین اور ایک معبود

توحید اور خدا شناسی کی بحث کے بعد زیر نظر آیات میں نظامِ خلقت کے حوالے سے نفی شرک پر زور دیا گیا ہے تاکہ ان دونوں سے مجموعی طور پر حقیقت زیادہ آشکار ہو جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خدا نے حکم دیا ہے کہ دو خدا نہ مانو ﴿وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَهَيْنِ اثْنَيْنِ﴾۔ معبود ایک ہی ہے

﴿إِنَّمَا هُوَ إِلَهٌ وَاحِدٌ﴾۔

نظام خلقت کی وحدت اور اس پر حاکم قوانین کی وحدت، خود خالق و معبود کی وحدت کی دلیل ہے اب جبکہ ایسا ہی ہے تو ”صرف میرے عذاب سے ڈرو اور میرے فرمان کی مخالفت سے خود کھاؤ نہ کہ کسی غیر سے ڈرتے رہو ﴿فَإِيَّائِي﴾ فَارْهَبُونِي﴾۔

لفظ ”ایای“ کا مقدم ہونا حصر کی دلیل ہے جیسے ”ایک نعبہ“۔ مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف میری مخالفت اور میرے عذاب سے ڈرتے رہو۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں صرف دو معبودوں کی نفی کی گئی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عرب کے مشرکین نے بہت سے بت اور معبود بنا رکھتے تھے اور ان کے بت خانے مختلف قسم کے بتوں سے بھرے ہوئے تھے ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ذیل کے نکات میں سے کسی ایک یا سب کی طرف اشارہ ہو۔

۱۔ آیت کہتی ہے کہ دو معبودوں کی عبادت بھی غلط ہے چہ جائیکہ زیادہ معبودوں کی۔ دوسرے لفظوں میں کم از کم بات بیان کر دی گئی ہے تاکہ باقی ماندہ کی نفی زیادہ تاکید کے ساتھ ہو کیونکہ ایک سے زیادہ جس عدد کو بھی اختیار کریں دو سے بہتر حال گذرنا پڑے گا۔

۲۔ یہاں تمام طابل معبود ایک شمار کئے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ انھیں حق کے مقابلے میں قرار نہ دو اور دو معبود حق و باطل کی پرستش نہ کرو۔

۳۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں نے درحقیقت دو معبود اپنا رکھے تھے ایک وہ معبود جو خالق ہے اور جہان کو پیدا کرنے والا ہے یعنی اللہ اور دوسرا وہ معبود جسے وہ اپنے اور اللہ کے درمیان وسیلہ سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ بت خیر، برکت اور نعمت کا وسیلہ ہیں۔

۴۔ ہو سکتا ہے مندرجہ بالا آیت ”ثنوین“ (دو خداؤں کی پوجا کرنے والوں) کے عقیدے کے لئے نفی ہو۔ ثنوین دو خداؤں یعنی نیکی کا خدا اور بدی کا خدا کے قائل تھے۔ دو خداؤں کی پوجا کرنے والوں کی منطق اھرچہ ضعیف اور غلط تھی، لیکن عرب بت پرستوں کے پاس تو ایسی کمزور منطق بھی نہ تھی۔

عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے اس آیت کے ذیل میں بعض حکماء سے یہ لطیف جملہ نقل کیا ہے:-
خدا نے تجھے حکم دیا ہے کہ دو خداؤں کی عبادت نہ کر لیکن تو نے تو اپنے اتنے سارے معبود بنا رکھے ہیں۔

ایک بت تیرا سرکش نفس ہے، دوسرا بت تیری ہوا و ہوس ہے۔ تیرے مادی مقاصد اسپر مستزاد ہیں یہاں تک کہ تو انسانوں کو سجدہ کرتا ہے تو کس قسم کا توحید پرستار ہے۔

اس کے بعد تو آیات میں میں توحید عبادت کی دلیل چار حوالوں سے پیش کی گئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی ملکیت ہے ﴿وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾۔ تو کیا عالم ہستی کے مالک کو سجدہ کرنا چاہیئے، ہی ابتوں کو کہ جو کسی بھی قابلیت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف آسمان و زمین اس کی ملکیت ہیں بلکہ ہمیشہ سے دین اور تمام قوانین بھی اسی کی طرف سے ہیں ﴿وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا﴾۔

جب یہ ثابت ہے کہ عالم ہستی اسی کی طرف سے ہے اور وہی تکوینی قوانین ایجاد کرتا ہے تو مسلم ہے کہ تشریعی قوانین بھی اسی کے ذریعے معین ہونا چاہئیں لہذا طبعاً و فطرتاً اطاعت بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

”واصب“ دراصل ”وصوب“ کے مادہ سے ”دوام“ کے معنی میں لیا گیا ہے بعض نے اس کا معنی ”خالص“ کیا ہے (فطری بات ہے کہ جب تک کوئی چیز خالص نہ ہو دوام حاصل نہیں کر سکتی) ہو سکتا ہے آیت میں یہ لفظ دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہو یعنی ہمیشہ اور ہر زمانے میں دین خالص خدا کی طرف سے ہے جنہوں نے دین کو اطاعت کے مفہوم میں لیا گیا ہے، انہوں نے ”واصب“ کا معنی ”واجب“ لیا ہے یعنی صرف خدا کے حکم کی اطاعت ہونی چاہیئے۔

ایک روایت میں بھی ہے کہ ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے اس جملے کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو امام نے فرمایا واصب یعنی واجب۔ ۱

لیکن واضح ہے کہ یہ معانی ایک دوسرے سے لازم ملزوم ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کیا اس کے باوجود کے تمام قوانین دین اور طاعت خدا سے مخصوص ہیں اسکے غیر سے ڈرتے ہو ﴿أَفَعَيِّرَ اللَّهُ تَتَقُونَ﴾۔

کیا بت تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں؟

کیا بت تمہیں کوئی نعمت بخش سکتے ہیں؟

نہیں تو پھر ان کی مخالفت کا تمہیں خوف کیوں ہے اور ان کی عبادت کو تم کیوں ضروری سمجھتے ہو حالانکہ جتنی نعمتیں تمہارے پاس ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں۔ ﴿وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾۔

یہ درحقیقت معبود یگانہ یعنی اللہ کی عبادت ضروری ہونے کے بارے میں ہیں یہاں تیسری بات کی گئی ہے مراد یہ ہے کہ بتوں کی عبادت اگر شکر نعمت کی وجہ سے ہے تو انھوں نے تمہیں کوئی نعمت نہیں دی کہ جس کا شکر ضروری ہو بلکہ تمہارے وجود پر سرتاپا نعمت الہی محیط ہے اس کے باوجود تم نے اس کی بندگی کو چھوڑ رکھا ہے اور بتوں کے پیچھے لگے پھرتے ہو۔

علاوہ ازیں جب تمہیں پریشانیوں، مصیبتوں اور رنج و بلا کا سامنا ہوتا ہے تو انہیں دور کرنے کے لئے بارگاہ الہی میں آہ وزاری کرتے ہو اور اسے پکارتے ہو ﴿ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجَاوُونَ﴾۔

لہذا بتوں کی پرستش اگر دفع ضرر اور حل مشکلات کے لئے کرتے ہو تو غلط ہے کیونکہ خود تم نے بھی عملی طور پر ثابت کیا ہے کہ زندگی کے سنگین لمحات میں سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کی بارگاہ کی طرف جاتے ہو یہ دراصل مسئلہ توحید عبادت کے بارے میں چوتھی بات ہے۔

”تجرون“ دراصل ”جور“ (بروزن ”غبار“) کے مادہ سے ہے یہ چوپایوں اور وحشی جانوروں کی اس آواز کو کہتے ہیں جو تکلیف کے عالم میں ان سے بے اختیار نکلتی ہے بعد از آن یہ لفظ کنایے کے طور پر ہر اس آہ وزاری کے لئے استعمال ہونے لگا جو درد و غم کے موقع پر بے اختیار بلند ہو۔

اس لفظ کا یہاں پر خصوصیت کے انتخاب اس بات کو تقویت پہنچاتا ہے کہ جب مشکلات بہت زیادہ ہو جائیں جان عذاب میں اور درد و غم کے مارے بے اختیار فریاد بلند کرو تو کیا اس وقت اللہ کے علاوہ کسی کو پکارتے ہو؟ نہیں تو پھر آرام و سکون کے وقت چھوٹی چھوٹی مشکلات کے موقع پر بتوں کے دامن سے کیوں جا لگتے ہو۔

جی ہاں! ان مواقع پر خدا تمہاری فریاد سننا ہے اس کا جواب دیتا ہے اور تمہاری مشکلات کو برطرف کرتا ہے ”پھر جب اللہ تمہارے ضرر اور رنج و غم کو برطرف کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ اپنے پروردگار کے لئے شریک ماننے لگتے ہیں اور بتوں کی راہ لیتے ہیں ﴿ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْكُمْ بِرِّهِنَّ يُشْرِكُونَ﴾۔

قرآن درحقیقت اس باریک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ فطرت توحید تم سب میں موجود ہے عام حالات میں غفلت غرور، جہالت، تعصب اور خرافات کے پردے اسے دھانپ دیتے ہیں لیکن جب طوفان حوادث آجائیں اور

مصائب کی تند و تیز آندھیاں چل پڑیں تو یہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور نور فطرت آشکار ہو جاتا ہے اور چہرہ فطرت چمکنے لگتا ہے ایسی حالت میں تم خدا کو اپنے پورے وجود اور اخلاص کے ساتھ پکارتے ہو۔ اور خدا بھی رنج و بلا تم سے دور کر دیتا ہے، رنج و بلا کے پردے اس لئے ہٹ جاتے ہیں کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہوتے ہیں (توجہ رہے کہ آیت میں لفظ ”کشف الضر“ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے مشکلات کے پردے ہٹ جانا)۔

ادھر طوفان مصائب تھمتا ہے زندگی سا حل سکون سے ہم کنار ہوتی ہے اور ادھر وہی غفلت، غرور اور شرک و بت پرستی ظاہر ہونے لگتی ہے۔

منطقی دلائل اور توضیح حقیقت کے بعد، زیر بحث آخری آیت میں تہدید آمیز لہجے میں کہا گیا ہے: تمہیں جو نعمتیں دی گئی ہیں ان کا کفران کر لو اور چند روز اس دنیاوی مال و متاع سے بہرہ مند ہو لو لیکن عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے کام کا انجام کیا ہے ﴿لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾۔

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے کوئی انسان کسی منحرف شخص کو مختلف دلائل و براہین کے ساتھ وعظ و نصیحت کرے تو ممکن ہے اس پر کوئی اچر نہ ہو تو آخر میں ایسے تہدید آمیز جملے پر اپنی گفتگو تمام کر دے کہ: ج و باتیں میں تم سے کہہ چکا ہوں یہ سننے کے باوجود اگر تم اپنی اصلاح نہ کرو تو پر جو کچھ کر سکو کرتے رہو لیکن یاد رکھو تم جلد اس کے انجام سے دوچار ہو گے۔

اس بناء پر ”﴿لِيَكْفُرُوا﴾“ میں لام ”لام امر“ ہے وہ امر جو تہدید کے لئے آیا ہے جیسے ”تمتعوا“ بھی امر ہے تہدید کے لئے۔ فرق یہ ہے کہ ”لِيَكْفُرُوا“ غائب کا صیغہ ہے اور ”تمتعوا“ مخاطب کا۔ گویا پہلے انھیں گائب فرض کر کے قرآن کہتا ہے:

یہ جانیں اور تمام نعمتوں کا کفران کریں۔

اس تہدید سے وہ کچھ متوجہ ہوئے ہیں گویا وہ مخاطب کے طور پر سامنے آگئے ہیں۔ اب قرآن ان سے کہتا ہے۔ ان دنیاوی نعمتوں سے چند دن فائدہ اٹھا لو لیکن ایک روز دیکھو گے کہ تم کس عظیم اشتباہ اور کتنی بڑ غلطی کے مرتکب ہوئے ہو اور آخر کار تم کس انجام تک پہنچے ہو۔

در حقیقت یہ آیت سورہ ابراہیم کی آیہ ۳۰ کے مشابہ ہے:

﴿قُلْ تَمَتَّعُوا فَنَاصِرًا مِّنْكُمْ إِلَى النَّارِ﴾

کہہ دو چند روز اس دنیا کی لذتیں اٹھا لو آخر کا تمہارا انجام کارِ آتشِ جہنم ہے۔^(۱)
حوادث کے چنگل سے نجات مل گئی تو بعد ازاں انھوں نے راہِ توحید کو چھوڑ دیا اور شرک کی راہ اپنائی تاکہ نعمتوں کا
کفران و انکار کریں۔

۱۔ تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۷۳۔

۲۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے ”لیکفروا“ اس شرک و کفران کی گایت و نتیجہ ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے

آیات ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰

۵۶۔ ﴿وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ﴾۔

۵۷۔ ﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ﴾۔

۵۸۔ ﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ﴾۔

۵۹۔ ﴿يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾۔

۶۰۔ ﴿لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾۔

ترجمہ

۵۶۔ جو روزی ہم نے انھیں دی ہے وہ اسکا ایک حصہ بتوں کے نام کر دیتے ہیں جبکہ ان سے وہ کسی قسم کے سود و زیان کی خبر نہیں رکھتے۔ خدا کی قسم (قیامت کی عدالت میں) ان جھوٹی تہمتوں پر ان سے باز پرس ہوگی۔
۵۷۔ وہ (اپنے خیال میں) اس کے لئے بیٹیوں کے قاتل تھے وہ (اس سے) منزہ ہے (کہ اس کی اولاد ہو) لیکن اپنے لئے وہ کچھ چاہتے جو انھیں پسند ہوتا ہے۔

۵۸۔ حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بشارت دی جائے کہ تمہارے ہاں بیٹی ہوئی تو (غم اور پریشانی کے مارے) اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

۵۹۔ اس بری خبر پر اپنے قوم قبیلے سے منہ چھپائے پھرتا ہے اور اس فکر میں ہوتا ہے کہ ذلت اٹھا کر اسے زندہ رہنے دے یا تہہ خال چھپا دے یہ لوگ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں۔

۶۰۔ بری صفتیں انھیں ہی جیتی ہیں جو دار آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ خدا کے لئے تو اعلیٰ صفات ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

جہاں بیٹی کو باعثِ رسوائی سمجھاتا تھا

گذشتہ آیات میں شرک و بت پرستی کے خلاف مدلل بحث تھی۔ اب زیر نظر آیات میں مشرکین کی بعض بری بدعتوں اور گھٹیا عادتوں کو بیان کیا گیا ہے تاکہ شرک پرستی کے خلاف ایک اور دلیل قائم ہو جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان مشرکوں کو ہم نے جو روزی دی ہے اس کا ایک حصہ بتوں کی نذر کر دیتے ہیں جبکہ انہیں ان سے کسی نفع و نقصان کی خبر تک نہیں ﴿وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ﴾۔^(۱)

پہلی یہ کہ ”لا یعلمون“ کی ضمیر مشرکین کی طرف لوٹتی ہے یعنی مشرکین اپنے بتوں کے لئے ایک حصہ وقف کر دیتے ہیں جبکہ ان سے کسی خیر و شر کی انہیں خبر نہیں ہم نے یہی تفسیر انتخاب کی ہے۔

دوسری یہ کہ ”لا یعلمون“ کی ضمیر خود بتوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی وہ بت کہ جو علم، شعور اور عقل نہیں رکھتے، ان کے لئے ایک حصہ نذر کرتے تھے۔

لیکن اس دوسری صورت میں آیت کی تعبیرات میں ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ ”ما“ عام طور پر غیر ذوی العقول موجودات کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ ”یعلمون“ عموماً ذوی العقول کے لئے آتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے۔

جبکہ پہلی تفسیر کی بناء ”ما“ بتوں کی طرف اشارہ ہے اور ”لا یعلمون“ عبادت کرنے والوں کی طرف۔ جس حصے کا یہاں ذکر ہے اس میں کچھ اونٹ اور دیگر چوپائے شامل ہوتے ہیں اور کچھ حصہ وہ زرعی پیداوار کا وقف کرتے ہیں اس کی طرف سورہ انعام کی آیہ ۱۳۶ میں اشارہ ہوا ہے کہ مشرکین زمانہ جاہلیت میں اسے بتوں کے لئے مخصوص سمجھتے تھے اور ان کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ حالانکہ بتوں سے انہیں کوئی فائدہ پہنچتا تھا نہ ضرر کا خوف ہوتا تھا یہ نہایت احمقانہ کام تھا جو وہ انجام دیتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا: قسم بخدا! قیامت کی عدالت میں ان تہمتوں اور جھوٹوں کے بارے میں باز پرس ہوگی ﴿تَاللّٰهِ لَنَسْأَلَنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُونَ﴾۔

اس باز پرس پر ان کے لئے اعراف کے سوال کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ اس اعتراف سے بعد انہیں سزا ملے گی لہذا تمہارے اس برے منحوس عمل کا دنیاوی نقصان بھی ہے اور اخروی بھی۔

ان کی دوسری منحوس بدعت یہ تھی کہ وہ اس خدا کے لئے بیٹیوں کے قائل تھے کہ جو ہر قسم کی آلائش جسمانی سے پاک ہے وہ معتقد تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں ﴿وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ﴾۔ لیکن اپنی نوبت پر اپنے لئے وہ کچھ چاہتے جو انہیں پسند تھا ﴿وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ﴾۔

یعنی وہ کسی صورت تیار نہ تھی کہ انہی بیٹیوں کو اپنے لئے پسند کریں کہ جنہیں خدا کے لئے قرار دیتے تھے۔ بیٹی تو ان کی نظر میں سخت ننگ و عار، رسوائی اور بد بختی کی علامت تھی۔ اگلی آیت میں بات جاری رکھتے ہوئے ان کی تیسری بری عادت کی نشاندہی کی گئی ہے فرمایا گیا ہے: جب ان میں سے کسی کو بشارت دی جاتی ہے کہ خدا نے تجھے بیٹی دی ہے تو غم اور غصہ کے مارے ان کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے ﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا﴾ اور زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ﴿وَهُوَ كَظِيمٌ﴾۔^(۲) معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اپنے خیال باطل کے باعث وہ جس ننگ و عار میں مبتلا ہے اس میں اس کی حالت یہ ہے کہ ”یہ بری خبر سن کر وہ اپنی قوم قبیلے سے چھپتا چھپاتا ہے“ ﴿يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ﴾ بات اس پر بھی بس نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ اس فکر میں غوطہ زن رہتا ہے کہ کیا وہ اس ننگ و عار کو قبول کر لے اور اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھتے یا اسے زندہ درگور کر دے ﴿يَمْسِكُهُ عَلَيْهَا وَهُوَ كَظِيمٌ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾۔ آخر میں اس ظالمانہ شقاوت آمیز غیر انسانی فیصلے کی انتہائی صراحت سے مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جان لو کہ وہ بہت با اور قبیح فیصلہ کرتے ہیں ﴿الْأَسَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾۔

آخر میں ان تمام برائیوں اور قباحتوں کو آخرت پر ایمان نہ ہونے کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو دار آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہی کی ایسی بری صفات ہوتی ہیں ﴿لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ﴾۔ لیکن خدا کی صفات بہت عالی ہیں ﴿وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ﴾۔ اور وہ زبردست حکمت والا ہے ﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾۔ یہی سبب ہے کہ جو انسان اس عظیم و عزیز اور حکیم و دانا خدا کے نزدیک ہوتا ہے اس کے علم و قدرت و حکمت کی بلند صفات کی طاقت و شعاعیں اس پر پڑتی ہیں اور وہ خرافات اور گھٹیا بدعات سے الگ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان جس قدر اللہ سے دور ہوتا ہے اسی قدر جہالت، زبوں حالی اور ظلمتوں میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ اللہ اور اس کی عدالت کو بھول جانا تمام تر پستیوں، برائیوں اور بے راہ رویوں کا باعث ہے۔ ان دونوں بنیادی اصولوں کو یاد رکھا جائے تو انسان میں احساس مسئولیت زندہ رہتا ہے اور وہ جہالت و خرافات کے خلاف جنگ کے لئے توانائی کے حقیقی سرچشمہ سے مدد حاصل کرتا رہتا ہے۔

۱۔ ”لا یعلمون“ کے معنی اور اس کی ضمیر کے بارے میں مفسرین نے دو تفسیریں بیان کی ہیں:

۲۔ ”کظیم“ اس شخص کو کہتے ہیں جو غم و اندوہ کے عالم میں اپنے تئیں سنبھالا دے رہا ہو یعنی زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں کہتے تھے؟

قرآن کی متعدد آیات کے مطابق عرب کے مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے یا خدا کی طرف منسوب کیے بغیر انھیں عورتوں کی صنف میں سے سمجھتے تھے۔

سورہ زخرف کی آیہ ۱۹ میں ہے: ﴿وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ اِنَاثًا﴾۔

فرشتے کہ جو رحمن کے بندے ہیں انھیں وہ عورتیں قرار دیتے تھے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۰ میں ہے: ﴿اَفَاَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ الْمَلَائِكَةَ اِنَاثًا﴾

کیا تمہیں خدا نے بیٹے دئے ہیں اور خود فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا رکھی ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ خیال گزشتہ اقوام کی خرافات میں سے زمانہ جاہلیت کے عربوں تک پہنچا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتے چونکہ نظروں سے پوشیدہ ہیں اور پردے میں رہنے کی صفت عورتوں میں پائی جاتی ہے اس لئے وہ انھیں مؤنث سمجھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ بعض کے بقول عرب سورج کو مؤنث مجازی اور چاند کو مذکر مجازی کہتے تھے کیونکہ سورج کا قرص اپنے خیرہ کن نور میں چھپا ہوتا ہے اور اس کی طرف نگاہ کرنا آسان نہیں ہے جبکہ چاند کو ٹکیہ پوری طرح نمایاں ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے وجود کی لطافت اس توہم کا سبب بنی ہو کیونکہ عورت مرد کی نسبت زیادہ لطیف ہے

بہر حال یہ ایک پرانا، غلط اور فضول سا تصور ہے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس خیال باطل کی تلچھٹ ابھی تک بعض لوگوں کی فکر میں موجود ہے یہاں تک کہ مختلف زبانوں کے ادب میں بھی یہ بات دکھائی دیتی ہے کہ کسی خوبصورت عورت کی تعریف کے لئے اسے فرشتہ کہتے ہیں اسی طرح فرشتوں کی تصویر بناتے ہیں تو اسے عورتوں کی شکل دیتے ہیں حالانکہ اصولی طور پر فرشتہ مادی جسم ہی نہیں رکھتے کہ ان کے بارے میں مذکر و مؤنث کی بحث میں پڑا جائے۔

۲۔ بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کیا جاتا تھا؟

واقعاً یہ بات جبری وحشت انگیز ہے کہ انسان اپنے انسانی جذبات و احساسات کو مسل کمر اتنا آگے بڑھ جائے کہ دوسرے انسان کو قتل کر دے قتل بھی ایسا بدترین کہ پھر جس پر وہ فخر کرتا پھرے پھر قتل بھی اسے کمرے کہ جو اس کا

اپنا جگر گوشہ ہو کمزور اور ننھی سے جان ہو اور پھر قتل بھی اس طرح سے کہ اس زندہ بولتی جاگتی جان کو اپنے ہاتھوں میں دفن کر دے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ انسان ایسا وحشت ناک جرم کرنے لگے چاہے وہ نیم وحشی ہی کیوں نہ ہو۔
اس کام کی یقیناً کچھ معاشرتی، نفسیاتی اور اقتصادی بنیادیں تھیں۔
مورخین کہتے ہیں کہ اس فعل کی ابتداء زمانہ جاہلیت میں یوں ہوئی کہ:-

ایک مرتبہ دو گروہوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ فاتح گروہ نے مغلوب گروہ کی بیٹیوں اور عورتوں کو قید کر لیا۔ ایک مدت بعد جب ان کے مابین صلح ہو گئی تو انھوں شکست کھانے والے گروہ کے قیدی واپس کرنا چاہے لیکن بعض قیدی لڑکیوں نے فتح مند گروہ کے مردوں سے شادی کر لی تھی انھوں نے یہی پسند کیا کہ دشمنوں کے ہاں ہی وہ جائیں اور پلٹ کر اپنے قبیلے میں نہ جائیں ان لڑکیوں کے والدین پر یہ بات بہت گراں گزری۔ انھیں اس پر بہت شرمساری اٹھانا پڑی یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے قسم کھائی کہ اگر آئندہ ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ خود اسے اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیں گے تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح وحشت ناک ترین جرائم اور مظالم ناموس شرافت کی حفاظت اور خاندان کی عزت کے نام پر انجام دیئے گئے۔

بات یہاں جا پہنچی کہ اس قبیلے اور شرمناک بدعت کو بعض لوگ سراہنے لگے اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا زمانہ جاہلیت کی ایک رسم بن گئی جس کی قرآن نے شدت کے ساتھ مذمت کی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾

وہ لڑکی جسے زندہ درگور کر دیا گیا تھا جب اس سے پوچھا جائے گا کہ بتا تجھے کس جرم میں قتل کیا گیا۔ (تکویر ۸-۹)
لڑکے چونکہ تولید کنندہ ہوتے ہیں اور لڑکیاں مصرف کنندہ لہذا یہ احتمال بھی ہے کہ اس امر نے بھی اس ظلم میں مدد کی ہو لڑکے کو وہ لوگ بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔

لوٹ مار اور اونٹوں کی حفاظت وغیرہ میں اس سے کام لیتے تھے۔ جب کہ بیٹیاں ایسے کسی کام نہ آتی تھیں۔
دوسری طرف ان میں قبائلی جنگ کا ایک دائمی سلسلہ تھا۔ جھگڑے فساد ہوتے رہتے تھے ان میں سے بہت سے جنگجو مرد اور لڑکے کام آجاتے تھے لہذا لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں توازن اور تناسب باقی نہیں رہتا تھا۔

لڑکوں کا وجود اس قدر نادر اور عزیز ہو چکا تھا کہ ایک لڑکا بھی پیدا ہوتا تو خاندان کے لئے بڑے فخر کی بات ہوتی جبکہ لڑکی پیدا ہو جاتی تو پورا خاندان رنجیدہ ہو جاتا۔

بات یہاں تک جا پہنچی کہ بعض مفسرین نے بقول جب کسی عورت کے ہاں بچے کی پیدائش کا وقت قریب ہوتا تو اس کا شوہر کہیں غائب ہو جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکی پیدا ہو جائے اور وہ گھر پر موجود ہو اس کے بعد اگر اسے خبر ملتی کہ لڑکا پیدا ہوا ہے تو ناقابل تو صیف خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے گھر میں لٹ آتا لیکن اگر اسے پتہ چلتا کہ بیٹی ہوئی ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی^(۱)

بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی داستان بڑی ہی درناک ہے ان واقعات پر نظر پڑے تو حالت غیر ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی ایک واقعے کے بارے میں لکھا ہے: ایک شخص پیغمبر اکرم (ص) کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسلام قبول کر لیا، سچا اسلام، ایک روز وہ آنحضرت کی خدمت میں آیا اور سوال کیا: اگر میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

آپ نے فرمایا: خدا تواب و رحیم ہے۔

اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا گناہ بہت بڑا ہے۔

آپ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، تیرا گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو خدا کی بخشش سے تو بڑا نہیں؟

وہ کہنے لگا: اب جب آپ یہ کہتے ہیں تو میں عرض کروں۔ زمانہ جاہلیت میں میں ایک دور دراز کے سفر پر گیا ہوا تھا ان دنوں میری بیوی حاملہ تھی میں چال سال کے بعد گھر واپس لوٹا۔ میری بیوی نے میرا استقبال کیا میں گھر میں آیا تو مجھے ایک بچی نظر پڑی۔ میں نے پوچھا یہ کس کی لڑکی ہے؟ اس نے کہا: اس نے کہا ایک ہمسایہ کی لڑکی ہے۔ میں سوچا گھنٹہ بھر تک چلی جائے گی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ نہ گئی۔ مجھے علم نہ تھا کہ میری لڑکی ہے اور اس کی ماں حقیقت کو چھپا رہی ہے کہ کہیں یہ میرے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: آخر کار میں نے بیوی سے کہا: سچ بتاؤ یہ کس کی لڑکی ہے؟

بیوی نے جواب دیا: جب تم سفر پر چلے گئے تھے تو میں امید سے تھی بعد میں یہ بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ تمہاری ہی بیٹی ہے

اس شخص نے مزید کہا: میں وہ رات بڑی پریشانی کے عالم میں گزاری کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی میں بیدار ہو جاتا۔ صبح قریب تھی، میں بستر سے اٹھا، لڑکی کے بستر کے پاس گیا وہ اپنی ماں کے پاس سو رہی تھی۔ میں نے اسے بستر سے نکالا، اسے جگایا، اس سے کہا: میرے ساتھ نخلستان کی طرف چلو۔

اس نے بات جاری رکھی: وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی یہاں تک کہ ہم نخلستان میں پہنچ گئے میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا وہ میری مدد کر رہی تھی میرے ساتھ مل کر مٹی باہر پھینک رہی تھی گڑھا مکمل ہو گیا میں نے اسے بغل کے نیچے سے پکڑ کر اس گڑھے کے درمیان دے مارا۔

اتنا سننا تھا کہ رسول اللہ کی آنکھیں بھر آئیں

اس نے مزید بتایا: میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا وہ باہر نہ نکل سکے دائیں ہاتھ سے میں اس پر مٹی ڈالنے لگا اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی مظلومہ فرمایا دکی: وہ کہتی تھی ابو جان! آپ مجھ سے یہ سلوک کیوں کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: میں اس پر مٹی ڈال رہا تھا کہ کچھ مٹی میری داڑھی پر آپڑی بیٹی نے ہاتھ بڑھایا اور میرے چہرے سے مٹی صاف کی لیکن میں اسی قساوت اور سنگدلی سے اس کے منہ پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ میرے نالہ و فریاد کی آخری آواز تہہ خاک دم توڑ گئی۔

رسول اللہ (ص) نے داستان بڑے غم کے عالم میں سنی وہ بہت دکھی اور پریشان تھے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے جا رہے تھے

آپ نے فرمایا: اگر رحمت خدا کو اس کے غضب پر سبقت نہ ہوتی تو ضروری تھا کہ جتنا جلدی ہوتا وہ تجھ سے انتقام لیتا۔^(۲)

قیس بن عاصم بنی تمیم کے سرداروں میں سے تھا۔ ظہور رسالت مآب کے بعد وہ اسلام لے آیا تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ چاہتا تھا کہ جو سنگین بوجھ وہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے پھرتا ہے اسے کچھ ہلکا کرے۔ اس نے رسول اکرم کی خدمت میں عرض کیا: گزشتہ زمانے میں بعض باپ ایسے بھی تھے جنہوں نے جہالت کے باعث اپنی بے گناہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا تھا میری بھی بارہ بیٹیاں ہوئیں میں نے سب کے ساتھ یہ گھناؤنا سلوک کیا لیکن جب میرے ہاں تیرہویں بیٹی ہوئی تو میری بیوی نے اسے مخفی طور پر جنم دیا اس

نے یہ ظاہر کیا کیا کہ نو مود مردہ پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اسے چھپ چھپا کر اپنے قبیلوں والوں کے ہاں بھیج دیا اس وقت تو میں مطمئن ہو گیا لیکن بعد میں مجھے اس ماجرا کا علم ہو گیا میں نے اسے حاصل کیا اور اپنے ساتھ ایک جگہ لے گیا۔ اس نے بہت آہ و زاری کی، میری منٹیں کیں گریہ و بکا کی مگر میں نے پرواہ نہ کی اور اسے زندہ درگور کر دیا۔ رسول اللہ (ص) نے یہ واقعہ سنا تو بہت ناراحت ہوئے۔ آپ نے آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ آپ نے فرمایا:

من لا یرحم لا یرحم

جو کسی پر رحم نہیں کھاتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔
اس کے بعد آپ نے قیس کی طرف رخ کیا اور یوں گویا ہوئے:

تمہیں سخت دن درپیش ہے۔

قیس نے عرض کیا:

میں کیا عرض کروں اس گناہ کا بوجھ میرے کندھے سے ہلکا ہو جائے؟
پیغمبر اکرم نے فرمایا:

تو نے جتنی بیٹیوں کو قتل کیا ہے اتنے ہی غلام آزاد کر (شاید تیرے گناہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔) (۳)۔

نیز مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ بن ناجیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ حریت فکر رکھنے والا ایک شریف انسان تھا۔ زمانہ جاہلیت میں وہ لوگوں کی بہت سے بری عادات کے خلاف جدوجہد کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے ۳۶۰ لڑکیاں ان کے والدوں سے خرید کر انھیں موت سے نجات بخشی۔ ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک باپ اپنی نو مولود بیٹی کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ اس بچی کی نجات کے لئے اس نے اپنے سواری کا گھوڑا تک اور دو اونٹ اس کے باپ کو دئے اور اس بچی کو نجات دلائی۔

پیغمبر اکرم نے فرمایا:

تو نے بہت ہی بڑا کام انجام دیا ہے اور تیری جزا اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

فرزدق نے اپنے دادا کے اس کام پر فخر کرتے ہوئے کہا: ومنا الذی منع الوائدات فاحیا الوئید فلم توائد
اور وہ شخص ہمارے خاندان میں سے تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے خلاف قیام کیا۔ اس نے لڑکیوں کو لیا اور انھیں زندگی عطا کی اور انھیں تہہ خاک دفن نہ ہونے دیا۔ (۴)

ابھی ہم اس مسئلہ پر گفتگو تفصیلی کریں گے اور دیکھیں گے اسلام نے کس طرح ان تمام قباحتوں، مظالم اور جرائم کو ختم کر دیا اور عورت کو ایک ایسا مقام بخشا کہ تاریخ میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

۱۔ تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۰ ص ۵۵۔

۲۔ القرآن یو اکب الدھر جلد ۲ ص ۲۱۴۔

۳۔ جاہلیت و اسلام صفحہ ۶۳۲۔

۴۔ قاموس الرجال جلد ۵ ص ۱۲۵۔

۳۔ عورت کے مقام کے احیاء میں اسلام کا کردار

عورت کی تحقیر و تذلیل اور اس کی حیثیت کی تباہی زمانہ جاہلیت کے عربوں ہی میں نہ تھی بلکہ اس زمانے کی سب سے زیادہ متمدن قوموں نکا بھی یہی حال تھا وہ عورت کو ایک حقیر وجود سمجھتے تھے اس سے زیادہ ایک متاع بازار کا سلوک کرتے تھے نہ کہ انسان کا سا۔ البتہ دور جاہلیت کے عربوں کے ہاں عورت کی تذلیل زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ وحشت ناک تھی یہاں تک کہ وہ نسب کو صرف مرد سے مربوط سمجھتے تھے اور عورت کو تو قبل پیدائش بچے کی پرورش کے لئے ایک ظرف شمار کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اس شعر سے بھی ان کا یہ نظریہ ظاہر ہوتا ہے:-

بنو نا بنو ابناؤنا و بناتنا بنوہن ابناء الرجال الاباعد

ہمارے بیٹے تو صرف ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہیں۔ باقی رہے ہماری بیٹیوں کے بیٹے تو وہ تو اور مردوں کے بیٹے ہیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ عورت کے لئے حق میراث کے قطعاً قائل نہ تھے اور تعداد ازدواج کے لئے بھی کسی حد و حدود کے قائل نہ تھے وہ شادی اس آسانی سے کر لیتے جیسے پانی پیتے ہیں اور اسی آسانی سے طلاق دیدیتے تھے۔

اسلام نے ظہور کیا تو اس نے اس فضول اور بے ہودہ روش کے خلاف مختلف حوالوں اور طریقوں سے سخت جنگ کی۔ اسلام نے خاص طور پر بیٹی کی پیدائش کو ننگ و عار سمجھنے کے خلاف بہت جنگ کی ہے احادیث اسلامی میں کسی خاندان میں بیٹی کسی پیدائش کو رحمت الہی کی آبشار جاری ہو جانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ رسول اسلام خود اپنی بیٹی بانوئے اسلام فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا اس قدر احترام کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا آپ اپنے اس قدر مقام و منزلت کے ہوتے ہوئے اپنی بیٹی کے ہاتھ چومتے، کسی سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے اپنی بیٹی فاطمہ (علیہ السلام) سے ملنے جاتے اور اس کے برعکس جب کسی سفر کے لئے روانہ ہوتے تو آخری گھر جس میں خدا حافظ کہنے کے لئے آتے وہ فاطمہ (علیہ السلام) کا ہی گھر ہوتا۔

ایک حدیث میں ہے: جب رسول اللہ کو خبر دی گئی کہ خدا نے انھیں بیٹی عطا فرمائی ہے تو اچانک آپ نے اپنے اصحاب کے چہروں کی طرف دیکھا ان کے چہروں کی طرف دیکھا ان کے چہروں پر افسوس کے آثار نمایاں تھے (گویا زمانہ جاہلیت کی رسموں کے کچھ آثار ابھی ان کے دماغوں میں باقی تھے)۔

رسول اللہ نے فوراً فرمایا:-

مالکم؟

ریحانة اشمہا، و رزقہا علی اللہ عزوجل

تمہیں کیا ہوا؟ اللہ نے مجھے ایک مہکتا ہوا پھول دیا ہے جس کی خوشبو سونگھوں گا (رہی بات اس کی روزی می تو) اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے۔^(۱)

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم (ص) سے مروی ہے، آپ نے فرمایا:

نعم الولد البنات، ملطفات، مہزات، موانسات مفلیات۔

بیٹی کتنی اچھی ہوتی ہے، وہ محبت کرنے والی، مددگار۔ مونس و غمخوار اور پاک و پاک کندہ ہوتی ہے۔^(۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

من دخل السوق فاشترى تحفة فحملها الى عياله كان كهامل الصدقة الى قوم محاييج وليبدء بالاناث قبل

الذكور، فانه من فسرح ابنته فكأنما اعتق رقبة من ولد اسمعيل۔

جو شخص بازار جائے اور اپنے گھر والوں کے لئے کوئی تحفہ خریدے وہ اس شخص کی طرح ہے جو حاجتمندوں کی مدد کرے (اسے اس شخص کی سی جزا ملے گی) اور جب گھر آکر اسے بانٹنے لگے تو سب سے پہلے بیٹیوں کو دے کیونکہ جو شخص اپنی بیٹی کو خوش کرے ایسے ہے گویا اس نے اولاد اسماعیل میں سے کسی غلام کو آزاد کیا ہے۔^(۳)

در حقیقت عورت کو اسلام نے جو احترام عطا کیا ہے اسی کے سبب اسے معاشرے میں آزادی نصیب ہوئی اور اس کے سبب عورتوں کی غلامی کا دور ختم ہوا۔

اس سلسلے میں اور بھی بہت سی کہنے کی باتیں ہیں جو متعلقہ آیات کی تفسیر میں بیان کی جائیں گی لیکن اس حقیقت کو یہاں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اب بھی اسلامی معاشروں میں دور جاہلیت کے آثار باقی ہیں۔ اب بھی ایسے گھرانوں نے کمی نہیں جو لڑکے کی پیدائش پر تو خوش ہوتے ہیں لیکن لڑکی کی پیدائش پر افسردہ اور پریشان ہو جاتے ہیں یا کم از کم لڑکے کی پیدائش کو لڑکی کی پیدائش پر ترجیح دیتے ہیں۔

البتہ ہو سکتا ہے معاشرے میں عورتوں کی کیفیت کے حوالے سے خاص قسم کے اقتصادی اور معاشرتی حالات ایسی غلط عادات و رسوم کا باعث ہوں لیکن کچھ بھی ہو تمام سچے مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے طرز فکر کو ختم کرنے کی جدوجہد کریں اور اس فکر کی معاشرتی اور اقتصادی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکیں کیونکہ اسلام یہ بات پسند نہیں کرتا کہ چودہ صدیوں بعد اس کے پیروکار دور جاہلیت کے افکار و نظریات کی طرف پلٹ جائیں۔ اور ایک نئے دور جاہلیت کا آغاز ہو جائے۔

حالت تو یہ ہے کہ مغرب کے معاشرے میں بھی جہاں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ عورت کے لئے اعلیٰ مقام کے قائل ہیں عملی طور پر اسے اس قدر ذلیل کیا گیا ہے کہ اس کی حیثیت ایک بے قیمت گڑیا، آتشِ شہوت کو خاموش کرے والے وجود یا مال اسباب کے لئے ایک اشتہار سے زیادہ نہیں رہی۔^(۴)

۳۔ یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اتفاق سے یہ سطور ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۴۰۱ھ تکو لکھی جا رہی ہے ہیں کہ جو بانو نے اسلام حضرت فاطمہ علیہا کا روز ولادت ہے اور اسی دن کو اسلامی جمہوریہ ایران کی طرف سے ”یومِ خواتین“ قرار دیا گیا ہے

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۰۲۔

۲۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۵ صفحہ ۱۰۰۔

۳۔ مکارم الاخلاق ص ۵۴۔

آیات ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴

۶۱۔ ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾۔

۶۲۔ ﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنَىٰ لَا جَرَمَ أَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَأَنَّهُمْ مُّفْرَطُونَ﴾۔

۶۳۔ ﴿تَاللَّهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِنْ قَبْلِكَ فَرَزَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانَ أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمْ الْيَوْمَ وَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾۔

۶۴۔ ﴿وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾۔

ترجمہ

۶۱۔ اور اگر اسے لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے سزا دے تو مشیتِ زمین پر چلنے والا کوئی باقی نہ رہے لیکن وہ ایک عرصے تک انھیں مؤخر کر دیتا ہے البتہ جب ان کی اجل آپہنچی ہے تو پھر وہ نہ ساعت بھرتا خیر کرتے ہیں اور نہ گھڑی بر تقدیم کرتے ہیں۔

۶۲۔ وہ خدا کے لئے وہ کچھ قرار دیتے ہیں کہ جسے خود ناپسند کرتے ہیں (یعنی بیٹیاں) اس کے باوجود جھوٹ بولتے ہیں کہ ان کا انجام نیک ہے، ناچار ان کے لئے آگ ہے اور وہ (آتشِ جہنم کی طرف) پیش قدمی کرنے والے ہیں۔

۶۳۔ بخدا تجھ سے پہلے ہم نے امتوں کی طرف نبی بھیجے لیکن شیطان نے (ان امتوں کو) ان کے اعمال انھیں سجا بنا کر دکھائے اور آج وہی ان کا ولی ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

۶۴۔ ہم نے قرآن تجھ پر نازل نہیں کیا مگر اس لئے کہ جس امر میں وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان سے بیان کر دے اور یہ ان کے لئے ہدایت و رحمت ہے جو لوگ ایمان رکھتے ہیں۔

تفسیر

خدا فوراً سزا کیوں نہیں دیتا؟

گذشتہ آیات میں مشرکینِ عرب کے وحشت ناک جرائم اور قبیح بدعتوں کا ذکر ہے ان میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس موقع پر بعض ذہنوں میں یہ سوال ابھرے کہ ایسے ظالمانہ اقدامات پر خدا تعالیٰ فوراً عذاب کیوں نہیں کرتا؟

زیر نظر آیت اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے: اگر خدا لوگوں کو ان کے ظلم و گناہ پر سزا دے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا باقی نہ رہے ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ﴾۔^(۱)

”دابة“ ہر قسم کے زندہ اور متحرک موجود کو کہتے ہیں یہاں ممکن ہے ”علیٰ ظلمہم“ کے قرینوں سے انسانوں کے لئے کنایہ ہو یعنی اگر خدا انسانوں کا ان ظلم کی وجہ سے مواخذہ کرے تو کوئی انسان سطح زمین پر باقی نہ رہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین پر تمام حرکت کرنے والے اور چلنے پھرنے والے ہوں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ زمین پر چلنے والے جانور معمولاً انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾

اللہ وہ ہے کہ جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔ (بقرہ ۲۹)

لہذا جب انسان ختم ہو جائیں تو دوسرے چلنے پھرنے والے جانداروں کے وجود کا فلسفہ بھی ختم ہو جائے گا، اس لئے ان کی نسل بھی منقطع ہو جائے گی۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیت کے مفہوم کی عمومیت اور وسعت کو دیکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ زمین پر بسنے والے تمام انسان ظالم ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی ظلم کا مرتکب ہوا ہے اور اگر فوری سزا نافذ ہو تو کسی کا دامن نہیں بچے گا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نہ صرف انبیاء و مرسلین اس زمین پر موجود رہے ہیں کہ جو معصوم ہیں اور اس ظلم کے مصداق نہیں ہیں بلکہ ہر زمانے میں ایسے نیک پاک اور سچے مجاہد رہے ہیں کہ جن کی نیکیاں یقیناً ان کی چھوٹی برائیوں سے زیادہ ہوتی ہیں اور جو ہر گز ایسی سزا کے مستحق نہیں ہوتے کہ جو نابود کر دے۔

اس سوال کو جواب یوں دیا جاسکتا ہے

آیت کا حکم نوعی ہے نہ عمومی کہ جو سب کے لئے ہو۔

اسے بیانات کی مثالیں عربی ادب میں اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں یہ مشہور شعر ہم نے اکثر سنا ہے:

گر حکم شود مست گیرند در شہر ہر آنچہ ہست گیرند

اگر حکم ہو کہ جو بھی نشے میں ہو اسے پکڑ لیا جائے تو شہر میں کوئی بھی گرفتاری سے نہ بچ سکے۔

اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے:

گفت باید حد زند ہشیار، مرد مست را گفت ہشیاری بیار، اینجا کسی ہشیار نیست

اس نے کہا ہے جو ہوش میں ہے وہ اس مست شخص پر حد جاری کرے تو جواب ملا کہ پہلے کسی باہوش کو لے آؤ کیونکہ یہاں تو کوئی ہوش میں نہیں ہے۔

اس استثناء کی شاہد سورہ فاطر کی آیہ ۳۲ ہے، اس میں ارشاد الہی ہے:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ إِذْنُ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾۔

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جہیں چن لیا انھیں کتاب کا وارث بنایا اور انسانوں میں تین طرح کے لوگ ہیں ایک وہ جنہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، دوسرے وہ جو درمیانے سے ہیں اور تیسرے وہ کہ جو اذن الہی سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اور یہ بڑے فضل کی بات ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ زیر بحث آیت میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ سورہ فاطر کی مذکورہ آیت کے بیان کردہ پہلے گمروہ کے لئے ہے اور ایسے لوگوں کی چونکہ معاشروں میں کثرت ہوتی ہے لہذا آیت کے انداز میں عمومیت کوئی قابل تعجب بات نہیں ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت انبیاء کی عصمت کی نفی پر ہرگز دلالت نہیں کرتی اور جنہوں نے یہ خیال کیا ہے انھوں نے قرآن کی دیگر آیات اور کلام میں موجود قرائن کی طرف توجہ نہیں کی۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: خدا سب ظالموں کو مہلت دیتا ہے اور اجل مسمیٰ (ایک معین زمانے) تک ان کی موت کو مؤخر کر دیتا ہے ﴿وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾۔

لیکن جب ان کی اجل پہنچتی ہے تو ہر گھڑی بھر کی تاخیر ہو ہے نہ تقدیم ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾۔

بلکہ ٹھیک اسی لمحے موٹ انھیں دامن گیر ہو جاتی ہے اور لحظہ کے لئے بھی آگے پیچھے نہیں ہوتی۔

اجل مسمیٰ کیا ہے؟

”اجل مسمیٰ“ کے مفہوم کے بارے میں میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں البتہ قرآن حکیم کی دیگر آیات کہ جن میں سورہ انعام کی آیت ۲/ اور سورہ اعراف کی آیہ ۳۴/ شامل ہیں، پر نظر رکھی جائے تو اس سے مراد موت کا آنا ہی ہے یعنی خدا بدنوں کو ان کی عمر کے آخر تک اتمام حجت کے لئے مہلت دیتا ہے کہ شاید ظالم اپنی اصلاح کی فکر کریں اور اپنے طرز

عمل پر تجدید نظر کریں اور خدا، حق اور عدالت کی طرف پلٹ آئیں، جب مہلت یہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو موت کا حکم جاری ہو جاتا ہے اور موت کے اسی لمحے سے سزا اور عذاب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

”اجل مسمیٰ“ کلمے بارے میں مزید وضاحت کلمے لئے تفسیر نمونہ کی جلد ۵ ص ۱۳۳ (اردو ترجمہ) اور جلد ۶ ص ۱۴۲ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

اگلی آیت میں قرآن ایک مرتبہ بھی زمانہ جاہلیت کے عرب کی بری رسموں کی مذمت کرتا ہے قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ وہ خود بیٹیوں سے نفرت کرتے تھے جبکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ایک طرف تو وہ خود اپنے لئے بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن دوسری طرف خدا کے لئے قاتل ہیں ﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ﴾۔

یہ عجیب و غریب تناقض اور تضاد ہے سورہ نجم کی آیہ ۲۲ میں ہے:

یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ تقسیم ہے۔

فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ بیٹیاں اچھی چیز ہیں تو پھر تم کیوں بیٹیاں پیدا ہونے پر پریشان ہو جاتے ہو اور اگر یہ بری چیز ہے تو پھر خدا کے لئے اس کے قاتل کیوں ہوتے ہو؟

اس کے باوجود ان کا غلط دعویٰ ہے کہ ان کا انجام نیک ہے اور جزائے خیر انہی کے لئے ہے ﴿وَتَصِفُ أَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ أَنَّ لَهُمُ الْحُسْنَى﴾۔

کس عمل کی وجہ سے وہ ایسی جزا کی توقع رکھتے ہیں کیا معصوم، بے گناہ بے چاری بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے پر یا پروردگار کی ساحت مقدس پر افتراء باندھنے پر؟

لفظ ”حسنی“ ”احسن“ کا مونث ہے اس کا معنی نہایت عمدہ، بہت اچھا۔ یہاں بہترین جزایا بہترین انجام کے معنی میں آیا ہے جس کی یہ مغرور اور گمراہ قوم اپنے تمام جرائم کے باوجود قاتل تھی۔ اس صورت میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب تو معاد اور قیامت پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود اس قسم کی باتیں کیوں کرتے تھے۔

اس سلسلے میں توجہ رہے کہ وہ سب سے سب مطلقاً معاد کے منکر نہیں تھے بلکہ معاد جسمانی کا انکار کرتے تھے انہیں اس بات سے انکار تھا کہ انسان کو پھر سے مادی زندگی دی جائے گی وہ اس بات پر تعجب کرتے تھے علاوہ ازیں ممکن ہے یہ تعبیر ”قضیہ شرطیہ“ کے طور پر ہو یعنی وہ کہتے تھے: یا بالفرض دوسرا جہاں ہو تو ہمیں وہاں بہترین جزا ملے گی۔

بہت سے ظالم و جابر، منحرف اور ہٹ دھرم افراد کی یہی طرز فکر ہے کہ خدا سے دور ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو خدا سے بہت نزدیک سمجھتے ہیں اور انتہائی مضحکہ خیز دعوے کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ”حسنی“ سے ”نعمت حسنی“ یعنی بیٹے مراد ہیں کیونکہ وہ بیٹیوں کو برا اور منحوس سمجھتے تھے لیکن بیٹوں کو اچھا اور اعلیٰ نعمت جانتے تھے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اسی لئے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: ناچار ان کے لئے جہنم کی آگ ہے ﴿لَا جَرَمَ أَنَّ لَهُمُ النَّارَ﴾۔ یعنی نہ صرف یہ کہ ان کی عاقبت بخیر نہیں بلکہ ان کا انجام کار جہنم کی آگ کے علاوہ کچھ نہیں اور وہ اسی آگ کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ ﴿وَأَنَّهُمْ مُّفْرَطُونَ﴾۔

”مفرط“ ”فرط“ (بروزن ”فقط“) کے مادہ سے آگے بڑھنے کے معنی میں ہے۔

ہو سکتا ہے زمانہ جاہلیت کے عربوں کی داستان سن کر بعض یہ سوال کریں کہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے جگر گوشہ کو اس بربریت کے ساتھ مٹی میں زندہ گاڑ دے۔ اس سلسلے میں اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: بخدا ہم نے تجھ سے پہلے امتوں کی طرف نبی بھیجے لیکن شیطان نے ان امتوں کے اعمال انھیں بہت بنا سنوار کر پیش کئے تھے ﴿ثُمَّ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ﴾۔

جی ہاں شیطان اپنے وسوسوں میں تنا ماہر ہے کہ قبیح ترین اور بدترین جرائم کو بھی بعض اوقات انسان کے سامنے بہت خوبصورت بنا کر پیش کر دیتا ہے اور اسے باعثِ فخر سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ دورِ جاہلیت کے عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کو پانے لئے سندا افتخار جانتے تھے وہ اسے غیرت مندی کا مظاہرہ قرار دیتے اور قبیلے کی عزت و آبرو کی حفاظت کے نام پر اس فعل کی تعریف کرتے۔

بیٹی کو زندہ گاڑ دینے والا باپ کہتا:

میں نے اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے زیرِ خاک دفن کر دیا ہے تاکہ کل کو وہ کسی جنگ میں دشمن کے ہاتھ نہ لگے۔ ظاہر ہے جہاں ایسے شرمناک ترین اعمال شیطانی مزین کے بعد ایسے پر فریب ہو جائیں تو باقی کاموں کی حالت کیا ہو گی۔

آج بھی شیطانی مزین کے ایسے نمونے بہت سے افراد کے اعمال میں نظر آتے ہیں۔ آج بھی چوری، غارت گری، تجاوز اور جرم کو مختلف پر فریب نام دئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ دورِ حاضر کے مشرکین بھی ان گزشتہ امتوں کے انحرافی طرزِ عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

شیطان نے جن کے اعمال کو خوبصورت بنا کر پیش کیا تھا آج بھی شیطان ان کا ولی، راہنما اور سرپرست ہے ﴿فَهُوَ وَلِيُّهُمْ﴾۔ اور یہ اسی کی راہنمائی میں قدم اٹھاتے ہیں۔ اسی بناء پر دردناک عذابِ الہی ان کے انتظار میں ہے ﴿الْيَوْمَ وَهُمْ عَذَابُ أَلِيمٍ﴾۔

”﴿فَهُوَ وَلِيُّهُمْ الْيَوْمَ﴾“ (آج شیطان ان کا ولی و سرپرست ہے) اس جملے کی مفسرین مختلف پیرائے میں تفسیر کی ہے۔ شاید ان میں سے زیادہ واضح وہی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں۔ یعنی یہ جملہ دورِ جاہلیت کے مشرکین عرب کی کیفیت واضح کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ انھوں نے بھی گزشتہ منخرف امتوں کے طرزِ عمل کی پیروی کی اور شیطان ان کا سرپرست ہے جیسے وہ گزشتہ گمراہوں کا سرپرست تھا۔

۱۔ لیکن اس تفسیر کا لازمی مطلب یہ ہے کہ ”اعمالہم“ اور ”ولیہم“ کی ضمیر میں معنی کے لحاظ سے فرق ہو پہلی ضمیر گزشتہ امتوں کے لئے ہو اور دوسری رسول اللہ کے زمانے کے مشرکین کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے یہ جملہ مقدار مانا جاسکتا ہے۔ هُوَ لَاءِ يَتَّبِعُونَ الْاِمَمَ الْمَاضِيَةَ (غور کیجئے گا)

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد کیہ ہو کہ ابھی تک گزشتہ منخرف امتوں کے کچھ لوگ موجود ہیں اور وہ اپنے انحرافی طریقے کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور شیطان آج بھی پہلے کی طرح ان کا سرپرست ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں بعثتِ انبیاء کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ تاکہ واضح ہو جائے کہ اگر قومیں اور ملتیں اپنی خود غرضیوں اور غلط طور طریقوں کو چھوڑ کر رہبریِ انبیاء سے وابستہ ہو جائیں تو ایسے خرافات، اختلافات اور عملی تضادات ختم ہو جائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے قرآن تجھ پر صرف اس لئے نازل کیا ہے کہ وہ جس امر میں اختلاف رکھتے ہیں تو اسے واضح کر دے ﴿وَمَا أُنْزِلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾۔

اور یہ قرآن ان لوگوں کے لئے باعثِ ہدایت و رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾۔

شیطانی وسوسے ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے نفسِ امارہ اور شیطان صفت لوگوں کے پہنائے ہوئے پرفریب پر دے حقائق کے چہرے سے ہٹا دیتا ہے۔ پس پردہ خرافات و جرائم کو واضح کر دیتا ہے خود غرضیوں نے جو اختلافات

پیدا کر دئے ہوتے ہیں انہیں ختم کر دیتا ہے۔ بربریتوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ہر طرف ہدایت و رحمت کا نور پھیلا دیتا ہے۔

۱۔ ”علیھا“ کی ضمیر ”ارض“ کی طرف لوٹتی ہے۔ اگرچہ پہلے اس کا ذکر نہیں آیا اور یہ مطلب کی وضاحت کے لئے ہے اس کی نظیر عربی ادب میں اور دیگر زبانوں کے ادب میں بہت ملتی ہے۔

آیات ۶۵، ۶۶، ۶۷

۶۵۔ ﴿وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ﴾۔

۶۶۔ ﴿وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ﴾۔

۶۷۔ ﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾۔

ترجمہ

۶۵۔ اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا اور جب زمین مردہ ہو چکی تھی اسے پھر سے حیات بخشی اس میں اس قوم کے لئے واضح نشانی ہے جو سننے والے کان رکھتی ہے۔

۶۶۔ اور چوپایوں کے وجود میں تمہارے لئے عبرت (کے درس) ہیں۔ ان کے شکم کے اندر سے ہم تمہارے پینے کے لئے ہضم شدہ غذا اور خون میں سے خالص اور پسندیدہ دودھ فراہم کرتے ہیں۔

۶۷۔ کھجور اور انگور کے درختوں کے میوؤں سے شراب (ناپاک) اور اچھا رزق حاصل کرتے ہو۔ اس میں عقل و دانائی سے کام لینے والی قوم کے لئے روشن نشانی ہے۔

پانی، پھل اور حیوانات

قرآن ایک مرتبہ پھر پروردگار کی گونا گوں نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے یہ دراصل توحید اور خدا شناسی کے لئے ایک تاکید بھی ہے اور ساتھ ہی معاد کی طرف اشارہ ہے۔ نیز نعمتوں کا تذکرہ بندوں کے احساسِ تشکر کو بیدار کرنے کے لئے بھی ہے اس طرح انھیں زیادہ قربِ الہی کے حصول کی طرف مائل کیا گیا ہے ان تینوں پہلوؤں پر نظر رکھی جائے تو ان آیات کا گذشتہ آیات سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف گذشتہ آیات میں سے آخری آیت قرآن کے فزول کے بارے میں تھی۔ وہ آیات کہ روحِ انسانی کے لئے حیات بخش ہیں اور زیرِ نظر پہلی آیت آسمان سے بارش کے فزول کے بارے میں ہے۔ اور بارش جسمِ انسانی کے لئے حیات بخش ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس طرح زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی اسے حیاتِ تازہ بخشی ﴿وَاللَّهُ

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾۔

اس امر میں ان کے لئے عظمتِ الہی کی واضح نشانی ہے کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ)۔

آسمان سے بارش برسنے سے زمین کو جو حیاتِ نو ملتی ہے اس کا ذکر قرآن کی بہت سی آیات میں آیا ہے۔ بعض اوقات خشک سالی زمین کو اس طرح سے خشک، سالی زمین کو اس طرح سے خشک، خاموش اور بے روح کر دیتی ہے کہ وہ بالکل بے کار اور بنجر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کسی کو یقین نہیں آتا کہ کبھی اس زمین پر بھی سرسبز کھیتیاں لہراتی رہی ہیں یا آئندہ کبھی اس دکھ سے کوئی زندگی جنم لے گی لیکن چند پے در پے بارشیں ہوتی ہیں اور پھر سورج کی حیات بخش شعاعیں اس میں حرکت پیدا کر دیتی ہیں گویا کوئی سوہا تھا اور اب بیدار ہو گیا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں کوئی مردہ تھا کہ جس میں بارش کے دمِ مسیحائی سے زندگی لوٹ آتی ہے اس میں طرح طرح کے پھل پھول اگنے لگتے ہیں۔ سبزے لہلہانہ شروع کر دیتے ہیں۔ حشرات الارض اس پر ریگنے لگتے ہیں۔ پرندے اس میں چھپھانے لگتے ہیں اور جانور پھر سے اس کا رخ کرنے لگتے ہیں اور اس طرح زمرہ حیات پھر سے گونج اٹھتا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ زمین جو پہلے مردہ خاموش تھی اس میں ایسا غفلہ جاگ اٹھتا ہے کہ انسان مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالمِ آفرینش کا ایک شاہکار ہے یہ خالق کی قدرت و عظمت کی نشانی بھی ہے اور معاد و قیامت کے امکان کی دلیل بھی ہے اس سے کھلتا ہے کہ مردے کس طرح دوبارہ لباسِ حیات زیب تن کرتے ہیں یہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت بھی ہے خصوصاً بارش ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول کے لئے بندے کچھ زحمت نہیں کرتے۔

پانی کہ جو پہلا رکنِ حیات ہے اس کے ذکر کے بعد چوپایوں کے وجود کی نعمت کی طرف اشارہ ہے اس سلسلے میں خصوصیت سے دودھ کا تذکرہ ہے کہ جو انتہائی مفید غذائی عنصر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور چوپایوں کے وجود میں تمہارے لئے ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہے ﴿وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً﴾۔

اس سے بڑھ کر عبرت کی بات کیا ہوگی کہ ہم تمہیں ان جانوروں کے شکم میں ہضم شدہ غذا اور خون کے درمیان میں سے تمہارے پینے کے لئے خالص اور عمدہ دودھ فراہم کرتے ہیں ﴿نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ﴾۔

”فرث“ لغت میں اس ہضم شدہ غذا کے معنی میں ہے کہ جو معدے کے اندر ہو اور جب وہ انٹریوں تک پہنچتا ہے تو اس کا حیاتی مادہ بدن میں جذب ہو جاتا ہے اور اس کا پھوک اور فضلہ باہر نکل جاتا ہے اس فضلے کو ”روث“ (گوبر) کہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ شکر کا کچھ مواد اور اسی طرح پانی وغیرہ کی کچھ مقدار معدے کی دیواروں کے ذریعے بدن میں جذب ہو جاتی ہے اور اس کا ایک اہم حصہ ہضم شدہ غذا کی صورت میں انٹریوں کی طرف منتقل ہو کر خون میں داخل ہو جاتا ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دودھ پستان کے اندر موجود خاص غدودوں سے نکلتا ہے اور اس کا اصلی مواد خون اور چربی ساز غدودوں سے لیا جاتا ہے، اس طرح یہ سفید رنگ، صاف ستھرا اور خالص مادہ، یہ قوت بخش اور عمدہ غذا ہضم شدہ غذاؤں کے درمیان سے کہ جو فضلہ سے مخلوط ہیں اور خون کے نیچوں نیچ سے حاصل ہوتا ہے واقعاً یہ ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ سرچشمہ اس طرح سے آلودہ اور تنفر آمیز لیکن ماحصل خالص، خوبصورت، دل انگیز اور عمدہ دودھ۔

جانوروں اور ان کے دودھ کے ذکر کے بعد کچھ نباتات کی نعمت کا تذکرہ ہے ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے تمہیں کھجور اور انگور کی صورت میں پربرکت غذا عطا کی ہے کبھی تم اسے نقصان دہ شکل میں ڈھال لیتے ہو اور اس سے شراب بناتے ہو اور کبھی اس سے پاک و پاکیزہ رزق حاصل کرتے ہو۔ ﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا﴾۔

اس امر میں اس کے لئے قدرت پروردگار کی ایک نشانی ہے جو عقل و خرد رکھتے ہیں ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾۔

”سکر“ کے اگرچہ لغت میں مختلف معانی ہیں۔ یہاں سكرات، مشروبات الکحل اور شراب کے معنی میں ہے اور یہی اسی کا مشہور معنی ہے۔

واضح ہے اس آیت میں قرآن نے کھجور اور انگور سے شراب بنانے کی ہرگز اجازت نہیں دی بلکہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ”سکراً“ کو ”رزقاً“ کے بالمقابل بیان کیا گیا ہے یہ دراصل شراب کی حرمت اور اس کے غیر مطلق ہونے کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے لہذا اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم کہیں کہ یہ آیت حرمت شراب نازل ہونے سے پہلے کی ہے اور اس کے حلال ہونے کی طرف اشارہ ہے بلکہ اس کے برعکس آیت اس کے حرام ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور شاید یہ تحریم شراب کے لئے پہلا الارم ہے۔

در حقیقت ایک جملہ معترضہ کی صورت میں خدا چاہتا ہے کہ نعمات الہی سے سوءِ استفادہ کی طرف بھی اشارہ کرے۔

چند اہم نکات

۱۔ دودھ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے، قرآن مجید کہتا ہے: کہ دودھ ”فرث“ (معدے کے اندر ہضم شدہ غذا) اور ”دم“ (کون) کے درمیان سے نکلتا ہے۔

آج کی فزیالوجی (P h y s i o l o g y) (علم الاعضاء) نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جس وقت غذا معدے میں ہضم اور جذب کے لئے تیار ہو جاتی ہے تو معدے اور اتریبوں کی سطح میں کئی ملین بالوں کی رگوں کے ساتھ ساتھ بہت پھیل جاتی ہے۔ مفید اور ضروری عناصر اسے جذب کر کے اسے ایک جڑدار درخت تک پہنچاتے ہیں وہی جڑدار درخت کہ جس کی جڑیں پستان کی نوک میں جا کر جمع اور تمام ہوتی ہیں۔ ماں غذا کھاتی ہے تو اس کا نچوڑ خون میں داخل ہو جاتا ہے خون کی ان رگوں کی آخری شاخیں اور ”جنین“ کے گردشِ خون کا آخری مقام اور اس کی رگوں کی آخری شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں جب تک بچہ شکمِ مادر میں ہوتا ہے اس طرح غذا ملتی رہتی ہے لیکن وہ ماں سے الگ ہو جاتا ہے تو غذا دینے والے قطب نما عقربہ کی نوک کی ماں کے پستان کی نوک کی طرف رخ کرتی ہے اس حالت میں اب ماں کا خون نوزاد بچے کے خون تک نہیں پہنچ سکتا یہاں ایک تغیر اور تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اب ایک صاف شدہ محصول کی ضرورت ہوتی ہے جو بچے کے لئے گوارا اور مناسب ہو ایسے میں ”فرث“ اور ”دم“ کے درمیان میں سے دودھ پیدا ہوتا ہے ماں جو کچھ کھاتی ہے اس سے ”فرث“ بنتا ہے اور پھر اس سے خون پیدا ہوتا ہے اور پھر ان دونوں کے درمیان میں سے دودھ پیدا ہوتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ دودھ کی ترکیب بھی ”خون“ اور ”دم“ کی درمیانی سی ترکیب ہے یہ نہ صاف شدہ خون ہے نہ ہضم شدہ غذا۔ یہ ”فرث“ سے بالا اور خون سے نیچے کی ایک چیز ہے۔ دودھ کے بعض عناصر خون میں نہیں ہوتے اور پستان کی غدود میں بنتے ہیں۔ مثلاً گارونین

خون کے کچھ عناصر جو دودھ میں موجود ہیں وہ بغیر کسی تغیر کے خون کے پلازما (P l a s m a) سے ترشح ہو کر دودھ میں داخل ہوتے ہیں مثلاً مختلف وٹامن، خوردنی نمک اور مختلف فاسفیٹ۔

کچھ اور مواد بھی خون سے حاصل ہوتا ہے مثلاً دودھ میں موجود شکر (Lactose) خون میں موجود شکر سے حاصل ہوتی ہے جو پستان کے عمل میں مدد ہوتی ہے اور اس تغیر میں ایک اہم کردار کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں دودھ کی تولید نتیجہ ہے خون کے ذریعہ جذب غذا کا اور خون کے پستانوں کی غدود سے براہ راست تعلق کا، لیکن یہ بات جاذب نظر ہے کہ ”فرٹ“ کی مخصوص بو اور خون کا مخصوص رنگ دودھ میں منتقل نہیں ہوتے بلکہ یہ دودھ نئے رنگ اور نئی مہک کے ساتھ پستان کی نوک سے نکلتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ فزیالوجی کے ماہرین کہتے ہیں کہ پستان میں ایک لٹردودھ پیدا ہونے کے لئے کم از پانچ سے لٹر خون کو اس حصے سے گزرنا چاہیئے تاکہ ایک لٹردودھ کے لئے درکار ضروری مواد خون سے حاصل کیا جاسکے جبکہ رگوں میں ایک لٹر خون پیدا ہونے کے لئے ضروری مقدار میں غذائی مداد کو انٹریوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ”من بین فرٹ و دم“ (ہضم شدہ غذا اور خون میں سے) ک المفہوم پوری طرح واضح ہوتا ہے۔ ۱

۱۔ کتاب ”شیمی حیاتی و پزشکی“ اور کتاب ”اولین دانشگاه اور آخرین پیامبر“ جلد ۶ ص ۷۱، تا ص

۲۔ دودھ ایک اہم غذا

دودھ اہم حیاتی ن سے بھرپور ہے یہ اجزاء باہم مل کر ایک غذا بناتے ہیں۔
دودھ کے اجزاء:- سوڈیم (Sodium) پوٹاشیم (Potassium) کیلشیم (Calcium) میگنیشیم، کالسی، تانبا،
آئرن، فاسفورس آیوڈ (Iodine) اور گندھک۔
اس کے علاوہ دودھ میں آکسیجن، ازاٹ (Azote) اور کارناک ایسڈ کے اجزاء بھی موجود ہوتے ہیں۔ دودھ
میں شکر کافی مقدار میں لکٹوز (Lactose) کی شکل میں ہوتی ہے۔
دودھ میں تحلیل شدہ وٹامن اے، بی، سی اور ڈی ہوتے ہیں۔ دور حاضر میں ثابت ہو چکا ہے کہ اگ رجائور نے خوب
چارہ چر لیا تو اس کے دودھ میں ہر طرح کے وٹامن موجود ہوتے ہیں سب کی تفصیل اس کتاب میں نہیں آسکتی نیز اس
مسنلے پر بھی تقریباً اتفاق ہے کہ دودھ ایک مکمل غذا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں رسول اللہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لیس یجزی مکان الطعام والشراب الا اللہ

دودھ کے سوا کوئی چیز کھانے پینے کا مکمل نعم البدل نہیں ہے۔

نیز روایات میں ہے:

دودھ عقل انسان کو بڑھاتا ہے، ذہن انسانی کو شفا بخشتا ہے، آنکھوں کی بینائی میں اضافے کا باعث بنتا ہے، نسیان
کو ختم کرتا ہے، دل کو تقویت دیتا ہے اور کمر کو مضبوط کرتا ہے۔
ہم جانتے ہیں کہ یہ آثار دودھ میں موجود حیاتیات سے قریبی ربط رکھتے ہیں۔^(۱)

۱۔ کتاب ”اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر“ جلد ۶ میں موجود دودھ کی بحث سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۳۔ دودھ ایک خاص اور عمدہ غذا

زیر بحث آیات میں دودھ کو ”خالص“ اور ”گوارا“ غذا قرار دیا گیا ہے اور یہ بات پہلی نظر ہی میں ہر شخص کے لئے واضح ہے کہ دودھ کم حجم، پر قوت اور اضافی مواد سے پاک ایک خالص غذا ہے اور ساتھ ہی یہ ہر سن و سال کے شخص کے لئے، بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کے لئے نہایت گوارا، مفید اور مناسب ہے۔

انہی وجودہ کی بناء پر بہت سے بیمار اس غذا سے استفادہ کرتے ہیں خصوصاً ہڈیوں کی نشو و نما کے لئے اس کی بہت زیادہ تاثیر مانی گئی ہے، یہی وہ ہے کہ ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں اس کی سفارش کی گئی ہے۔

”خلوص“ کا معنی ”پیوند“ بھی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اس قرآنی تعبیر کو ہڈی جوڑنے میں دودھ کے بہت موثر ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ دودھ پلانے کے بارے میں جو اسلامی احکام وارد ہوئے ہیں ان میں یہ معنی وضاحت سے نظر آتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ فقہا کہتے ہیں:

اگر بچہ کسی عورت کا اس قدر دودھ پئے کہ اس کی ہڈی مضبوط ہو جائے اور گوشت اگ آئے تو یہ اس عورت کا محرم اور رضاعی بیٹا ہو جائے گا۔

اسی طرح کا حکم اس عورت کے شوہر اور دیگر رشتہ داروں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔^(۱) دوسری طری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء کے نزدیک پندرہ مرتبہ پے در پے دودھ پینے سے یہاں تک کہ ایک شب و روز دودھ پینے والا اس عورت کا محرم ہو جاتا ہے جس کا اس نے دودھ پیا ہے۔

ان دونوں باتوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کیا اس کا یہ مفہوم نہیں ہو گا کہ چوبیس گھنٹے دودھ پینا بھی ہڈیوں کی تقویت اور گوشت اگنے کے لئے موثر ہے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ اسلامی احکام میں پہلے دن کے دودھ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ اسلام کی فقہی کتب میں بچے کی زندگی کو اس سے وابستہ سمجھا گیا ہے۔ اسی بناء پر بچے کو پہلا دودھ پلانا واجبات میں شمار کیا گیا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے بارے میں سورہ قصص کی آیہ ۷ میں ہے۔

﴿و اوحینا الی ام موسیٰ ان ار ضعیہ فاذا خفت علیہ فاقیہ فی الیم﴾

موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلاؤ اور جب تمہیں اس کے بارے میں خوف لاحق ہو تو اسے دریا کی موجوں کے سپرد کر دو۔

۱۔ شرح لمعہ، کتاب نکاح الاولاد و منها الرضاع۔

آیات ۶۸، ۶۹

۶۸- ﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾۔

۶۹- ﴿ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلَالًا يَخْرُجُ مِنْ بَطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔

ترجمہ:

۶۸- تیرے پروردگار نے (نظام فطرت کے تحت) شہد کی مکھی کو وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور جو عرشے لوگ بناتے ہیں ان میں گھر بنانا۔

۶۹- اور پھر تمام پھلوں سے کھا اور جو راستے تیرے پروردگار نے تیرے لئے معین کئے ہیں ان میں راحت سے چل پھر۔ ان کے بطن سے پینے کی ایک خاص چیز نکلتی ہے اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ اس امر میں اہل فکر و نظر کے لئے بڑی نشانی ہے۔

تفسیر

شہد کی مکھی اور وحی الہی

یہاں قرآن کا لب و لہجہ شگفت انگیزہ و گیاہے نعمات الہی اور اسرار آفرینش کی بات جاری رکھتے ہوئے شہد کی مکھی اور پھر شہد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے لیکن اس طرح سے کہ شہد کی مکھی خدا کی طرف سے مامور ہے بتایا گیا ہے کہ رمز آمیز الہام و ہدایت کے جسے ”وحی“ کا نام دیا گیا ہے کے تحت شہد کی مکھی مشغول کار ہے۔ ارشاد ہوتا ہے تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ درختوں، پہاڑوں اور لوگوں کے بنائے ہوئے عرشوں اور مچانوں میں گھر بنا ﴿وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾۔

اس آیت میں چند قابل غور تعبیرات آئی ہیں:

۱۔ ”وحی“ کا مفہوم:

جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے دراصل تیز اشارہ کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ مخفی طور پر کوئی بات القاء کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ لیکن قرآن مجید میں یہ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ان سب معانی کی با

زگشت اسی اصل معنی کی طرف ہے قرآن کے مفہیم میں ایک وحی نبوت ہے زیادہ تر یہ لفظ قرآن میں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں ہے: ﴿وَمَا كَانَ لَبِشْرَٰنِ يَكْلَمُهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحِیًا﴾
انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ طریق وحی کے سوا کسی طرح اللہ سے کلام کر سکے۔

نیز ”وحی“ الہام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے یہ الہام خود آگاہ (انسانوں کے لئے) بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ﴿وَحِیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوسٰی اَنْ اَرْضَعِیْهِ فَاِذَا خَفَتْ عَلَیْهِ فَاَلْقٰیہِ فِی الْیَمِیْنِ﴾

اور ہم نے موسیٰ یال کی ماں کو وحی کی کہ اپنے نو مولود کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کے بارے میں دشمنوں کا خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا کی لہروں کے سپرد کر دے۔ (قصص ۷)

اور یہ الہام نا آگاہ اور طبعی صورت میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے بارے میں زیر بحث آیات میں مذکور ہے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ یہاں ”وحی“ اشارے کے معنی میں بھی ہے جیسا کہ حضرت زکریا یال کے واقعے میں ہے: ﴿فَاَوْحٰی اِلَیْہِم اَنْ سَبِّحُوْا بِکَرۃٍ وَّ عَشِیۡآً﴾

زکریا نے لوگوں کو اشارے سے کہا: صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو۔ (مریم ۱۱)
نیز مخفی طور پر مخبر پہنچانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جیسا کہ سورہ انعام کی آیہ ۱۱۲ میں ہے: ﴿یُوحِیْۡ اِلَیْہُمْ اِلٰیۡ بَعْضُ زُحُرِ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾

انسانی اور غیر انسانی شیطاں مخفی طریقے سے پر فریب اور گمراہ کن مطالب ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔

۲۔ کیا طبعی الہام شہد کی مکھیوں سے مخصوص ہے؟

طباغ و غرائز یا طبعی الہام شہد کی مکھیوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام جانوروں میں موجود ہے اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہاں یہ تعبیر استعمال کیوں کی گئی ہے۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں جبکہ شہد کی مکھیوں کی زندگی کا سائنسدانوں نے نہایت دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے تو یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس عجیب و غریب جانور کا تمدن اور شگفت آمیز اجتماعی طرز حیات کئی حوالے سے انسان اور اس کی اجتماعی زندگی سے بڑھ کر ہے۔

گذشتہ زمانے میں اس کی عجیب و غریب زندگی کچھ تو واضح تھی لیکن عصر حاضر کی مانند اس کی زندگی کے ایک سے ایک بڑھ کر عجیب تر پہلو انسان کے سامنے نہ تھے۔ قرآن نے نہایت اعجاز آمیز انداز میں لفظ ”وحی“ کے ذریعے اس امر کی

طرف اشارہ کیا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح کرے کہ شہد کی مکھی کی زندگی ک اہر ہز چوپایوں اور دیگر جانوروں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا اس طرح سے قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس عجیب جانور کی اسرار آمیز دنیا میں قدم رکھیں اس کے خالق کی عظمت و قدرت سے آشنا ہوں اس آیت میں کلام کا لب و لہجہ بدلنے کا یہی راز ہے۔

۳۔ شہد کی مکھی کا گھر:

آیت میں سب سے پہلے شہد کی مکھی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اسے گھر بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے شاید اس بات کا ذکر اس لئے کیا گیا ہو کہ مناسب گھر زندگی کی پہلی ضرورت ہے باقی کاموں کی باری بعد میں آتی ہے یا ہو سکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ مسدس کمرؤں کی شکل میں بنی ہوئی شہد کی مکھیوں کی عمارت جو شاید کئی ملین سالوں سے دنا بھر میں یو نہی بنتی چلی آرہی ہے، ان کی زندگی کی ایک عجیب ترین بات ہو۔^(۱)

یہاں تک کہ یہ تعبیر خود شہد بنانے سے عجیب تر۔ شہد کی مکھی کس طرح سے ایک خاص قسم کی موم تیار کرتی ہے اور کیسی عمدہ گی، نفاست اور صفائی سے پیماش شمدہ مسدسی کرے بناتی ہے۔ بنیادی طور پر کسی ایک سطح سے اس طرح سے پورا استفادہ کرنا اس کا کوئی حصہ بے کار نہ رہ جائے یا اس کے زاویے اور کونے تنگ و تاریک نہ ہوں اس کے لئے مسدس شکل میں بہتر مساوی رادیوں کا کوئی اور انتخاب نہیں ہو سکتا علاوہ ازیں ایسے گھروں میں پائیداری بھی ہوتی ہے۔

۴۔ گھر کا انتخاب۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے ایسے گھر بعض اوقات پہاڑوں میں بنائے جاتے ہیں ناقابل عبور پتھروں کے درمیان ان کے ایسے خاص سوراخوں میں جو اس مقصد کے لئے بالکل مناسب ہوتے ہیں۔

کبھی شہد کی مکھیاں یہ گھر درختوں کی ٹہنیوں میں بناتی ہیں، اور گاہ ان گنبد نما جگہوں میں کہ جو لوگ ان کے لئے عرشوں کے اوپر بناتے ہیں۔

اس تعبیر سے ضمناً معلوم ہوتا ہے کہ شہد کا چھتہ پہاڑ، درخت اور عرشہ کی بلند جگہ پر ہونا چاہیئے تاکہ وہ اس سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے بعد شہد کی مکھی کی دوسری ذمہ داری بیان کی گئی ہے قرآن کہتا ہے: اس کے بعد ہم نے اسے یہ وحی کی کہ تو تمام قسم کے پھلوں سے کھا۔ ﴿ثُمَّ كَلَّیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾۔ اور جو راستے تیرے رب نے تیرے لئے معین کئے ہیں ان میں بڑی راحت سے چل پھر۔ ﴿فَاسْلُكْی سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا﴾۔

”ذلل“ ”ذلول“ کی جمع ہے اس کا معنی ہے ”ہموار اور“ ”تسلیم“ یہ راستوں کی توصیف کے لئے آیا ہے اس لئے کہ یہ راستے اس باریک بینی کے ساتھ معین کئے گئے ہیں کہ شہد کی مکھیوں کے سامنے تسلیم اور ہموار ہیں اس سلسلے میں ہم بعد ازیں وضاحت کریں گے۔

آخر میں ایک نتیجہ کی صورت میں ان کی ماموریت کا آخری مرحلہ بیان کیا گیا ہے: شہد کی مکھیوں کے اندر سے ایک خاص طرح کی پینے کی چیز نکلتی ہے جو مختلف رنگ کی ہوتی ہے ﴿يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ﴾۔

یہ شراب حلال انسانوں کے لئے بڑی اہم شفا بخش چیز ہے ﴿فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ﴾۔

شہد کی مکھیوں کی یہ زندگی انسان کے لئے غذا مہیا کرتی ہے اور شفا بھی اور سبق آموز بھی ہے اس میں اہل فکر و نظر کے لئے عظمت و قدرت پروردگار کی واضح نشانی ہے۔ ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾۔

اس آیت میں بھی چند پر معنی اور قابل توجہ نکات ہیں۔

۱۔ ابھی تک شہد کی مکھیوں کی ۴۵۰۰ اقسام دریافت ہو چکی ہیں لیکن یہ بات بڑی عجیب ہے کہ مہاجرت اختیار کرنے میں ان کا طرز عمل، شہد بنانا، پھولوں کا رس چوسنا اور کھانا سب کچھ ایک جیسا ہے،۔ (اولین دانشگاه و آخرین پیامبر جلد ۵ ص ۵۵)

چند قابل توجہ نکات :

اس آیت میں بھی چند پر معنی اور قابل توجہ نکات ہیں۔

۱۔ شہد کس چیز سے بنتا ہے؟

شہد کی مکھیاں عموماً شکر کا خاص مادہ جو پھولوں کی جڑوں اور ابتدائی حصوں میں ہوتا ہے اسے چوستی ہیں اور اسے جمع کرتی ہیں لیکن ان مکھیوں کی شناخت رکھنے والے کہتے ہیں کہ مکھیاں پھولوں کے ابتدائی حصوں میں موجود شکر سے ہی استفادہ نہیں کرتیں بلکہ بعض اوقات پھولوں کے تخمدانوں نیز پتوں اور پھلوں کے ابتدائی حصوں سے بھی استفادہ کرتی ہیں۔ قرآن ان سب کو ”من کل الثمرات“ (سب پھلوں سے) تعبیر کرتا ہے۔

ایک ماہر حیاتیات مسٹر مٹرلینگ اس سلسلے میں عجیب بات کہتا ہے کہ اس کی اس بات سے قرآنی تعبیر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے:-

آج اگر شہد کی مکھی (پالتویا جنگلی جس قسم کی بھی ہو) ختم ہو جائے تو ہمارے ایک لاکھ قسم کے نباتات، پھول اور پھل نابود ہو جائیں اور کیا معلوم کہ اصلاً ہمارا تمدن ہی ختم ہو جائے۔ (اولین دانشگاه و آخرین پیامبر جلد ۵ ص ۵۵)۔

اس نے یہ اس لئے کہا ہے کیونکہ ہر پھلوں کے دانے بکھیرنے میں، مادہ پودوں کو حاملہ کرنے میں اور اس کے بعد پھلوں کی پرورش میں شہد کی مکھیوں کا کردار اس قدر عظیم ہے کہ بعض ماہرین کے نزدیک ان کا یہ کام شہد بنانے سے کہیں اہم ہے درحقیقت شہد کی مکھیاں جو کچھ ان سے کھاتی ہیں وہ بالقوہ طرح طرح کے پھل ہیں کہ جو ان کی مدد سے صورت پذیر ہوتے ہیں اس صورت میں دیکھا جائے تو ”کل الثمرات“ کی تعبیر کس قدر معنی خیز معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ ہموار اور مطیع راستے

مکھیوں کا علم رکھنے والے اپنی تحقیقات کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صبح کے وقت شہد کی مکھیوں کا ایک غول جو پھولوں کی پہچان پر مامور ہوتا ہے چھتے سے نکلتا ہے اور پھولوں سے بھری جگہوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے لوٹ آتا ہے اور دوسروں کو اطلاع فراہم کرتا ہے اس طرح سے ان کی سمت اور پروگرام کا تعین ہوتا ہے اور چھتے سے ان کا فاصلہ بھی دوسروں پر واضح ہو جاتا ہے۔ شہد کی مکھیاں پھولوں کی جگہ تک پہنچنے کے لئے بعض اوقات اپنے راستے

میں نشانیاں اور علامتیں مقرر کرتی ہیں وہ اپنے راستے میں مختلف قسم کی مہک پھیلا کر یا کسی اور طرح سے راستے کو معین کرتی ہیں اس کے باعث بہت کم امکان ہوتا ہے کہ کوئی مکھی راستے سے بھٹک جائے۔

”فاسلکی سبل ربک ذللا“ (اپنے رب کے راستوں پر چل پھر کہ جو تیرے لئے مطیع اور ہموار کئے گئے ہیں)۔

یہ جملہ گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ شہد کہاں بنتا ہے؟

شاید ابھی تک بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ شہد کی مکھیوں کا طریق کار یہ ہے کہ وہ پھولوں کا شیرہ چوس کر منہ میں جمع کر لیتی ہیں اور پھر چھتے میں سٹور کر دیتی ہیں حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے وہ پھولوں کا شیرہ اپنے خاص بدن کے بعض خانوں میں بھج دیتی ہیں ان خانوں کو مکھیوں کا علم رکھنے والے ”پوٹ“ کہتے ہیں۔ یہ جگہ دراصل ایک چھوٹے سے کیمیکل کارخانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں پھولوں کے رس میں مختلف تغیرات اور تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخر کار یہ شہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر مکھی اس تیار شدہ شہد کو اپنے بدن سے باہر نکالتی ہے۔

یہ بات عجیب ہے کہ سورہ نحل کی سورتوں میں سے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکہ کے علاقے میں نہ پھل ہوتے ہیں نہ پھول اور نا ہی شہد کی مکھیاں لیکن قرآن اس بارے میں اس عمدگی اور باریکی سے گفتگو کر رہا ہے اور انتہائی دلکش انداز میں شہد بنانے کی تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ مثلاً: ﴿يَجْرُجُ مِنْ بَطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ﴾

شہد کی مکھیوں کے اندر سے مختلف رنگوں کا ایک مائع نکلتا ہے۔

۴۔ شہد کے مختلف رنگ

شہد کی مکھیاں جس رنگ کے پھل یا پھول پر بیٹھتی ہے اور اس کا رس چوستی ہے اس رنگ کے اعتبار سے شہد مختلف رنگوں کا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شہد کبھی سیاہ قہوؤں کی طرح کا، کبھی چاندی کی سی سفیدی کے ساتھ، کبھی بے رنگ، کبھی زرد، کبھی شفاف، کبھی سیاہ، کبھی گولڈن، کبھی کھجور کی مانند یہاں تک کہ کبھی سیاہی مائل ہوتا ہے۔

رنگوں کا یہ تنوع شہد کے سرچشموں کے تنوع کو ظاہر کرنے کے علاوہ ذوق کے تنوع کا بھی غماز ہوتا ہے کیونکہ آج کے زمانے میں ثابت ہو چکا ہے کہ غذا کا رنگ انسان کی بھوک اور خواہش کو تحریک کرنے میں بہت ہی موثر ہوتا ہے۔

متقدمین بھی گویا اس نفسیاتی مسئلے کو پہچانتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی غذاؤں کو زعفران، ہلدی اور دوسرے رنگوں سے رنگین کرتے تھے تاکہ دیکھنے میں مہمانوں کو غذا اچھی لگے اور انھیں کھانے کے لئے تشویق پیدا ہو۔ غذا شناسی کی

کتب میں اس ضمن میں بہت بحث کی گئی ہے کہ جسے تفسیر کی موجودہ حدود کے پیش نظر تمام تر نقل کرنا مناسب نہیں ہے۔

۵۔ شہد، غیر معمولی شفا بخش مادہ ہے

ہم جانتے ہیں کہ نباتات اور پھلوں میں حیات بخش دوائیں مخفی ہیں۔ آج بھی ہماری وسیع معلومات ضری بوٹیوں اور نباتات میں دواؤں کی موجود صلاحیت کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ سائنس داں تجربے کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ شہد کی مکھیاں شہد بناتے وقت اس مہارے سے کام کرتی ہیں کہ نباتات میں موجود دواؤں کے خواص پوری طرح شہد میں منتقل کر دیتی ہیں جو اس میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہد اس زمین کے بہت سے نباتات اور پھولوں کے معالجاتی خواص کا زندہ ثبوت ہے۔ سائنس دانوں اور ڈاکٹروں نے شہد کے بہت زیادہ خواص بیان کئے ہیں۔ ان خواص کا تعلق علاج معالجے سے بھی ہے، احتیاطی تدابیر سے بھی حصولِ قوت سے بھی۔

شہد بہت جلد خون میں جذب ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ قوت بخش ہے اور خون بانٹنے میں نہایت مؤثر ہے۔ شہد معدے اور انتڑیوں میں بدبو پیدا ہونے سے بچاتا ہے۔ شہد خشکی اور قبض کو دور کرتا ہے۔

شہد بے خوابی کے علاج کے لئے بہت مؤثر ہے۔ (بشرطیکہ تھوڑی مقدار میں پی جائے ورنہ اس کا زیادہ استعمال نیند کو کم کر دیتا ہے)۔

شہد تھکان کو دور کرنے اور پٹھوں کے کھینچاؤ دور کرنے کے لئے اثر آفرین ہے۔ شہد حاملہ عورتوں کا دیا جائے تو ان کے بچوں کے اعصاب قوی کر دیتا ہے۔ شہد خون کے کیلشیم میں اضافہ کر دیتا ہے۔

شہد کمزور ہاضمے کے لئے مفید ہے خصوصاً جن کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہو اطباء ان کے لئے اسے تجویز کرتے ہیں۔ شہد بدن کی تعمیر میں جلدی سے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیتا ہے لہذا فوری طور پر امر جی پیدا کرتا ہے اور قوی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

شہد دل کو تقویت بخشتا ہے۔

شہد جگر اور پھیپھڑوں کے علاج کے لئے ایک اچھی دوا ہے۔
 شہد جراثیم کش خاصیت کی بناء پر اسہال میں مبتلا افراد کے لئے مفید ہے۔
 شہد معدے اور انٹریوں کے زخم کے علاج کے لئے مؤثر عالم شمار ہوتا ہے۔
 شہد گھٹیا (Rheumatism) ہٹھوں کی بیماریوں اور عضلات کے نمو میں نقص کے علاج کے لئے مفید دوا ہے۔

شہد کھانسی کے علاج کے لئے مؤثر ہے اور آواز کو صاف کرتا ہے۔
 خلاصہ یہ کہ شہد دوا کے طور پر اس قدر خواص رکھتا ہے کہ اس مختصر سی کتاب میں بیان نہیں کئے جاسکتے۔
 علاوہ ازیں شہد سے جلد کی لطافت، چہرے کی خوبصورتی، طول، عمر کے لئے پر تاثیر دوائیں بنتی ہیں۔
 شہد منہ زبان اور آنکھ کے ورم دور کرنے کے لئے فائدہ مند دوائیں تیار کرنے کے کام آتا ہے۔
 شہد جلد تھک جانے کے علاج کے لئے بننے والی دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔
 شہد میں کئی ایک معدنیات اور وٹامن پائے جاتے ہیں مثلاً۔

آئرن (Iron)، فاسفورس (Phosphorous)، پوٹاشیم (Potassium)،
 میگنیشیم (Magnesium)، سیسہ (Lead)، تانبا (Copper)، سلفر (Sulphur)، نکل (Nickel)، کانسی (Bronze)، سوڈیم (Sodium) وغیرہ اس میں موجود ہیں۔
 ان کسے علاوہ اس میں گوند، پولن، لکٹک ایسڈ (Lactic)، فارسک ایسڈ (Formic) سڑک
 ایسڈ (Citric) ٹارٹارک ایسڈ (Tartaric Acid) اور معطر روغن بھی اس میں موجود ہوتا ہے۔
 اس میں چھ طرح کے وٹامن پائے جاتے ہیں۔ اے، بی، سی، ڈی، کے اور ای۔ بعض خیال ہے کہ (پی۔ بی۔
 وٹامن) بھی شہد میں ہوتے ہیں۔

شہد انسانوں کے علاج کے لئے بھی مفید ہے صحت کے استحکام کے لئے بھی اور خوبصورتی میں بھی خدمت گزار ہے۔

اسلامی روایات میں بھی دوا کی حیثیت سے شہد کی کا صیت کا بہت ذکر آیا ہے اس سلسلے میں حضرت امام علی علیہ السلام امام صادق علیہ السلام اور دیگر معصومین یال سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا:

ما استشفی الناس بمثل العسل

لوگوں کے لئے شہد کی سی شفا کسی بھی چیز میں نہیں ہے۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۷ ص ۷۳ تا ۷۵)۔

یہ بھی حدیث ہے۔ لم یستشف مریض بمثل شربة عسل

کسی مریض کے لئے شربت شہد سے بڑھ کر کوئی چیز شفا بخش نہیں ہے۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۷ ص ۷۳ تا ۷۵)

کئی ایک روایات میں درد دل کے علاج کے لئے شہد کو تجویز کیا گیا ہے رسول اکرم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

:- من شرب العسل فی کل شهر مرة یرید ماجاء به القرآن عوفی من سبع و سبعین داء

جو شخص مہینہ میں کم از کم ایک مرتبہ شربت شہد پئے اور خدا سے اس شفاء کا تقاضا کرے کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے وہ اسے ستر قسم کی بیماریوں سے شفا بخشے گا۔^(۱)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہر حکم کے استثنائی مواقع بھی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ چند ایک ایسے مواقع بھی ہیں کہ جن میں شہد کے استعمال سے منع کیا گیا ہے۔

۶۔ ”للناس“ یعنی انسانوں کے لئے

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ مکھیوں کا علم رکھنے والے کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی کی بھوک ختم کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ دو یا تین پھلوں کو چوس لے جبکہ وہ ایک گھنٹے میں اوسطاً اٹھائی سو پھلوں پر بیٹھتی ہے اور کئی کلومیٹر سفر کرتی ہے اور اپنی مختصر سی عمر میں ڈھیر سا راشہد جمع کر لیتی ہے۔

بہر حال اس کی یہ تگ و تازی اور کارکردگی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صرف اپنے لئے کام نہیں کرتی بلکہ جیسا کہ قرآن کہتا ہے ”للناس“ (سب انسانوں کے) کرتی ہے۔

۷۔ شہد کے بارے میں دیگر اہم امور

موجودہ زمانے میں یہ نکتہ ثابت ہو چکا ہے کہ شہد کبھی بھی خراب نہیں ہوتا یعنی یہ ایسی غذا ہے جو ہمیشہ تازہ اور زندہ دستیاب رہتی ہے یہاں تک کہ اس میں موجود وٹامن کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ماہرین کے نزدیک اس کی وجہ اس پوٹاشیم کی فراواں موجودگی ہے۔ کہ جو جراثیموں کو پیدا نہیں ہونے دیتی۔ علاوہ ازیں ایسا مواد بھی موجود ہے جو بدبو پیدا ہونے سے روکتا ہے مثلاً اس میں فارمک اسید (F o r m i c A c i d) موجود ہے لہذا شہد میں جراثیم کی پیدائش روکنے کی خاصیت بھی موجود ہے اور جراثیم کشی کی بھی۔ قدیم مصری اسی بات کو جانتے ہوئے اپنے مردوں کو مومیانے کے لئے اسے استعمال کرتے تھے۔

شہد کو معدنیات سے بنے ہوئے برتنوں میں ذخیرہ نہیں کرنا چاہیے یہ وہ بات ہے جو ماہرین بتاتے ہیں اور جاذبِ نظریہ ہے کہ قرآن شہد کی مکھیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:-

﴿مِنَ الْجِبَالِ بِيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ﴾

یعنی شہد کی مکھیوں کے گھر صرف پتھروں اور لکڑیوں میں ہوتے ہیں۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شہد کو بطور دوا استعمال کرنے کے لئے اور صحت کے لئے اس کے خواص سے فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے ہرگز حرارت نہ پہنچائی جائے اور دوسری غذاؤں میں پکا کر اس سے استفادہ نہ کیا جائے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن نے شہد کے لئے جو ”شراب“ (پینے کی چیز) کی تعبیر استعمال کی ہے یہ اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ اسے پیا جائے۔

نیز یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ شہد کی مکھی کا ڈنگ بھی معالجانہ خاصیت رکھتا ہے البتہ شہد کی مکھی اپنے لطیف مزاج کے باعث کسی کو ڈنگ نہیں مارتی۔ یہ تو ہم ہیں جو اسے ڈنگ مارنے پر ابھارتے ہیں۔

ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ شہد کی مکھی بدبو سے پریشان ہو جاتی ہے اگر کوئی شہد حاصل کرنے والا بدبو دار ہاتھ، بدبو دار لباس کے ساتھ چھتے کے قریب جائے تو اسے ضرور ڈستی ہے اگر اس نے پہلے کسی چھتے میں ہاتھ ڈالا ہو اور غیر چھتے کی بدبو اس کے ہاتھ میں لگی ہو تو دوسرے چھتے میں ہاتھ ڈالنے پر مکھیاں اس پر حملہ کر دیں گی۔ لہذا ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ کو اچھی طرح دھو لے۔

البتہ شہد کی مکھی جب ڈنگ مارتی ہے تو خود مر جاتی ہے اس بناء پر ڈنگ مارنا اس کی ایک طرح کی خودکشی ہے۔ مختلف بیماریوں کے علاج کے لئے شہد کی مکھی کے ڈنگ سے استفادہ کیا جاتا ہے مثلاً گھٹیا (Rheumatism)، ملیریا، درد اعصاب وغیرہ۔ البتہ اس کے لئے اطباء کی راہنمائی کے مطابق استفادہ کرنا چاہیئے ورنہ شہد کی مکھی کا ڈنگ خطرناک بھی ہو سکتا ہے چند ایک مکھیاں ڈس لیں تو عموماً قابل برداشت ہوتا ہے لیکن دوسو سے لیکر تین مکھیاں ڈس لیں تو بہت زہر پیدا ہو جاتا ہے اور دل کی تکلیف کا باعث بنتا ہے اور گارپانچ سے کی تعداد تک مکھیاں ڈس لیں تو عمل تنفس مفلوج ہو جانے اور موت کا احتمال بھی ہوتا ہے۔

۸۔ شہد کی مکھیوں کی عجیب و غریب زندگی

گزشتہ زمانے میں کم موجودہ زمانے میں بہت سے علماء و محققین کے پیہم مطالعات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ شہد کی مکھیوں کی زندگی بہت ہی منظم ہوتی ہے ان کے ہاں برے سلیقے سے کام تقسیم ہوتا ہے بہت دقیق نظام کے تحت ذمہ داریاں بانٹی ہوئی ہوتی ہیں۔

شہد کی مکھیوں کا شہر بہت زیادہ پاک و صاف اور متحرک زندگی سے بھرپور ہوتا ہے ان کا شہر عام شہروں سے بہت مختلف ہوتا ہے یہ روشن اور درخشاں تمدن کا حامل ہوتا ہے۔ اس شہر میں خلاف ورزی کرنے والے اور کاہل افراد بہت کم نظر آتے ہیں اگر کبھی چھتے کے باہر مکھیاں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدبو دار اور نقصان دہ پھولوں

کارس چوس آئیں تو چھتے کے دروازے پر ہی اس سے باز پرس ہوتی ہے۔ پھر ایک کھلی عدالت لگتی ہے اور اس مقدمے کے ضمن میں اس کے قتل کا حکم صادر ہوتا ہے۔

بلجیم کے ماہر حیاتیات مٹرلنگ نے شہد کی مکھیوں کے بارے میں بہت زیادہ مطالعہ اور تحقیق کی ہے اس نے ان کے شہر پر حکم فرما عجیب و غریب نظام کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

ملکہ (یا زیادہ صحیح الفاظ میں چھتہ کی ماں) مکھیوں کے شہر کی ایسے حکمران نہیں جیسا ہم تصور کرتے ہیں بلکہ وہ بھی اس شہر کے دیگر باسیوں کی طرح یہاں کے نظام اور قوانین کی فرمانبردار ہوتی ہے۔

ہمیں یہ علم نہیں کہ یہ نظام اور قوانین کہاں پر وضع ہوتے ہیں ہمیں انتظار ہے کہ شاید کسی دن اس بات کا ہمیں سراغ مل جائے اور ان قوانین کے بنانے والے کو ہم پہچان لیں لیکن فی الحال ہم اس قانون ساز کو ”چھتہ کی روح“ کے نام سے پکارتے ہیں۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ”چھتہ کی روح“ کہاں ہے اور شہر میں رہنے والے کس فرد میں حلول کئے ہوئے ہیں لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ چھتہ کی روح پرندوں کے مزاج اور طبیعت سے مشابہ نہیں ہے نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چھتہ کی روح شہد کی مکھی کا اندھا ارادہ اور عادت نہیں ہے ”چھتہ کی روح“ شہر میں رہنے والے ہر فرد کو اس کی استعداد کے مطابق ذمہ داری سونپتی ہے اور ہر کسی کا کسی نہ کسی کام پر لگاتی ہے۔ ”چھتہ کی روح“ ماہر تعمیرات اور کاریگر مکھیوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ گھر بنائیں ”چھتہ کی روح“ معین دن اور معین لمحے میں شہر کے تمام باسیوں کو حکم دیتی ہے کہ شہر سے ہجرت کر جائیں اور نیا مسکن تلاش کرنے کے لئے اپنے آپ کو ان دیکھے حوادث اور مشقتوں کے حوالے کر دیں۔ ہمیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شہد کے قوانین جو ”چھتہ کی روح“ کے ذریعے وضع ہوئے ہیں کس پارلیمنٹ میں پیش کئے گئے ہیں کہ جس نے انھیں جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کون ہے جو ایک معین دن چل پڑنے کا حکم صادر کرتا ہے۔

جی ہاں! چھتے میں مہاجرت کے یہ مقدمات اطاعتِ خدا میں فراہم ہوتے ہیں۔

وہی خدا کہ جس کے ہاتھ میں شہد کی مکھی کی تقدیر ہے۔ (کتاب زنبور عسل (شہد کی مکھی) تالیف مٹرلنگ ص

۳۵-۳۶)

مذکورہ دانش مند اپنی فکر و نظر میں موجود مکتب مادیت کے پرانے خیالات کی وجہ سے اس مسئلے پر اگر ابہام کے ساتھ گفتگو کرتا ہے تو ہماری نظر تو قرآن کی راہنمائی پر ہے ہم تو یہ بات اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی ہیں یہ

نظام کہاں تربیت پاتا ہے، یہ پروگرام کہاں بنتا ہے انھیں منظم کرنے والا کون ہے اور کون ان کے لئے حکم جاری کرتا ہے۔ قرآن کتنی خوبصورت تعبیر کہتا ہے۔ اوحی ربک الی النحل

تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی و الہام کیا

کیا اس سے زیادہ رسا، جامع، منہ بولتی اور ناطق تعبیر کا تصور ہو سکتا ہے۔

شہد کی مکھیوں کے بارے میں جو کچھ بیان نہیں کیا جاسکا اگرچہ وہ بیان کئے جانے والے کی نسبت بہت زیادہ ہے لیکن ہماری طرز تفسیر اجازت نہیں دیتی کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ گفتگو کریں۔^(۱)

۱۔ اولین دانش گاہ و آخرین پیامبر

۲۔ زنبور عسل۔ تالیف مٹرلینگ

۳۔ شگفت ہائے۔ عالم حیوانات۔

(غیر ایرانی مصنفین کی کتابوں کے فارسی ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے وغیرہ اور ترجمے ہی کا نام یہاں دیا گیا ہے

۔ (مترجم)

۱۔ مندرجہ بالا مباحث میں شہد کی مکھیوں اور شہد کے خواص کے بارے میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

آیات ۷۰، ۷۱، ۷۲

۷۰۔ ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ اِلٰى اَرْدَلِ الْعُمْرِ لِكٰى لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ﴾۔

۷۱۔ ﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فَضَّلُوْا بِرَادٰى رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ

سَوَآءٌ اَفْبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ﴾۔

۷۲۔ ﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَيْنَ وَحَفْدَةً وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ اَفَالْبَاطِلُ

يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ﴾۔

ترجمہ

۷۰۔ اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر وہی تمہیں مارے گا تم میں سے بعض بڑھاپے کو جا پہنچتے ہیں کہ علم و آگاہی کے بعد (ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے) کہ کچھ نہیں جانتے (اور سب کچھ بھول جاتے ہیں) بیشک خدا علیم و قدیر ہے۔

۷۱۔ خدا نے تم میں سے بعض کو بعض دوسروں پر رزق میں برتری دی ہے (کیونکہ تمہاری استعداد اور کوشش میں فرق ہے) لیکن جنہیں برتری دی گئی ہے وہ اس بات پر تیار ہیں کہ اپنی روزی میں سے اپنے غلاموں کو دیں تاکہ سب کے سب برابر ہو جائیں کیا وہ نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں؟

۷۲۔ اور اللہ نے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور ان بیویوں سے تمہیں پوتے نواسے اور بیٹے عطا کئے اور تمہارے لئے طہبات میں روزی قرار دی کیا پھر یہ باطل پر ایمان لے آتے ہیں اور نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر

رزق میں اختلاف کا سبب

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی کچھ اہم نعمتوں اور عنایا کا تذکرہ تھا کچھ نباتات اور حیوانات کی تخلیق کا بیان تھا تاکہ لوگ ان پر نظر کرتے ہوئے ان سب نعمتوں اور اس دقیق نظام کے خالق سے آشنا ہوں۔

زیر بحث آیات میں بھی ایک اور حوالے سے خالق یکتا کے اثبات کے مسئلہ پر گفتگو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ آیات نعمتوں کے تغیرات کے حوالے سے بات کرتی ہیں ایسے تغیرات کا ذکر ہے کہ جو انسانی اختیار سے باہر ہیں اور ان کا فیصلہ کسی اور کی جانب سے ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ نے تمہیں پیدا کیا ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ﴾ اس کے بعد وہ تمہاری روح کو لے لے گا ﴿ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ﴾۔

زندگی بھی اسی کی طرف سے ہے اور موت بھی تاکہ تم جان لو کہ موت و حیات پیدا کرنے والے تم نہیں ہو لمبی عمر کا ہونا بھی تمہارے اختیار میں نہیں ہے بعض جوانی میں یا برہا پے کی سرحد پر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن ”تم میں سے بعض لمبی عمر پاتے ہیں۔ عمر کے بدترین انتہائی بڑھاپے تک جا پہنچتے ہیں ﴿وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْدَلِ الْعُمْرِ﴾^(۱) اور اس طولانی عمر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و آگاہی کے بغیر انھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا اور وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں ﴿لَكِنِّي لَا يَعْْلَمُ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا﴾^(۲)

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ علت و سبب کے معنی میں ہو یعنی اللہ انھیں ان بالائی سالوں کی طرف لے جاتا ہے اس کی علت یہ ہے کہ ان پر حالتِ نسیان طاری کرے تاکہ یہ انسان جاں لیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے کچھ بھی ان کی اپنی طرف سے نہیں ہے۔

بعینہ اس کی حالت بچپن کی سی ہو جاتی ہے کہ جب بھول جاتا ہے اور نا آگاہ بھی تھا جی ہاں! ”خدا آگاہ اور قادر ہے“ ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ﴾۔

تمام قدرتیں اسی کے اختیار میں ہیں وہ جس قدر مصلحت سمجھتا ہے عطا کرتا ہے اور جس موقع پر ضروری سمجھتا ہے لے لیتا ہے۔

اگلی آیت میں یہی بات جاری ہے اور فرمایا گیا کہ تمہاری روزی تک تمہارے اختیار میں نہیں ہے ”یہ خدا جو تم میں سے بعض کو رزق کے اعتبار سے دوسروں پر برتری دیتا ہے۔ ﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾۔ لیکن جنھیں یہ برتری دی گئی ہے ان کی تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ان کے اختیار میں ہے وہ اپنے غلاموں کو دینے کے لئے تیار نہیں ہیں اور انھیں اپنے اموال میں شریک نہیں کرتے کہ وہ بھی ان کے برابر ہو جائیں ﴿فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ﴾۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ مشرکین کے بعض احمقانہ افعال کی طرف اشارہ ہے کہ جو اپنے بتوں اور خداؤں کے لئے چوپاؤں اور زرعی پیداوار کا ایک حصہ مختص کر دیتے تھے حالانکہ یہ بے وقعت پتھر اور لکڑیاں ان کی زندگی پر ذرہ بھر اثر نہیں رکھتے تھے لیکن وہ اس بات پر تیار نہ تھے کہ اس دولت میں سے کچھ اپنے بے چارے غلاموں کو دیں کہ جو رات دن ان کی خدمت کرتے تھے۔

کیا رزق کی تفریق عدالت پر مبنی ہے؟

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگوں میں تقسیم رزق میں اختلاف پیدا کرنا اللہ کے اصولِ عدالت و مساوات کے مطابق ہے جبکہ اصولِ عدالت و مساوات کو انسانی معاشروں پر حاکم ہونا چاہیے۔
اس سوال کے جواب میں دو نکتوں کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ انسانوں میں موجود مادی فوائد و وسائل اور آمدنی میں اختلاف کا ایک اہم حصہ ان کی استعداد اور صلاحیتوں میں اختلاف سے مربوط ہے، جسمانی اور روحانی صلاحیتوں فرق اقتصادی کارکردگی کی کمیت و کیفیت کا سرچشمہ ہے اسی سے بعض کا حصہ رزق کم اور بعض کا زیادہ ہو جاتا ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات ایسے حوادث پیش آتے ہیں کہ جو ہمارے نزدیک اتفاقات ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بعض لوگوں کو زیادہ نعمات میسر آجاتی ہیں لیکن انھیں استثنائی امور شمار کرنا چاہیے لیکن اکثر امور کی بنیاد وہی سعی و کوشش کی کمیت و کیفیت کا فرق ہے۔

البتہ ہماری مراد ایسے معاشرے سے ہے جو صحیح نہج پر قائم ہو جو ظالمانہ لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو نہ کہ ایسا معاشرہ جو منحرف اور کج رو ہو اور جو قوانینِ آفرینش اور انسانی بنیادوں پر قائم نظام سے ہٹ گیا ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم بعض لوگوں کو بے وقعت اور بے دست و پا سمجھتے ہیں لیکن ان کے پاس بہت وسائل اور مال و دولت ہوتی ہے ہم اس پر تعجب کرتے ہیں لیکن اگر ہم بعض لوگوں کو بے وقعت اور بے دست و پا سمجھتے ہیں لیکن ان کے پاس بہت وسائل اور مال و دولت ہوتی ہے ہم اس پر تعجب کرتے ہیں لیکن اگر ہم ان کے جسم، روح اور اخلاق پر زیادہ غور کریں اور سطحی مطالعے پر مبنی فیصلہ ایک طرف کر دیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی قوت رکھتے ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔

ہم پھر یہ بات دہراتے ہیں کہ ہمارا موضوع بحث وہ صحیح و سالم معاشرہ ہے کہ جو ظالمانہ لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو۔ بہر حال آمدن اور وسائل کا یہ فرق صلاحیتوں کے فرق پر مبنی ہے اور یہ صلاحیتیں نعماتِ الہی ہیں البتہ ہو سکتا ہے کہ چند مواقع پر یہ اکتسابی ہوں۔

لیکن بعض مواقع یقیناً غیر اکتسابی ہوتے ہیں اور اس بناء پر ایک صحیح و سالم معاشرے میں بھی اقتصادی لحاظ سے آمدن کا فرق قابل انکار نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم سب لوگوں کا ہم شکل، ہم رنگ، ہم استعداد اور ہم قالب بنا سکیں۔ سب لوگ ایسے ہو جائیں کہ ان میں کسی قسم کا کوئی فرق باقی نہ رہے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ انسان، درخت یا پھول کے پودے کو دیکھیے کیا ممکن ہے کہ ان کے بدن کی متناسب عمارت اعضاء کے لحاظ سے مساوی ہو۔ کیا پودے کی جڑیں اس کے پھولوں کی نازک پتیوں جیسی ہو سکتی ہیں؟ کیا انسان کی ایڑی کی ہڈی اس کی آنکھ کی لطیف پتلی کے ہر لحاظ سے مساوی ہو سکتی ہے اور اگر ہم انھیں یکساں کر سکیں تو کیا آپ سمجھیں گے کہ ہم نے صحیح کام انجام دیا ہے۔

پرفریب اور شعور سے عاری نعروں سے قطع نظر کر کے فرض کیجئے کہ ایک دن ہم ہر لحاظ سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے خیالی انسان بنالیں پوری دنیا کو پانچ ہزار ملین (۵/ارب) ایسے انسان سے بھر دیں جو ہم شکل، ہم لباس، ہم ذوق، ہم فکر اور ہر لحاظ سے یکساں ہیں۔ کسی کارخانے سے نکلنے والے ایک ہی برانڈ کے سگریٹوں کی طرح۔ تو ذرا سوچیں کہ کیا اس روز انسانوں کو اچھی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ مسلم ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دنیا ایک جہنم بن جائے گی۔ سب کے سب ایک مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے سب کے سب ایک ہی طرف چل پڑیں گے سب کے سب ایک ہی چیز چاہیں گے سب ایک پوسٹ کے خواہش مند ہوں گے، سب ایک ہی قسم کی غذائیں چاہیں گے اور سب ایک کام کرنا چاہیں گے۔ ظاہر ہے اس قسم کی زندگی بہت ہی جلد ختم ہو جائے گی اور فرض کریں کہ وہ باقی رہ جائے تو ایک تھادینے والی روح، بے کیف اور ایک ہی طرز کی زندگی ہوگی۔ ایسی زندگی جو موت سے زیادہ مختلف نہ ہوگی۔

لہذا صلاحیتوں کا اختلاف اور اس کے لوازم نظام کی بقا کے لئے ناگزیر ہے بلکہ ایسا ہونا استعداد و صلاحیت کی نشوونما کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ پرفریب نعروں سے اس حقیقت کو بدلا نہیں جاسکتا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ کوئی ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب سمجھنے لگے کہ ہم طبقاتی معاشرے اور لوٹ کھسوٹ اور استعماری نظام کو قبول کرتے ہیں نہیں ہرگز نہیں ہماری مراد طبعی اور فطری اختلاف ہے نہ کہ مصنوعی ہماری مراد وہ تفاوت اور فرق ہیں کہ جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں نہ کہ ایک دوسرے پر تجاوز و ظلم کرنے والے۔ طبقاتی فرق (توجہ رہے یہاں طبقاتی فرق سے مراد اس کا وہی اصلاحی مفہوم ہے یعنی ایک لوٹ کھسوٹ کرنے والا طبقہ اور دوسرا جسے لوٹا جا رہا ہے) ہرگز نظام آفرینش سے مطابقت نہیں رکھتا۔ نظام خلقت سے ہم آہنگ استعداد اور کوشش کا فرق ہے اور ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (غور کیجئے گا)

دوسرے لفظوں میں استعداد کے اختلاف کو اصلاح و تعمیر کے لئے استعمال ہونا چاہیئے جیسے ایک بدن کے اعضاء کا اختلاف ہوتا ہے جیسے ایک پھول کے پودے میں مختلف حصوں کا اختلاف ہوتا ہے وہ اختلاف کو ایک دوسرے کے مزاحم نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ آمدن کے اختلاف سے طبقاتی معاشرہ پیدا کرنے کے لئے سوء استفادہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی بناء پر زیر بحث آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں ﴿أَفَبِعِغْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ اختلاف فطرت کی صورت میں ہوں نہ کہ مصنوعی اور ظالمانہ صورت میں خدا کی نعمت ہیں اور انسان کے نظام معاشرہ کی حفاظت کے لئے ہیں۔

زیر بحث آخری آیت گزشتہ دو آیات کی طرح لفظ ”اللہ“ سے شروع ہوتی ہے اس میں نعماتِ الہی کا ذکر ہے اس میں انسان کی انفرادی قوت، انسان کے معاونین اور مددگاروں اور اسی طرح پاکیزہ رزق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان تین آیتوں میں جن نعمتوں کا ذکر شروع ہوا ہے اس کی تکمیل ہوجاتی ہے یعنی بات زندگی اور موت کے نظام سے شروع کی گئی ہے پھر رزق اور استعداد میں فرق کا ذکر ہے کہ جو زندگی میں تنوع کا باعث ہے اور آخری آیت میں نسل انسانی کے زیادہ ہونے اور پاکیزہ رزق کی طرف اشارہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے تمہاری نوع میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائی ہیں ﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا﴾۔ وہ بیویاں کہ جو تسکینِ جسم کی باعث بھی ہیں اور بقاء کا ذریعہ بھی اسی لئے ساتھ ہی اضافہ کیا گیا ہے: اور تمہاری بیویوں کے ذریعے تمہیں بیٹے، پوتے اور نواسے عطا کئے ہیں ﴿وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً﴾۔

”حفدة“ ”حافہ“ کی جمع ہے۔ دراصل اس کا معنی ہے وہ شخص جو کسی جزا کی توقع کے بغیر تعاون کرے لیکن میر نظر آیت میں بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق ”حفدة“ اس سے مراد پوتے اور نواسے ہیں، بعض اس سے مراد صرف نواسے لیتے ہیں اور بعض نے ”بنین“ سے چھوٹے بیٹے مراد لیا ہے اور ”حفدة“ سے بڑے بیٹے کہ جو مدد اور ہمکاری کر سکتے ہیں بعض نے ”حفدة“ مراد ہر طرح کے معاون و مددگار لئے ہیں چاہے وہ بیٹے ہوں یا کوئی اور۔^(۳)

بہر حال اس میں شک نہیں ہر شخص کے ارد گرد، بیٹوں، پوتوں اور نواسوں اور بیویوں کی صورت میں انسانی قوتوں کا وجود اس کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہے یہ روحانی لحاظ سے بھی مدد کرتے ہیں اور مادی لحاظ سے بھی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اللہ نے تمہیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا ہے ﴿وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ﴾۔

”طببات“ کا یہاں وسیع مفہوم ہے اس میں ہر قسم کے پاکیزہ رزق شامل ہے چاہے وہ مادی پہلو سے ہو یا روحانی پہلو سے، انفرادی حوالے سے۔

آخر میں اس بحث سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا وہ خدا کی عظمت و قدرت کے یہ سب آثار دیکھنے کے باوجود اس کی جانب سے اپنے اوپر ہونے والی ان تمام نعمتوں کے باوجود بتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ”کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی نعمت کا انکار کرتے ہیں ﴿أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ هُمْ يَكْفُرُونَ﴾۔

یہ ان کا کیسا غلط طرز عمل ہے کہ وہ نعمتوں کے سرچشمے کو فراموش کر کے اس کے پیچھے جاتے ہیں کہ ان کی زندگی پر کچھ بھی اثر نہیں رکھتا اور ہر لحاظ سے ”باطل“ کا مصداق ہے۔

۱۔ ”ارذل“ ”رذل“ کے مادہ سے پست، ناچیز اور حقیر شے کے معنی میں ہے ”ارذل العمر“ سے مراد بڑھاپے کا وہ دور ہے کہ جب ناتوانی اور نسیان انسان کو اس طرح سے آلے کہ وہ اپنی ابتدائی ضروریات بھی پورا نہ کر سکے اسی بناء پر قرآن اس مدت کو عمر کا غیر مطلوب حصہ قرار دیتا ہے۔ بعض مفسرین اسے ۷۵ سال کی عمر سمجھتے ہیں۔ بعض ۹۰ اور بعض ۹۵ شمار کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یہ کوئی معین عمر نہیں ہے بلکہ شخص شخص میں فرق ہوتا ہے۔

۲۔ لَئِنْ لَا نَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ”ہو سکتا ہے عمر کے بالائی سالوں تک پہنچنے کا نتیجہ ہو۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان سالوں میں انسان کے اعصاب اور دماغ ترمیم اور حافظہ کی طاقت گنوا بیٹھے ہیں اور انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ فراموشی اور بے خبری میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔

۳۔ اس صورت میں ”حفدة“ کا عطف ”بنین“ پر ہونا چاہیئے بلکہ ”ازدواج“ پر ہونا چاہیئے یہ خلاف ظاہر ہے، جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ ”بنین“ پر ہی عطف ہے (غور کیجئے گا)۔

چند اہم نکات

۱۔ رزق کے اسباب اور سرچشمے

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس میں شک نہیں کہ خدا داد صلاحیتوں اور نعمتوں کے لحاظ سے انسان مختلف ہیں لیکن کامیابیوں کی اصل بنیاد انسان کی سعی و کوشش اور جدوجہد ہی ہے۔ زیادہ کوشش کرنے والے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور سست و کم و کوش محروم رہتے ہیں۔

اسی بناء پر انسان کے نصیب کو اس کی سعی و کوشش سے مربوط قرار دیتا ہے اور صراحت سے کہتا ہے:

﴿و ان لیس للانسان الا ما سعی﴾

یقیناً انسان کے لئے بس وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے (نجم ۳۹)

نیز اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ درست راستے کا انتخاب، امانتداری، نظام قوانین الہی کی پاسداری اور عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق عمل بھی اس میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

﴿ولو ان اهل القرى امنوا و اتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء و الارض﴾

اگر مشہوروں اور قصبوں کے باسی ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیں۔ (اعراف ۹۶)

نیز وہ فرماتا ہے: ﴿ومن یتق الله یجعل له مخرجاً و یرزقه من حیث لا یحتسب﴾

جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اسے رزق کی فراوانی عطا کرتا ہے اور جہاں سے اسے گمان نہیں ہوتا وہاں سے عطا کرتا ہے۔ (طارق ۲، ۳)

اسی بناء پر انفاق اور راہ خدا میں خرچ کرنے کو وسعت رزق کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے:-

﴿ان تقرضوا الله قرضاً حسناً یضاعفه لکم﴾

اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو یعنی اس کی راہ میں خرچ کرو تو وہ اسے کئی گناہ کر دے گا۔ (تغابن ۱۷)

شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ اجتماعی زندگی میں سے ایک فرد یا ایک گروہ کے چلے جانے سے سارے معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لئے فرد کی نگہداری اور مدد کرنا سارے معاشرے کے لئے فائدہ مند ہے (اس لئے کہ معنوی اور انسانی پہلوؤں سے قطع نظر بھی یہ فائدہ ہے)۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے کے اقتصادی نظام پر تقویٰ، درست روی، پاکیزگی، ادا دباہمی ایک دوسرے سے تعاون اور اتفاق کے اصول کار فرما ہوں تو وہ طاقت ور اور سر بلند ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس معاشرے میں لوٹ کھسوٹ، دھوکا دہی، غارتگری، تجاوز اور دوسروں کو نظر انداز کر دینے کا عمل جاری ہو تو وہ اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ رہے گا اور اس کی مادی زندگی بھی پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ اسلامی روایات میں حصول رزق کے لئے سعی و کوشش پر زور دیتے ہوئے اسے تقویٰ کے ساتھ ہونے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:-

لا تَكْسَلُوا فِي طَلَبِ مَعَايِشِكُمْ فَإِنَّ أَبَائَنَا كَانُوا يَرْكُضُونَ فِيهَا وَيُضْلِيُونَهَا

حصول رزق میں سستی سے کام نہ لو۔ کیونکہ ہمارے آباء اجداد اس راہ میں دوڑتے تھے اور اسے طلب کرتے تھے۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۴۸)۔

ان ہی امام بزرگوار سے منقول ہے: ﴿الكَادُ عَلَى عِيَالِهِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾

جو شخص اپنے ہل و عیال کے تلاش رزق کے لئے نکلتا ہے وہ مجاہد راہ خدا کی طرح ہے۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۴۳)

یہاں تک کہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان صبح سویرے جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھروں نکلیں اور اپنی زندگی کے لئے سعی و کوشش کریں۔ (وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۵۰)

وہ اشخاص کہ جن کی دعائیں قبول نہیں ہوتی ان میں سے وہ افراد بھی شامل ہیں جن کا جسم صحیح و سالم ہو مگر وہ گھر میں پڑے رہتے ہوں اور کشائش رزق کے لئے صرف دعا کرتے رہتے ہوں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پھر بہت سی روایات میں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے اس کے حصول کے لئے کوشش کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل دو نکات کی طرف توجہ کرنا چاہئیے:

۱۔ اسلامی مصادر میں غور و خوض کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ ہو یا کوئی اور، جو آیات و روایات ابتدائی نظر میں ایک دوسرے سے متضاد نظر آتی ہے دراصل ان میں سے ہر ایک مسئلے کے ایک پہلو کے بارے میں ہوتی ہے جبکہ دوسرے پہلوؤں سے غفلت کے باعث تضاد کا شک گذرتا ہے۔

وہ مقام کہ جہاں لوگ دنیا پر ریجھ جاتے ہیں ان کا حرص بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ مادی دنیا کی زرق و برق زندگی کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے کسی جرم اور زیادتی سے نہیں چوکتے وہاں یتیم تائیدی احکام کے ذریعے انہیں اس دنیا کی ناپائیداری اور دنیاوی مال و جاہ کی بے وقعتی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جبکہ وہ مقام کہ جہاں کچھ لوگ زہد و تقویٰ کے بہانہ سے کام اور سعی و کوشش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں وہاں انہیں محنت، کام کاج اور کوشش کی اہمیت یاد دلائی گئی ہے۔

در اصل سچے رہبروں کا یہی طرز عمل ہونا چاہیئے کہ وہ افراط سے بھی مناسب طریقے سے روکیں اور تفریط سے بھی۔ جن آیات و روایات میں تاکید کی گئی ہے کہ رزق خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس نے ہر شخص کا حصہ معین کیا ہوا ہے در حقیقت یہ حرص و طمع، دنیا پرستی اور بے اصول و بے حدود سمیٹنے سے روکنے کے لئے ہے اور ان کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ انسان کے نشاط کار کے ولولوں کو ختم کر دیا جائے۔ اور ایک آبر و مندانہ، خود کفایت اور اپنے قدموں پر کھڑی زندگی کی جدوجہد کو ختم کر دیا جائے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان روایات کی تعبیر واضح ہو جاتی ہے کہ جن میں کہا گیا ہے کہ بہت سی روزیاں ایسی ہیں کہ اگر تم ان کے پیچھے نہ جاؤ تو وہ تمہارے پیچھے آئیں گی۔

۲۔ توحیدی نقطہ نگاہ سے کائنات کو دیکھا جائے تو ہر چیز خدا کی طرف منتہی ہوتی ہے اور ایک خدا پرست سچا موجد کسی چیز کو اپنی طرف سے نہیں سمجھتا بلکہ اس تک جو بھی نعمت پہنچی ہے اس کا سرچشمہ خدا ہی کو جانتا ہے وہ کہتا ہے۔
بیدک الخیر انک علی کل شیء قدیر

ہر طرح کی نیکی اور خیر کی کلید تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قادر اور توانا ہے (آل عمران ۲۶)
اس لحاظ سے ایک حقیقی توحید پرست کو ہر موقع پر اس حقیقت کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے یہاں تک کہ اس کی سعی و کوشش، فکر اور آلات و اسباب پیداوار بھی دراصل خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ اس کی نگاہ لطف لمحہ بھر کے لئے پھر جائے تو سب کچھ ختم ہو جائے۔

خدا پر ایمان رکھنا والا ایک شخص جب کسی سواری پر سوار ہوتا ہے تو کہتا ہے:

﴿سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرْنَا هَذَا﴾

پاک ہے وہ خدا کہ جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کیا ہے۔

جب وہ کوئی نعمت پاتا ہے تو زمزمہ توحید اس کے ہونٹوں سے نکلتا ہے: ﴿وما بنا نعمة فمنك﴾

ہمارے پاس جو بھی نعمت ہے بار الہا! تیری طرف سے ہے۔

یہاں تک کہ انسانوں کی نجات کے لئے جب کوئی قدم اٹھاتا ہے تو پیروی انبیاء میں کہتا ہے:-

﴿وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب﴾

میری توفیق صرف اللہ کی طرف سے، میں نے اسی پر توکل کیا ہے اور میں ایس کی طرف پلٹتا ہوں (ہود، ۸۸)

لیکن ان تمام مباحث میں جو چیز مسلم ہے وہ یہ ہے کہ تلاش رزق کو نکلنا چاہیے۔ سعی و کوشش کرنا چاہیے اور اس کے لئے مثبت اور اصلاحی راستہ اختیار کرنا چاہیے وہ راستہ کہ جو ہر قسم کے افراط و تفریط سے پاک ہو۔

رہی اس روزی کی بات کہ جو انسان کو بغیر کوشش کے مل جاتی ہے تو وہ فرعی مسئلہ نہ کہ اساسی اور بنیادی۔ شاید اسی بناء پر حضرت علی علیہ السلام نے اپنے کلمات قصار میں پہلے درجے میں اس رزق کا ذکر فرمایا ہے کہ انسان جس کے لئے نکلتا ہے اور اس کے بعد رزق کا جو خود انسان کے پیچھے آتا ہے۔

یا بن آدم! الرزق رزقان: رزق تطلبہ و رزق طلبہ

اے ابن آدم! رزق دو قسموں کا ہوتا ہے ایک وہ کہ جس کی تلاش میں تو نکلتا ہے اور دوسرا وہ کہ جو تیری تلاش میں آتا

ہے۔ ۱

۱۔ اکتب دعائیں اس جملے کا ذکر نماز عصر کی تعقیبات میں کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسروں سے برابری کا سلوک

زیر نظر آیات میں بہت سے انسانوں کی تنگ نظری اور بخل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: فرمایا گیا ہے کہ وہ اس بات کے لئے تیار نہیں کہ ان کے اختیار میں جو بہت سے نعمتیں دی گئی ہیں وہ اپنے زیر دست افراد کو بخشیں البتہ وہی لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو انبیاء اور ہادیان الہی کے تربیتی مکتب کے تربیت یافتہ ہیں۔

ان روایات کے ضمن میں کئی ایک روایات میں مساوات اور مواسات کی تاکید کی گئی ہے۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں اس سلسلے میں ہے: لا یجوز للرجل ان یختص نفسه بشیء من المأکول دون عیالہ کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے لئے گھر میں مخصوص غذا رکھے اور وہ کچھ کھائے کہ جس سے اس کے گھر والے محروم رہیں۔^(۱)

نیز حضرت ابوذر سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا: انما هم خوانکم فاکسوهم مما تکسون، واطعموهم مما تطعمون، فما روی عبده بعد ذلک الاوردہ، وازارہ ازارہ، من غیر تفاوت

جو افراد تمہارے زیر دست اور ماتحت ہیں وہ تمہارے بھائی ہیں جو کچھ خود پہنتے ہو انہیں۔ پہناؤ اور جو کچھ خود کھاتے ہو انہیں کھلاؤ۔

رسول اللہ کی اس وصیت کے بعد ابوذر کا طرز عمل اپنے ماتحت افراد سے یہ تھا کہ ان کا لباس ان کے اپنے لباس سے بالکل مختلف نہ ہوتا تھا۔^(۲)

مذکورہ روایات اور اسی طرح خود زیر بحث آیت کہ جو کہتی ہے ”فہم فیہ سوآء“ (بس وہ اس میں مساوی ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نصیحت کرتا ہے کہ تمام مسلمان اسلامی اخلاق کے طرز عمل کے طور پر اپنے گھر کے تمام افراد اور اپنے تحت افراد سے حتی الامکان مساوات کریں اور برابری کا سلوک کریں گھر یلو ماحال اور اپنے ماتحت افراد میں اپنے لئے کوئی امتیاز نہ برتیں۔

۱۔ نہج البلاغہ، کلمات قصار ص ۳۷۹۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۸۔

آیات ۷۳، ۷۴

۷۳- ﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ -

۷۴- ﴿فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ -

ترجمہ

۷۳- وہ خدا کو چھوڑ کر کچھ ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں سے ان کے رزق کے مالک نہیں ہیں اور یہ کام جن کے بس کا نہیں -

۷۴- لہذا اللہ کے لئے امثال (اور شبیہ) کا عقیدہ رکھو کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر

خدا کے لئے شبیہ کا عقیدہ نہ رکھو:

گذشتہ آیات میں توحید کے بارے میں گفتگو تھی اب زیر بحث آیات میں مسئلہ شرک کے بارے میں بات کی گئی ہے سرزنش و ملامت کے لہجے میں فرمایا گیا ہے: وہ خدا کو چھوڑ کر ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو آسمان و زمین میں سے ان کی روزی کے مالک نہیں ہیں اور اس سلسلے میں ان کا ذرہ بھر بھی کوئی اثر نہیں ﴿وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ شَيْئًا﴾ -

نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں وہ کسی چیز کے مالک نہیں بلکہ خلق و ایجاد اور ان پر دست رسی کی طاقت نہیں رکھتے ﴿وَلَا يَسْتَطِيعُونَ﴾ -

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مشرکین اس لئے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی زندگی اور نفع و نقصان میں کوئی اہم کردار ادا کرتے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ رزق کا مسئلہ انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے چاہے وہ آسمان سے بارش کے حیات بخش قطروں اور سورج سے زندگی بخش شعاعوں کی صورت میں ہو یا وہ زمین سے نکلنے والا ہو اس میں سے کچھ بھی بتوں کے اختیار میں نہیں وہ تو بے اہمیت اور بے قیمت موجودات ہیں کہ جن کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا یہ تو صرف خرافات اور جہالت پر مبنی تعصبات ہیں کہ جہنہوں نے انہیں اہمیت دے رکھی ہے -

در حقیقت ”لَا يَسْتَطِيعُونَ“ ”لَا يَمْلِكُونَ“ (وہ کسی چیز کے مالک نہیں) کی دلیل ہے اس لئے کہ وہ ان کی خلقت یا حفاظت کی ذرہ بھر قدرت بھی نہیں رکھتے۔

اگلی آیت میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو پھر خدا کی کسی مثل، شبیہ اور نظیر کے قائل نہ بنو ﴿فَلَا تَضَرُّوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾۔ کیونکہ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ”فَلَا تَضَرُّوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ“ زمانہ جاہلیت کے مشرکین کی ایک منطق کی طرف اشارہ ہے (ہمارے زمانے کے بعض مشرکین بھی یہ بات کرتے ہیں) وہ کہتے تھے کہ اگر ہم بتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس لائق نہیں کہ خدا کی پرستش کریں لہذا ہمیں بتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جو اس کے مقرب بارگاہ ہیں۔ خدا ایک عظیم شہنشاہ کی طرح ہے کہ جو وزراء اور خواص ہی اس سے رابطہ کر سکتے ہیں اور عام لوگ جن کی اس بادشاہ تک رسائی نہیں وہ بادشاہ کے قریبی خواص اور مقربین کے پیچھے ہی لگیں گے۔

اس قسم کی قبیح اور غلط منطق بہت خطرناک ہے بعض اوقات بڑے انحرافی انداز میں اسے خوب صورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے:

خدا کے لئے مثالیں بیان نہ کرو۔

یعنی ایسی مثال اس کے لئے پیش نہ کرو جو محدود افکار اور ممکن موجودات کے حوالے سے ہو اور نقائص سے مامور ہو کیونکہ ایسی مثال اس سے مناسبت نہیں رکھتی تو اگر اس امر کی طرف توجہ رکھتے کہ تمام موجودات اللہ کے احاطہ و جودی میں ہیں اور اس کے غیر متناعی لطف و رحمت کے سایے میں ہیں اور وہ خود تم سے تمہاری نسبت زیادہ نزدیک ہے تو کبھی بھی وسائط و وسائل کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

وہ خدا جو براہ راست اپنے سے راز و نیاز اور گفتگو کی دعوت دیتا ہے اور جس نے اپنے گھر کے دروازے شب و روز تمہارے لئے کھول رکھے ہیں اسے کسی جابر و متکبر بادشاہ سے تشبیہ نہیں دینا چاہیے کیونکہ یہ بادشاہ تو محل نشین رہتے ہیں اور گنتی کے چند افراد کے سوا کوئی ان کے محل میں نہیں جاسکتا ﴿فَلَا تَضَرُّوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾

صفات خدا کی بحثوں میں ہم اس نکتے کی طرف خصوصی طور پر متوجہ ہوتے ہیں کہ صفات الہی کی شناخت کی راہ میں تشبیہ کا مسئلہ نہایت خطرناک ہے یعنی اس کی صفات کو بندوں پر قیاس کرنا اور ان سے مشابہ قرار دینا کیونکہ خدا ہر لحاظ سے ایک لامتناہی وجود ہے اور دوسرے لحاظ سے محدود وجود ہیں لہذا ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل ہمیں اس کی ذات سے دور لے جائے گی۔

یہاں تک کہ جہاں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کی ذات مقدس کو نور یا اس قسم کی چیز کے ساتھ تشبیہ دیں وہاں بھی ہمیں متوجہ رہنا چاہیئے کہ ایسی تشبیہات بہر حال ناقص اور نارسا ہیں اور صرف کسی ایک پہلو سے قابل قبول ہیں نہ کہ ہر پہلو سے (غور کیجئے گا)۔

جبکہ بہت سے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور زیادہ تر تشبیہ و قیاس کی گمراہ کن وادیوں میں گھر جاتے ہیں ، اور حقیقت توحید سے بہت دور جا پڑتے ہیں لہذا قرآن بار بار بیدار کرتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کبھی کہتا ہے :

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾

کوئی چیز اس کے ہم پلہ اور اس کی مثل نہیں۔ (اخلاص - ۴)

کبھی کہتا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾

کوئی شے اس کی مانند و مثل نہیں ہے۔ (شورائی - ۱۱)

کبھی فرماتا ہے: ﴿فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ﴾

یہ دراصل اسی حقیقت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے ہے اور شاید ”﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَانْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾“ (خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) اسی مسئلے کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ عام لوگ صفات الہی کے اسرار سے بے خبر ہیں

آیت ۷۵

۷۵- ﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَمَنْ رَزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُونَ الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ -

۷۶- ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَى مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّهُهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ -

۷۷- ﴿وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ -
ترجمہ:

۷۵- خدا کی مثال بیان کی ہے اس مملوک غلام کی جس کی قدرت میں کوئی چیز نہیں اور اس با ایمان انسان کی جسے اچھا رزق بخشا گیا ہے اور وہ چھپ کر اور آشکار اسے عطاۓ خدا میں خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہیں - حمد و شکر خدا کے لئے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے -

۷۶- اور اللہ نے دو افراد کی (ایک اور) مثال بیان کی ہے کہ جن میں سے ایک مادرزاد گونگا ہے کہ جو کچھ نہیں کر سکتا اور اپنے ساتھی پر بوجھ ہے اسے جس کام کے لئے بھی بھیجا جائے اچھا عمل انجام نہیں دیتا کیا ایسا شخص اس انسان کے برابر ہے جو عدل و انصاف سے فیصلہ کرتا ہے اور راہ مستقیم پر قائم ہے -

۷۷- آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے ہے (اور وہی سب کچھ جانتا ہے) اور قیامت کا معاملہ اس کے لئے بالکل پلک جھپکنے یا اس سے بھی معمولی کاک کی طرح ہے (کیونکہ خدا ہر چیز ہر قدرت رکھتا ہے) -

تفسیر

مومن اور کافر کے لئے مثالیں:

گذشتہ آیات میں ایمان اور کفر اور مومنین و مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی - زیر نظر آیات میں دوزندہ اور روشن مثالوں کے ذریعے ان کی حالت کو واضح کیا گیا ہے -

پہلی مثال میں مشرکین کو اس غلام مملوک سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا اور مومنین کو غنی و بے نیاز انسان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو اپنے وسائل سے سب کو فائدہ پہنچاتا ہے -

ارشاد ہوتا ہے: اسے غلام مملوک کا ذکر بطور مثال کرتا ہے کہ جس کے بس میں کچھ بھی نہیں ﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾۔

نہ تلوین میں اس کی کوئی قدرت ہے اور نہ تشریع میں۔ کیونکہ ایک طرف وہ ہمیشہ اپنے آقا کی قید میں ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے محدود ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے اپنے مال میں (وہ بھی اگر ہو تو) کوئی حق تصرف نہیں ہوتا اور اسی طرح اپنی ذات سے متعلق دیگر امور میں بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔

جی ہاں بندوں کا غلام اور بندہ ہونے کا نتیجہ قید اور ہر لحاظ سے محدودیت کے سوا کچھ نہیں۔ جبکہ اس کے مقابلے میں آزاد انسان کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے رزق حسن اور طرح طرح کی روزی اور پاکیزہ نعمتیں میسر ہوں ﴿وَمَنْ رَزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا﴾۔

ان آزاد انسانوں کے پاس بہت سے وسائل ہیں کہ جن سے وہ چھپ کر بھی اور اعلانیہ بھی خرچ کرتے ہیں اور انفاق کرتے ہیں ﴿فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا﴾۔

کیا یہ دونوں افراد برابر ہیں ﴿هَلْ يَسْتَوُونَ﴾۔

مسلم ہے کہ ایسا نہیں ہے لہذا ”تمام حمد اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ﴾۔ وہ اللہ کے جس کا بندہ آزاد قدرت مند بھی ہے اور عطا کرنے والا بھی جبکہ بتوں کے بندے ناتواں، محدود، بے قدرت اور قیدی ہیں ”لیکن ان (مشرکین) میں سے اکثر نہیں جانتے ﴿بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔^(۱) لیکن بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک اور مثال بتوں کے بندوں اور سچے مومنین کے بارے میں بیان کی گئی ہے بتوں کے بندوں کو مادر زاد گونگوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو غلام اور ناتواں بھی ہیں اور سچے مومنین کو اس آزاد انسان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو قوت گویائی رکھتا ہے ہمیشہ عدل و انصاف کی دعوت دیتا ہے اور صراطِ مستقیم پر قائم ہے۔

ارشاد ہوتا ہے اللہ نے دو اشخاص کی مثال دی ہے ان میں سے ایک مادر زاد گونگا ہے اور کچھ اس کے بس میں نہیں ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ﴾۔

وہ غلام ہونے کے باوجود اپنے مولاء آقا کے لئے بوجھ ہے ﴿وَهُوَ كُلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ﴾۔ یہی وجہ ہے کہ ”اسے جس کام کے لئے بھی بھیجا جائے وہ اچھا انجام نہیں دے سکتا۔ ﴿إِنَّمَا يُوجِّهُهُ لآيَاتِ بَحِيرٍ﴾۔

گویا اس میں چار منفی صفات ہیں :

۱۔ وہ مادر زاد گونگا ہے۔

۲۔ بالکل نواں ہے۔

۳۔ اپنے مالک کے لئے بوجھ ہے اور

۴۔ جب اسے کسی کام کے لئے بھیجا جائے تو کوئی مثبت اقدام نہیں کر پاتا۔

یہ چار صفات اگر ایک دوسرے کی علت و معلوم ہیں مگر ایک انسان کی منفی حالت کی سو فی صد تصویر کشی کرتی ہیں کہ جس کے وجود سے کوئی خیر و برکت حاصل نہیں ہوتی اور جو معاشرے اور خاندان پر بوجھ ہے۔

کیا ایسا شخص اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے کہ جو فصیح اور گویا زبان رکھتا ہے اور ہمیشہ عدل و انصاف کی دعوت دیتا رہتا ہے اور صاف راستے اور سیدھی راہ پر قائم ہے۔ ﴿هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ

مُسْتَقِيمٍ﴾۔

یہاں اگرچہ دو ہی صفات بیان ہوئی ہیں

ایک مسلسل عدل و انصاف کی صورت اور دوسری طرز مستقیم اور صحیح راستہ کہ جو ہر قسم کے انحراف سے پاک

ہو۔

لیکن یہ دونوں صفات دوسری صفات کو واضح کرتی ہیں وہ شخص عدل و انصاف کی دعوت دیتا ہے، کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک گونگا، بزدل اور بے وقعت انسان ہو۔ ہرگز نہیں۔ ایسا شخص زبان گویا، منطق محکم اور ارادہ قوی اور شجاعت و شہامت کا حامل ہوگا۔

وہ شخص کہ جو راہ مستقیم پر گامزن ہو کیا وہ بے دست و پا، ناتواں، بے ہوش اور کم عقل انسان ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں نہیں مسلم ہے کہ وہ ایک صاحب فکر و نظر، صاحب کاوش و جستجو، باہوش، باتدبیر اور بااستقامت شخص ہوگا۔

ان دونوں کا موازنہ کیا جائے تو بت پرستی میں وسیع فرق واضح ہو جاتا ہے اور ان دونوں نقطہ ہائے نظر اور مکاتب فکر کے تحت تربیت پانے والوں کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔

عام طور پر ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن توحید کے بیان اور شرک کے خلاف گفتگو کو معاد اور قیامت کی عظیم عدالت کے مسائل سے مربوط کر دیتا ہے یہاں بھی ایسی ہی صورت حال ہے گزشتہ اور زیر بحث آیات شرک کی نفی اور اثبات توحید کے بارے میں ہیں اب گفتگو کا رخ معاد کی طرف ہو رہا ہے اور مشرکین کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: **اِنَّ آسْمَانُوْنَ اَوْرِزِيْنَ** کے غیبی امور سے آگاہ ہے۔ **﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ﴾**۔

گویا یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ جو معاد جسمانی کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ ہم جس وقت مرجائیں گے ہماری خاک کے ذرے ادھر ادھر بکھر جائیں گے کیسے ان کا علم ہو گا کہ وہ ہمیں جمع کر سکے۔ علاوہ ازیں، وہ کہتے، اگر فرض کریں ہمارے خاک کے ذرے ادھر ادھر بکھر جائیں گے تو کیسے ان کا علم ہو گا کہ وہ ہمیں جمع کر سکے۔ علاوہ ازیں، وہ کہتے، اگر فرض کریں ہمارے جسموں کے بکھرے ہوئے ذرات جمع بھی ہو جائیں اور ہمیں پھر سے زندگی بھی مل جائے ان جسموں کے بھولے بسرے ہوئے اعمال سے کون آگاہ ہو گا اور کون ان کے نامہ اعمال کی پڑتال کرے گا۔

زیر بحث آیت ایک ہی جملے میں اس سوال کے تمام پہلوؤں کا جواب دیتی ہے کہ خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے، وہ ہر جگہ ہمیشہ حاضر ہے لہذا اصولی طور پر غیب و پنہاں کا اس کے لئے کوئی مفہوم ہی نہیں۔ اس کے لئے تمام چیزیں شہود ہیں

یہ مختلف تعبیرات تو ہمارے وجود کے حساب سے ہیں اور ہماری منطق سے ہم آہنگ ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: قیامت کا معاملہ تو پلک جھپکنے یا اس سے بھی کم تر سطح پر آسان ہے **﴿وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا**

كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ﴾ (۲)

یہ درحقیقت منکرین معاد کے دوسرے اعتراض کی طرف اشارہ ہے وہ کہتے تھے کہ یہ کام تو انتہائی مشکل ہے۔ کون اسے انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے؟

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: تمہاری طاقت بہت کم ہے اس لئے تمہیں یہ کام مشکل دکھائی دیتا ہے لیکن خدا کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اس کے لئے یہ کام آسان سا ہے جیسے تمہارا پلک جھپکنا آسان سا بھی ہے اور تیزی سے انجام بھی پا جاتا ہے۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ قیامت کو پلک جھپکنے یا جلدی سے کسی چیز کو دیکھنے سے تشبیہ دے کر مزید فرمایا گیا ہے۔ (اوہو اقرب) (یا اس سے بھی نزدیک تر) یعنی نظر بھر دیکھنے کی تشبیہ بھی تنگی بیان کی وجہ سے ہے یعنی قیامت اس تیزی

سے برپا ہوگی کہ اس کے لئے مدت اور زمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو یہ ”کَلِمَةُ الْبَصَرِ“ کہا گیا ہے یہ بھی اس لئے ہے کہ تمہاری منطق میں اس سے مختصر تر کوئی زمانہ نہیں ہے۔

بہر حال یہ دو چھوٹے چھوٹے جملے اللہ کی بے انتہاء قدرت پر خصوصاً معاد اور انسان کے قبروں سے جی اٹھنے میں اس کی قدرت پر زندہ ناطق اور منہ بولتے اشارے ہیں۔ اسی لئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کیونکہ خدا ہر چیز پر توانا و قادر ہے ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

۱۔ آزاد اور قیدی انسان:

بعض لوگوں کے نظریے کے برخلاف توحید اور شرک کا مسئلہ صرف ایک اعتقادی اور ذہنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسان کی ساری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے توحید کا پودا جس دل لگ جاتا ہے اس دل کی زندگی اور رشد و نمو کا عامل بن جاتا ہے کیونکہ توحید انسانی نگاہ کو اس قدر وسیع کر دیتی ہے کہ اس کا رشتہ لامتناہی ذات سے جوڑ دیتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس شرک انسان کو پتھر، لکڑی کے بتوں کی انتہائی محدود دنیا میں محصور کر دیتا ہے انسانوں کو بتوں کی طرح کمزور کر دیتا ہے اور انسان کی فکر، نظر، ہمت، سعی اور توانائی کو اسی رنگیں رنگ دیتا ہے۔ زیر بحث آیت میں یہ حقیقت مثال کے پیرائے میں اس خوبصورتی سے بیان ہوئی ہے کہ اس سے عمدہ اور رسا انداز ممکن نہیں ہے۔

مشرک ”ابکم“ (گوںگا) مادر زاد گوںگا کہ جس کا عمل اس کی فکری کمزوری اور عاری از منطق ہونے کا ترجمان اور وہ شرک کے چنگل میں گرفتار ہونے کی وجہ سے کوئی مثبت کام نہیں کر سکتا ﴿لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ﴾۔

وہ ایک آزاد انسان نہیں ہے بلکہ خرافات و موہومات کا قیدی ہے۔ اپنی انہی صفات کی بناء پر وہ معاشرے پر ایک بوجھ ہے کیونکہ اس نے اپنی تقدیر کی مہارتوں یا استعمار گر انسانوں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے وہ ہمیشہ بندھا ہوا اور کسی پر انحصار کئے ہوئے ہوتا ہے جبکہ توحید آزادی اور استقلال کا آئین ہے وہ جب تک توحید کا اذائقہ نہ چکھے اس بندھن سے آزاد نہیں ہو سکتا ﴿وَهُوَ كَلٌّ عَلَى مَوْلَاهُ﴾۔

اپنی یہ طرز فکر لئے ہوئے وہ جس راستے پر بھی قدم رکھے گا، ناکام رہے گا اور کسی طرف اسے خیر و سعادت نصیب نہیں ہوگی ﴿إِنَّمَا يُوْجِهْهُ لَآيَاتُ الْبَٰخِرِ﴾

کو تاہ فکری کے اس اسیر اور عاجز و ناتواں شخص کی زندگی کا کوئی ہدف اور پروگرام نہیں ہے یہ اس مرد آزاد و شجاع سے کسی قدر مختلف ہے جو نہ صرف خود عدل و داد پر کار بند ہے بلکہ ہمیشہ اپنے معاشرے میں عدل و داد کی حکمرانی کا پرچم بلند کئے رہتا ہے، علاوہ ازیں ایک آزاد انسان منطقی فکر اور توحید کے فطری نظام سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ راہ مستقیم پر گامزن رہتا ہے وہی راہ مستقیم جو منزل مقصود تک پہنچنے کے نزدیک ترین راستہ ہے اس راستے سے انسان تیزی سے منزل تک جا پہنچتا ہے ایک آزاد انسان کج راستوں پر اپنا سرمایہ وجود ضائع نہیں کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توحید اور شرک صرف عقیدہ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی سے ان کا تعلق ہے سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور تمدنی زندگی ان سے مربوط ہے۔ اگر ہم زمانہ جاہلیت کے مشرک عربوں اور ابتدائے اسلام کے موحد مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ان دونوں راستوں کا واضح فرق معلوم ہو جائے گا۔ وہی افراد جو کل تک جہالت، تفرقہ، انحطاط اور بد بختی میں ایسے گرفتار تھے کہ انھیں فقر و فساد سے آلود اپنے ماحول کے سوا کچھ خبر نہ تھی لیکن جب انھوں نے وادی توحید میں قدم رکھا تو انھیں ایسی وحدت، آگہی اور توانائی میسر آئی کہ اس زمانے کی ساری متمدن دنیا ان کے زیر نگیں ہو گئی۔

۲۔ انسان زندگی پر عدالت اور سچائی کا اثر:

یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیات میں موحدین کے کاموں میں سے صرف دعوتِ عدل اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یہ امر نشان دہی کرتا ہے کہ کسی فرد یا معاشرے کی حقیقی سعادت انہی دو چیزوں میں مضمر ہے انسان کا طرز عمل صحیح ہو اس کی زندگی کا پروگرام نہ شرقی ہو نہ غربی وہ نہ دائیں طرف منحرف ہو نہ بائیں طرف اور پھر قیامِ عدل کی دعوت۔ وہ بھی وقتی نہیں بلکہ ”یأمر بالعدل“ کے مفہوم کے مطابق دائمی اور مسلسل (کیونکہ ”یأمر“ مضارع کا صیغہ ہے جو دوام کا مفہوم دیتا ہے)۔

۳۔ روایت پر ایک نظر:

طرقِ اہل بیت سے ایک روایت مندرجہ بالا آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئی ہے روایت میں ہے
الذین يأمر بالعدل امیر المؤمنین و الائمة (صلوٰۃ اللہ علیہم)

عدل و انصاف کی دعوت دینے والے امیر المؤمنین علی اور آئمہ اہل (علیہم السلام) ہیں (نور الثقلین، جلد ۳ ص ۷۰)

بعض مفسرین نے ”من یا أمر بالعدل“ سے حضرت حمزہ، عثمان بن مظعون یا عمار مراد لئے ہیں اور ”ابکم“ سے ابن ابی خلف اور ابو جہل وغیرہ۔

واضح ہے کہ یہ سب ان کے لئے واضح مصداق ہیں اور ان روایات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان مفہوم انہی افراد میں منحصر ہے۔

ضمنی طور پر ان تفسیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ آیات کی تشبیہ بتوں اور خدا کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ مشرکین اور مومنین کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۱۔ جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے اسکے مطابق مذکورہ بالا مثال مومن اور کافر کے لئے ہے لیکن بعض مفسرین نے اس تشبیہ کے لئے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ بتوں کو مملوک غلام سے خدا کو اس آزاد و مومن سے تشبیہ دی جائے کہ جو صاحب نعمات ہے اور اس میں سے خرچ کرتا ہے۔

۲۔ ”لح“ ”برزن“ ”مسح“ اصل میں بجلی کے چمکنے کے معنی میں ہے بعد ازاں ایک اچلتی نگاہ ڈالنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ضمناً توجہ رہے کہ یہاں ”او“ ”بل“ کے معنی میں ہے۔

فہرست

۳	سورہ حجر.....
۳	آیات ۱، ۲، ۳، ۴، ۵.....
۳	تفسیر.....
۳	بے بنیاد آرزوئیں.....
۹	لمبی آرزوئیں غفلت کا سبب ہیں.....
۱۱	آیات ۶، ۷، ۸.....
۱۱	تفسیر.....
۱۱	فرشتوں کے نزول کا تقاضا۔.....
۱۵	آیت ۹.....
۱۵	تفسیر.....
۱۵	قرآن کی حفاظت.....
۱۶	عدم تحریف قرآن.....
۱۸	عدم تحریف قرآن کے دلائل.....
۱۸	۱۔ حافظان قرآن:.....
۲۰	۲۔ کاتبان وحی:.....
۲۲	۳۔ تمام رہبران اسلام نے اسی قرآن کی دعوت دی ہے:.....
۲۳	۴۔ آخری دین اور ختم نبوت کا تقاضا:.....
۲۳	۵۔ روایات ثقلین:.....

- ۶۔ قرآن جھوٹی اور سچی روایات کے لئے کسوٹی ہے: ۲۳
- آیات ۱۵، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰ ۲۹
- تفسیر ۲۹
- ہٹ دھرمی اور محسوسات کا انکار ۲۹
- چند اہم نکات ۳۱
- ۱۔ ”شیع کا مفہوم“ ۳۱
- ۲۔ ”نسلکہ“ کی ضمیر کا مرجع ۳۲
- ۳۔ گزشتہ لوگوں کی روش ۳۳
- ۴۔ ﴿فَظْلَمُوا فِيهِ يَعْرجُونَ﴾ کا مفہوم ۳۳
- ۵۔ سکرات ابصارنا کا مطلب ۳۳
- آیات ۱۸، ۱۷، ۱۶ ۳۶
- تفسیر ۳۶
- شیطان شہاب کے ذریعے ہانکے جاتے ہیں: ۳۶
- شیطان شہاب کے ذریعے کیسے ہانکے جاتے ہیں؟ ۳۸
- نتیجہ بحث ۳۳
- آیات ۲۱، ۲۰، ۱۹ ۳۷
- تفسیر ۳۷
- ہر چیز کا خزانہ ہمارے پاس ہے: ۳۷
- چند اہم نکات ۵۲
- ۱۔ خدا کے خزانے کیا ہیں؟ ۵۲

- ۲۔ نزول مقامی اور نزول مکانی ۵۳
- آیات ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵ ۵۳
- تفسیر ۵۳
- ہوا اور بارش ۵۳
- معتقدین اور متاخرین کون ہیں؟ ۵۶
- آیات ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴ ۵۸
- تفسیر ۶۰
- خلقت انسان ۶۰
- چند اہم نکات ۶۵
- ۱۔ تکبر عظیم بد بختیوں کا سرچشمہ ۶۵
- ۳۔ جہنم کے دروازے ۶۷
- ۴۔ سیاہ کیچڑ اور خدا کی روح ۶۷
- ۵۔ جن کیا ہے؟ ۶۸
- ۶۔ قرآن اور خلقت انسان ۷۰
- تکامل انواع کے حامیوں کے دلائل ۷۱
- ثبوت انواع کے حامیوں کے جوابات ۷۲
- مفروضہ تکامل اور مسئلہ خدا شناسی ۷۳
- قرآن اور مسئلہ تکامل انواع ۷۴
- آیات ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰ ۷۸
- تفسیر ۷۸

- ۷۸ بہشت کی آٹھ نعمتیں
- ۸۲ چند اہم نکات
- ۸۲ ۱۔ بہشت کے باغ اور چشمے
- ۸۲ ۲۔ مادی اور روحانی نعمتیں
- ۸۲ ۳۔ کینہ اور حسد اخوت کے دشمن ہیں
- ۸۳ ۴۔ جزائے کامل
- ۸۳ ۵۔ آئیے اس دنیا میں تعمیر جنت کریں
- ۸۵ آیات ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰
- ۸۶ تفسیر
- ۸۶ انجانے مہمان
- ۹۰ آیات ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷
- ۹۱ تفسیر
- ۹۲ قوم لوط کے گنہ گاروں کا انجام
- ۹۷ چند اہم نکات
- ۹۷ ۱۔ ”قطع من اللیل“ سے کیا مراد ہے؟
- ۹۸ ۲۔ ”﴿وامضوا حیث تؤمرون﴾“ کی تفسیر
- ۹۸ ۳۔ ”متوسم“ اور ”مومن“ کے درمیان واسطہ
- ۱۰۰ ۴۔ شہوت و غرور کی مستی
- ۱۰۱ آیات ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳
- ۱۰۱ تفسیر

- ۱۰۱ دو ظالم قوموں کا انجام
- ۱۰۳ اصحاب ایکہ کون ہیں؟
- ۱۰۴ آیات ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱
- ۱۰۴ تفسیر
- ۱۰۴ تقسیم اور نکتہ چینی کرنے والے:
- ۱۱۳ چند اہم نکات
- ۱۱۳ ۱۔ قرآن کریم خدا کی عظیم نعمت ہے
- ۱۱۵ ۲۔ دوسروں کے وسائل پر نگاہ رکھنا انحطاط کا باعث ہے
- ۱۱۶ ۳۔ رہبر کی انکساری
- ۱۱۷ ۴۔ ”مقسطین“ کون ہیں؟
- ۱۱۹ آیات ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹
- ۱۱۹ تفسیر
- ۱۱۹ اپنے مکتب واضح طور پر بیان کرو
- ۱۲۳ چند اہم نکات
- ۱۲۳ ۱۔ اعلانیہ دعوت اسلام کا آغاز:
- ۱۲۳ ۲۔ خدا کی طرف توجہ کا روحانی اثر
- ۱۲۳ ۳۔ عبادت اور تکامل اور ارتقاء
- ۱۲۶ سورہ نحل
- ۱۲۶ آیات ۱، ۲
- ۱۲۶ تفسیر

- ۱۲۶ حکم عذاب قریب ہے۔
- ۱۲۹ آیات ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳،
- ۱۲۹ تفسیر
- ۱۲۹ جانوروں کے گونگوں فائدے
- ۱۳۳ نکتہ
- ۱۳۳ جانور پالنے اور کھیتی باڑی کی اہمیت
- ۱۳۴ آیات ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹،
- ۱۳۴ تفسیر
- ۱۳۴ سب چیزیں انسان کے دستِ تسخیر میں ہیں:
- ۱۳۲ چند اہم نکات
- ۱۳۲ ۱۔ مادی اور روحانی نعمتیں
- ۱۳۲ ۲۔ زیتون، کھجور اور نگور ہی کا ذکر کیوں؟
- ۱۳۵ ۳۔ تفکر تعقل اور تذکر
- ۱۳۴ آیات ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴،
- ۱۳۴ تفسیر
- ۱۳۴ پہاڑ، دریا اور ستارے نعمت ہیں:
- ۱۵۳ نکتہ
- ۱۵۳ راہ، نشانی اور رہبر
- ۱۵۶ آیات ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹،
- ۱۵۶ مردہ اور بے شعور معبود

۱۵۶	تفسیر.....
۱۵۶	جن معبودوں کو وہ پکارتے ہیں وہ مردہ ہیں اور شعور نہیں رکھتے.....
۱۶۰	مستکبر کون ہیں؟.....
۱۶۲	آیات ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹.....
۱۶۳	شان نزول.....
۱۶۳	تفسیر.....
۱۶۳	جو دوسروں کے گناہ اپنے کندھے پر لا دیتے ہیں.....
۱۷۰	چند اہم نکات.....
۱۷۰	۱۔ اچھی اور بری نیت.....
۱۷۲	۲۔ بے موقع تسلیم حق.....
۱۷۳	آیات ۳۰، ۳۱، ۳۲.....
۱۷۳	تفسیر.....
۱۷۳	نیک لوگوں کا انجام:.....
۱۷۷	آیات ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷.....
۱۷۸	تفسیر.....
۱۷۸	انبیاء کی ذمہ داری واضح تبلیغ ہے.....
۱۸۵	چند اہم نکات.....
۱۸۵	۱۔ ”بلاغ مبین“ کیا ہے.....
۱۸۶	۲۔ ہر امت کے لئے ایک رسول.....
۱۸۷	آیات ۳۸، ۳۹، ۴۰.....

تفسیر.....	۱۸۸
معاد اور اختلافات کا خاتمہ.....	۱۸۸
آیات ۳۱، ۳۲.....	۱۹۲
شان نزول.....	۱۹۲
تفسیر.....	۱۹۳
مہاجرین کی جزا.....	۱۹۳
چند اہم نکات.....	۱۹۳
۱۔ ہجرت اور مہاجرین:.....	۱۹۳
۲۔ ”﴿هاجروا فی اللہ﴾“ کا مفہوم:.....	۱۹۳
۳۔ ﴿من بعد ما ظلموا﴾“ کا مطلب:.....	۱۹۳
۴۔ ﴿لنبوئنہم فی الدنیا حسنة﴾“ کا مفہوم:.....	۱۹۳
آیات ۳۳، ۳۴.....	۱۹۶
تفسیر.....	۱۹۶
نہیں جانتے تو پوچھ لو.....	۱۹۶
ایک اہم نکتہ.....	۱۹۹
اہل ذکر کون ہیں؟.....	۱۹۹
آیات ۳۵، ۳۶، ۳۷.....	۲۰۲
تفسیر.....	۲۰۲
مختلف گناہوں کی مختلف سزائیں:.....	۲۰۲
آیات ۳۸، ۳۹، ۵۰.....	۲۰۵

تفسیر.....	۲۰۵
سائے تک اللہ کے حضور سجدہ زیر ہیں.....	۲۰۵
ہمارے سایوں کا ہماری زندگی پر اثر.....	۲۰۷
آیات ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵.....	۲۱۱
تفسیر.....	۲۱۱
ایک دین اور ایک معبود.....	۲۱۱
آیات ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰.....	۲۱۷
تفسیر.....	۲۱۷
جہاں بیٹی کو باعث رسوائی سمجھاتا تھا.....	۲۱۷
چند اہم نکات.....	۲۲۰
۱۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں کہتے تھے؟.....	۲۲۰
۲۔ بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کیا جاتا تھا؟.....	۲۲۰
۳۔ عورت کے مقام کے احیاء میں اسلام کا کردار.....	۲۲۶
آیات ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴.....	۲۲۹
تفسیر.....	۲۲۹
خدا فوراً سزا کیوں نہیں دیتا؟.....	۲۲۹
اجل مسمیٰ کیا ہے؟.....	۲۳۱
آیات ۶۵، ۶۶، ۶۷.....	۲۳۶
پانی، پھل اور حیوانات.....	۲۳۶
چند اہم نکات.....	۲۳۹

- ۱۔ دودھ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ ۲۳۹
- ۲۔ دودھ ایک اہم غذا ۲۴۱
- ۳۔ دودھ ایک خاص اور عمدہ غذا ۲۴۲
- آیات ۶۸، ۶۹ ۲۴۳
- تفسیر ۲۴۳
- شہد کی مکھی اور وحی الہی ۲۴۳
- ۱۔ ”وحی“ کا مفہوم: ۲۴۳
- ۲۔ کیا طبعی الہام شہد کی مکھیوں سے مخصوص ہے؟ ۲۴۵
- ۳۔ شہد کی مکھی کا گھر: ۲۴۶
- چند قابل توجہ نکات: ۲۴۸
- ۱۔ شہد کس چیز سے بنتا ہے؟ ۲۴۸
- ۲۔ ہموار اور مطیع راستے ۲۴۸
- ۳۔ شہد کہاں بنتا ہے؟ ۲۴۹
- ۴۔ شہد کے مختلف رنگ ۲۴۹
- ۵۔ شہد، غیر معمولی شفا بخش مادہ ہے ۲۵۰
- ۶۔ ”للناس“ یعنی انسانوں کے لئے ۲۵۳
- ۷۔ شہد کے بارے میں دیگر اہم امور ۲۵۳
- ۸۔ شہد کی مکھیوں کی عجیب و غریب زندگی ۲۵۳
- آیات ۷۰، ۷۱، ۷۲ ۲۵۴
- تفسیر ۲۵۴

- ۲۵۷ رزق میں اختلاف کا سبب
- ۲۵۸ کیا رزق کی تفریق عدالت پر مبنی ہے؟
- ۲۶۳ چند اہم نکات
- ۲۶۳ ۱۔ رزق کے اسباب اور سرچشمے
- ۲۶۷ ۲۔ دوسروں سے برابری کا سلوک
- ۲۶۸ آیات ۷۳، ۷۴
- ۲۶۸ تفسیر
- ۲۶۸ خدا کے لئے شہید کا عقیدہ نہ رکھو:
- ۲۷۱ آیت ۷۵
- ۲۷۱ تفسیر
- ۲۷۱ مومن اور کافر کے لئے مثالیں:
- ۲۷۵ ۱۔ آزاد اور قیدی انسان:
- ۲۷۶ ۲۔ انسان زندگی پر عدالت اور سچائی کا اثر:
- ۲۷۶ ۳۔ روایت پر ایک نظر: